

ہُنزہ داستان

مُستنصر حُسین تارڑ

ہنزہ داستان

مستنصر حسین تارڑ



فہرست

- بھسّو کی رات اور ہوا وحشی ہوتی جاتی تھی
- اِس گلیشیئر کی ہوا بہت سرد ہے۔
- ہُنزہ داستان
- باس میں آئی۔بی ہوں ..... ابراہیم بیگ۔
- کُل کتنے قُل؟... ثمر قند۔ رحیم یاری اور بر بر قُل۔
- آئیے علتت چلیں ... اور غشپ پرندے
- روم کے تریوی فوّارے کے پانی ... دریائے ہُنزہ کے پانی ..... اور سِکّے کس نے ڈالے؟
- تب وہ کھڑکی کھُلی ... آپ نے ہمارا پانی پیا؟
- گلگت ایک جزیرہ ہے۔
- نہیں شکریہ، ہمیں گھر لے چلو کیپٹن!

کاغان میں اور کرسمس کی شام میں ..... ہنزہ!

جواں خون بوڑھے پہاڑوں کے ڈھلوان رستوں پر چل رہا تھا ــــــ

اس خون کی گرمی بھی بتدریج زائل ہو نا تھی ــــــ لیکن ابھی نہیں ــــــ

ابھی یہ سولہ برس کا تھا، گورنمنٹ کالج لاہور کی کوہ پیما جماعت کا ایک رکن تھا، جوان تھا، بدن صرف حدت تھا اور اس یقین کا اسیر تھا کہ وادیٔ کاغان سے پرے بُوراوائی اور باٹا کنڈی کے قریب رتی گلی کی برفپوش چوٹی کی طرف بڑھتے ہوئے ان بلندیوں اور ڈھلوانوں پر سرسراتی گھاس اور چہرے پر پہیلی سرد لبوں کے بوسے ہوا اور دریائے کنہار کے پانیوں کی پرشور موجودگی اور آسمان اور زمین اور اس کے درمیان ہر شے، ہر درخت، ہر پودہ، ہر پرندہ اور یہ زندگی اور یہ زندگی صرف اس کے لئے تخلیق کئے گئے ہیں کیونکہ وہ ہمیشہ رہے گا۔ چاہے یہ سب کچھ بوڑھا ہو کر مسمار ہو جائے لیکن وہ رہے گا کیونکہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ نہ رہے اور یہ سب کچھ جو صرف اُس کے لئے تخلیق کیا گیا ہے باقی رہے ــــــ بس اسی یقین کا اسیر ــــــ

سورج سے لشکتی چٹانوں کے ــــــ سائے میں سے ایک سایہ علیحدہ ہو کر ایک پُرخطر پگڈنڈی پر رینگنے لگا۔

کون ہے ؟

کیا ہے ؟

اِن پرہول ویرانوں میں ہم دس نوجوانوں کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے اور ہم تو رتی گلی کی چوٹی کو یہ بتانے جا رہے ہیں کہ تم اگر برفوں سے ڈھکی ہوئی ہو۔ سولہ ہزار فٹ بلند ہو تو بھی ہمارے پاؤں تمہارے سینے پر ہوں گے ہم تمہیں فتح کریں گے لیکن یہ کون ہے ؟ کیا ہے ؟ — اور کہاں جا رہا ہے ؟

"میرے خیال میں شیر ہے" جاوید انزٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔

"شیر ؟" میں نے اپنا رُک سیک زمین پر رکھ دیا "آؤ اسے پتھر ماریں"

"سر یہ کیا چیز ہو سکتی ہے ؟" شفیق نے پروفیسر سعید سے دریافت کیا جو دُوربین آنکھوں پر جمائے اُدھر دیکھ رہے تھے۔ مُہم کے اراکین نے آرام کے اس وقفے کو غنیمت جانا اور جو جہاں تھا وہیں اپنے رُک سیک کے سہارے لیٹ گیا۔ ہمارے ساز و سامان سے لَدے پانچ خچر بھی اس عارضی قیام کی خوشی میں خر خر سانس لمبے لینے لگے۔

"آدمی ہے — تنہا ہے — شہری لگتا ہے" پروفیسر سعید نے دوربین آنکھوں سے ہٹا کر چٹانوں پر آرام کرتی لمبی پڑی مخلوق کو اطلاع کی۔

آدمی اور اِن ویرانوں میں ؟ — اگر ہم سچ مچ شیر دیکھ لیتے تو بھی اتنی حیرت نہ ہوتی — یہاں انسانی آبادی سے کوسوں دُور، دشوار گزار پہاڑی راستوں پر ہم دس نوجوان، پروفیسر سعید، ایک خانسامے اور پانچ خچروں کی رفاقت میں بھی کچھ سہمے سہمے سے چلتے تھے — تو پھر یہ حضرت تن تنہا یہاں کیسے گھوم رہے ہیں۔

"ہو ہو ---- ہیلو ---- او بھائی او بھائی صاحب ---- اوئے اوئے۔"
سب لڑکے شور مچاتے اس راستے کی جانب بھاگنے لگے جس پر وہ دھیرے دھیرے چلتا جا رہا تھا۔

ہماری ہنگامہ آرائی اُس کے کانوں تک پہنچی تو وہ بھی قدرے "ٹھٹکا" پیچھے مڑ کر ہمیں ایک نظر دیکھا اور اپنا سامان کمر سے اُتار کر اطمینان سے لیٹ گیا ---- ہم اُس کے قریب ہوئے، سانسیں چڑھی ہوئیں۔ ہونکتے ہانپتے ماتھے پر پسینے کی دھاریں ---- ہاں وہ سچ مچ ایک آدمی تھا، ایک نوجوان ہم سے ایک دو برس بڑا ---- اُس نے ہمیں ایک سرد نظر سے دیکھا جیسے ہم مُخل ہوئے ہوں اور پھر بیزاری سے بولا "ان پہاڑوں میں شور مچانا منع ہے" ---- اس کی سرد مہری سے ہم بھی ٹھنڈے پڑ گئے اور معذرت کی تصویر بنے اس کے چاروں طرف مؤدب کھڑے ہو گئے۔

"بیٹھ جاؤ" اس نے اشارہ کیا جیسے ہم اُس کے گھر آئے ہوں۔
ہم ایک دوسرے پر گرتے پڑتے بیٹھ گئے اور بیک آواز اُسے بتانے لگے کہ ہم کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں اور ہم نے راستے میں کن کن خطرات کا سامنا کیا اور یہ کہ ہم نے کئی دنوں سے کسی ہم جنس کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ وہ بے اثر لیٹا رہا اور سرد نظر سے دیکھتا رہا۔

"اور آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"اُدھر" اُس نے درّہ بابو سر کے پُر خطر راستے کی طرف اشارہ کیا۔

"بالکل اکیلے؟"

"نہیں" اُس نے جیکٹ کی جیب پر ہتھیلی رکھی "یہ میرے ساتھ ہے" ---- پتہ نہیں وہ "یہ" کیا تھا۔ ہم چُپ ہو گئے اور وہ جیکٹ کی جیب کو تھپکتا رہا۔

"اُدھر کدھر!" جاوید اثر نے ہمت کر کے پوچھا۔

"اُدھر ـــــ درّہ بابوسر کے پار گلگت کی طرف ـــــ اور وہاں سے ہُنزہ ـــــ"

"ہُنزہ؟" سب کے منہ کھُل گئے۔ ہم نے پہلی مرتبہ یہ نام سُنا تھا۔

"ہاں ہُنزہ ـــــ جہاں یہ رہتی ہے" اس نے پھر جیکٹ کی جیب کو تھپکا۔

ہم پھر چپ ہو گئے۔

"یہاں کون رہتی ہے بھائی صاحب؟" بالآخر میں نے زبان ہلائی۔

اس نے وہیں لیٹے لیٹے ہم سب کے چہروں کو باری باری دیکھا جیسے یہ فیصلہ کرنا چاہتا ہو کہ کیا ان پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے اور پھر جیب کی زِپ کھول کر اُس میں سے "نیشنل جیوگرافک میگزین" کا ایک شمارہ نکالا اُسے اس طرح کھولا جیسے فال نکالنے کو ہو اور پھر ہمارے سامنے رکھ دیا۔ ہم سب اس پر جھک گئے ـــــ تجربہ جہاں انسان کو شعور دیتا ہے۔ پختگی دیتا ہے۔ وہاں اس کی بنیادی حسیات کو بھی کُند کر دیتا ہے ـــــ پتہ نہیں شعوری پختگی کے اِن دنوں میں اگر میں اُس تصویر کو دیکھوں تو وہ مجھے صرف ایک عام سی لڑکی دکھائی دے ـــــ لیکن اُن دنوں اس ویران پہاڑی سلسلے کے درمیان جہاں ڈھلوانوں پر سرد لبوں کے بوسے ہوا تھی ـــــ کاغذ پر چھپی اُس رنگین تصویر نے ہم سب کو قید کر لیا، ہمارے دلوں کو کھینچا کہ آؤ میرے پاس آؤ میں دنیا کی خوبصورت ترین لڑکی ہوں، کیا تم نے مجھ ایسی کوئی دیکھی ـــــ اور ہم سب اُسے دیکھ کر قدرے اَنبارمل ہو گئے اور ہماری شریانوں میں دوڑتا تمام تر خون ہمارے چہروں میں سے پھوٹنے لگا۔ ہمارے ہونٹ کپکپائے، حلق خشک ہوئے

اور شائد ہمیں بخار بھی ہو گیا ۔

"میں صرف اس لڑکی کو دیکھنے ہُنزہ جا رہا ہوں"۔ اُس نے تصویر پر جُھکے ہمارے سروں کو پرے کیا اور میگزین اُٹھا کر پھر سے جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ اپنا مختصر سا سامان اُٹھایا اور بغیر سلام دعا کے درہ بابوسر کی جانب اُٹھتے ہوئے راستے پر چل دیا ۔

ہم اُسے دیکھتے رہے ایک شدید حسد کے جذبے کے ساتھ کہ یہ جا رہا ہے ——— اور اُسے دیکھے گا ۔

"پاغل ای اوئے"۔ موچی دروازے کے ایک لڑکے نے پیچھے سے نعرہ لگایا ۔

"یہ مر جائے گا یقیناً ———" جاوید انور کہنے لگا ۔

"لیکن یہ ہُنزہ ہے کہاں ؟"

"ہُنزہ ؟"

"ہُنزہ ؟"

"پتہ نہیں"

———————

میں اور جینس اُن ہزاروں جوڑوں میں سے ایک تھے جو رائل البرٹ ہال لنڈن کے وسیع فلور پر کرسمس ایو بال میں تقریباً ساکت کھڑے تھے اور اُن کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کریں کیونکہ آرکسٹرا کے موسیقار تو اپنا فرض نہایت جوش و خروش کے ساتھ سرانجام دے رہے تھے لیکن وہاں فلور پر اتنی جگہ نہ تھی کہ انسان کانوں میں چیختی موسیقی کی ردھم پر اپنے بدن کو حرکت دے سکے ۔

ہم ٹین میں پیکڈ سارڈین مچھلیوں کی طرح جُڑے کھڑے تھے اور اُس روزِ بد کو کوس رہے تھے جب ہم نے اپنے "آبائی" قصبے ساؤتھ اینڈ آن سی میں کرسمس

منانے کی بجائے رائل البرٹ ہال لندن آنے کا فیصلہ کیا تھا —— فلور پر رقص کی کوشش کرتے ہوئے تمام جوڑے بالکل اکیلے تھے، ایک دوسرے کے چہروں میں چھپے ہوئے اور اُن کا بقیہ ہجوم، کرسمس کی شام یا موسیقی کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا —— وہ جزیرے تھے۔ جشن کی کیفیت تب جنم لیتی ہے۔ جب اُس میں شامل ہر انسان اپنی مسرتوں اور بے فکریوں کو بدن سے یوں باہر آنے دے کہ وہ بقیہ لوگوں پر بھی اثر انداز ہونے لگیں۔ لیکن یہاں چکنے فلور کی آئینہ سطح پر الگ الگ بوندیں تھیں جو مشترکہ بہاؤ سے گریزاں تھیں۔

ہال کی چھت میں نصب ایک سرچ لائٹ ہجوم کے سروں پر روشنی ڈالتی گھوم رہی تھی۔ کبھی یہاں کبھی وہاں، کبھی کبھار موسیقی یکلخت رُک جاتی اور وہ روشنی اُس لمحے جس جوڑے پر بھی ہوتی وہیں ٹھہر جاتی —— شور —— سیٹیاں —— تالیاں —— اور اُس جوڑے کو سٹیج پر رکھے کسی گرانقدر کرسمس انعام سے نواز دیا جاتا —— میں اور جینس بھی بوریت اور تھکاوٹ کے باوجود اِن ہزاروں جوڑوں کے ہمراہ دھیرے دھیرے کھسک رہے تھے کہ یکدم موسیقی تھم گئی اور وہ سرچ لائٹ عین ہمارے سروں کے اُوپر رُک کر جینس کے لاکٹ کو جگمگانے لگی۔ ہال تالیوں سے گونجنے لگا لیکن اُسی لمحے سرچ لائٹ جیسے بدک گئی ہو۔ ہراساں ہو گئی ہو —— وہ ہم سے پرے ہوئی اور ایک قریبی جوڑے پر ٹھہر گئی۔

"لیکن —— جینس نے پاؤں پٹختے ہوئے چیخ کر کہا" لائٹ ہم دونوں پر رُکی تھی۔"

ہم باہر آ گئے —— ریجنٹ سٹریٹ کی برقی آرائش۔ ٹرافلگر سکوئر کا بڑا کرسمس درخت جو ہر برس ناروے سے بھیجا جاتا ہے جگمگا رہا تھا —— بازار خالی تھے۔ دکانیں اور سٹور بند تھے۔ صرف روشنیاں تھیں اور جینس کا غصہ

تھا۔ شدید سردی کے باوجود اُس کے ماتھے اور گالوں پر پانی کے قطرے تھے جو اُس دُھند کی وجہ سے وجود میں نہیں آئے تھے جس نے سارے لنڈن کو اپنی آسیبی لپیٹ میں لے رکھا تھا بلکہ اُن کا وجود اس احساس کی بنا پر تھا کہ سرچ لائٹ ہم دونوں پر ٹھہر کر صرف اس لئے فوراً حرکت کر گئی تھی کہ اسے گھمانے والے ہاتھ سفید رنگ کے تھے اور اُس کی زد میں آیا ہوا ایک چہرہ اگرچہ سفید تھا لیکن دوسرا ـــــ گندمی تھا۔

سِنے راما تھیٹر کے سامنے سے گذرے تو فلم شروع ہونے کو تھی۔ ہم اپنی کرسمس شام کو "ہلاک" کرنے کے لئے اندر چلے گئے۔ تین پروجیکٹروں کی مدد سے ایک بہت بڑی سکرین پر دکھائی جانے والی اس فلم کا نام تھا:

SEARCH FOR PARADISE

پس منظر میں اُبھرتی آواز ہمیں بتاتی ہے کہ اس دنیا میں اب بھی ایسے خطّے موجود ہیں جن پر اُس جنت کا گمان ہوتا ہے جو حضرت آدمؑ سے چھن گئی۔ ہم نے اُن خطوں کو تلاش کیا اور آج آپ اِس زمین پر رہتے ہوئے اُس جنت کو دیکھیں گے جو اگلے جہان میں شاید آپ کو ملے یا نہ ملے۔ پہلے حصّے میں نیپال کے وہ علاقے دکھائے گئے جو ماؤنٹ ایورسٹ کے دامن میں واقع ہیں۔ دوسرا حصہ کشمیر کے مختلف مناظر سکرین پر لایا اور تیسرے حصّے کا آغاز کچھ یوں ہوا کہ تھیٹر میں نصب سپیکروں میں سے جیسے پُرشور سیلاب بہنے لگے۔ سکرین پر ایک سمندر صفت دریا ہے جو چٹانوں میں گھرا ہوا سر پٹخ رہا ہے اور اُس کے اُبلتے پانیوں اور شوریدہ سر لہروں پر لکڑی کے تختوں سے بنے ہوئے ایک رافٹ پر کیمرہ مین اپنی جان جوکھوں میں ڈالے ہوئے اُس دریا کی تُندی کو فلمبند کر رہے ہیں۔

"خواتین و حضرات ہم ہُنزہ جا رہے ہیں"

"ہنزہ؟" ـــــ لنڈن کی کرسمس کی شام میں وادیٔ کاغان کی ڈھلوانوں پر سرسراتی گھاس کی مہک آئی اور شاید کہیں چہرے پر پھیلتی سرد لبوں کے بوسے ہوا تھی اور ایک پیکر درّہ بابوسر کی جانب اُٹھتے ہوئے راستے پر چلنے لگا ـــــ تھیٹر میں بیٹھے ہوئے تماشائی ہنزہ میں سفر کر رہے تھے۔ اُن کے ایک جانب پہاڑ تھے آسمان ہوتے ہوئے اور دوسری جانب دریائے ہُنزہ تھا۔ نیچے عمیق گھاٹیوں میں ٹھاٹھیں مارتا ہوا اور سامنے راکاپوشی کی برفیں جو نزدیک آ رہی تھیں۔

"تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ تمہارے پاکستان میں ہنزہ ایسی وادی بھی ہے" ساؤتھ اینڈ واپس جاتے ہوئے ٹرین کی گرم آسودگی میں تھکی ہوئی جینس ہولے سے بولی۔

"مجھے خود پتہ ہوتا تو میں تمہیں بتاتا" میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں، "میرا خیال ہے تم "نیشنل جیوگرافک" میں چھپنے والی اس تصویر سے کہیں زیادہ خوبصورت ہو جس کی تلاش میں انسان ہُنزہ تک چلا جاتا ہے۔"

پنجاب پبلک لائبریری کے نیم تاریک کمروں میں بوسیدہ کتابوں کی مدّھم زرد باس میں سانس لیتے ہوئے میں سفرناموں کے شیلف پر جھک کر اُن کے ٹائیٹل پڑھنے کی کوشش کرتا۔ میں "اُندلس میں اجنبی" لکھ رہا تھا اور مجھے مسلمانوں کے عہد کے بارے میں تحقیقی مواد درکار تھا۔ لیکن وہاں بھی ہُنزہ تھا۔ "ہائی روڈ ٹو ہنزہ"، "ہُنزہ دی لاسٹ کنگڈم"، "دی گِلگت گیم"، "وِیر ایمپائرز میٹ" اور "ہُنزہ" ـــــ ہُنزہ ـــــ بھائی مجھے ہنزہ نہیں چاہیئے۔ ہسپانیہ چاہیئے۔

آئن سٹیفن کی ایک کتاب "دی ہارنڈ مُون" کا مطالعہ شروع کیا تو اُس میں سے بھی ہنزہ نکل آیا۔ میں نے ہُنزہ سے تنگ آکر "میر آف ہُنزہ۔ ہُنزہ" کے پتے پر ایک درخواست روانہ کردی کہ جناب عالی بندہ ہنزہ آنا چاہتا ہے، آجائے؟

میر صاحب کا جواب آیا کہ آجاؤ لیکن اس برس نہیں شائد میں چین چلا جاؤں ___ آئندہ اپریل میں تمہارا انتظار کروں گا ___ یہ کوئی بیس سال پہلے کی بات ہے ___ اگلے برس پتہ نہیں کیا ہوا ___ اُس سے اگلے برس بھی کچھ ہوگیا اور یہ کچھ ہوتا چلا گیا ___ ہُنزہ جانے کا ارادہ کرتا اور ٹکٹ کابل کا کٹا بیٹھا۔ اِس برس تو ہر صورت ہُنزہ اور اُس برس بیروت کی خانہ جنگی کے دوران دھماکوں اور گولیوں کی بوچھاڑ میں اپنی جان بچانے کیلئے بھاگ رہا ہوتا ___ پھر وہی لایعنی مصروفیات اور وہی زندگی جس کا کوئی حساب نہیں ہوتا ___ بس رات اور دن اور دن اور رات ___ ٹیلی ویژن کتابیں، کالم، ادبی محفلیں، بچوں کی فیسیں، سکول یونیفارم، چائے کی مہنگائی الیکشن۔ مارشل لاء۔ سفید بال، بزرگی، بھائی جان سے انکل ___ پانی ایک جگہ ٹھہرا رہا، اُس پر کائی کی موٹی تہ جم گئی اور سانس ایک جگہ رُکا رہا۔ عمر تمام ہوتی رہی اور پھر کچھ ہوا۔ شاید بلاوا آگیا۔ میں اپنے بیٹے سلجوق کے ہمراہ گلگت جانے والی ویگن میں سوار تھا اور گلگت سے پرے ہُنزہ تھا۔



ٹکسلا کے بُدھ، مانسہرہ کی خانم اور..... مائٹی انڈس!

"بھائی جان بالکل آٹا"۔ میجر مبشر نے جو مجھے اور سلجوق کو فلیش مین ہوٹل تک چھوڑنے آیا تھا۔ ویگن کی کھڑکی میں سے جھانکتے ہوئے کہا۔

"کیا آٹا؟"

یہی آپ کی ویگن کے ٹائر ــــ خستہ اور بُھر بُھرے ــــ کیا فاصلہ ہے یہاں سے گلگت تک کا؟"

چھ سو چونتیس کلومیٹر۔ چار سو چھ میل"۔ سلجوق نے اپنے گھٹنوں پر پھیلائے ہوئے ٹورازم کے کتابچے کو کنسلٹ کرتے ہوئے فوراً کہا۔

"مشکل ہے"۔ مُبشر نے سر ہلایا۔

"پھر اُتر جائیں؟" میں نے گھبرا کر کہا۔

"بیٹھے رہیں ابو"۔ سلجوق نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "مشکل سے تو سیٹ ملی ہے، کچھ نہیں ہوتا ٹائروں کو۔ آپ تو ایسے ہی ڈراتے رہتے ہیں"۔

"اچھا خدا حافظ ــــ" مبشر نے ہاتھ آگے کر دیا۔ اُسے دفتر پہنچنے کی جلدی تھی۔ "لیکن بھائی جان ٹائر تو بالکل ہی آٹا ــــ بیسٹ آف لک"

اس کے جاتے ہی میں باتھ روم جانے کے بہانے نیچے اُترا اور جھک

کر ٹائروں کو دیکھنے لگا۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" ایک صاحب میرے اُوپر جھکے آ گئے۔

"میں گلگت جا رہا ہوں۔ ٹائروں کی حالت کچھ ٹھیک نہیں لگتی"۔

"گلگت تو میں بھی جا رہا ہوں اور ہفتے میں دو مرتبہ جاتا ہوں اور انہی ٹائروں پر جاتا ہوں ـــــ کچھ نہیں ہو گا۔ آپ اندر بیٹھو"۔

ویگن فلیش مین ہوٹل سے باہر نکلنے لگی تو ایک مضطرب قسم کی ٹیکسی جھٹکے کھاتی ہوئی سامنے آ رکی۔

دروازہ پہلے ہی کھلا تھا۔ اُس میں سے ایک درمیانے قد کے باریش نوجوان ٹوپی ہلاتے ہوئے، ہنستے ہوئے باہر آئے اور ہماری ویگن کے اندر آ کر اگلی نشست پر بیٹھ گئے۔

راولپنڈی کی سڑکیں صبح کی بارش کی وجہ سے چمک رہی تھیں۔

آغازِ سفر کی اُداسی میرے بدن میں بیٹھنے لگی۔ اگرچہ یہ سفر وطن کے اندر تھا۔ لیکن گھر سے تو باہر تھا۔ــــ البتہ گھر کا ایک حصّہ سلجوق صورت میرے ساتھ تھا۔ میں اِس سفر پر بھی تنہا ہی نکلنا چاہتا تھا۔ لیکن شامتِ اعمال انہی دنوں سلجوق کی اُردو انگلش میڈیم میں پڑھنے کے باوجود اس مقام تک آن پہنچی تھی جہاں وہ میری سفری کتابیں باآسانی پڑھ سکتا تھا۔

"ابو میں بھی جاؤں گا"۔

"نہیں بیٹے بہت خطرناک سفر ہے"۔

"پھر تو آپ کو بھی نہیں جانا چاہیے"۔

"ابھی تم بہت چھوٹے ہو"۔

"ہا ہا ــــ چھوٹا ہوں۔ آٹھویں میں پڑھتا ہوں۔ قد آپ سے ایک

سنٹی میٹر زیادہ ہے۔ فٹ بال کھیلتا ہوں۔ چھوٹا کیسے ہوں؟"

"پھر بھی گھر میں کسی مرد کو تو رہنا چاہیے۔"

"سُمیر جو ہے۔"

"وہ بھی بہت چھوٹا ہے۔"

"ہا ہا۔ چھوٹا ہے ــــ سائیکل چلاتا ہے۔ اکیلا مارکیٹ چلا جاتا ہے اور چوتھی جماعت میں پڑھتا ہے۔"

"تمہاری امی بہت فکر مند ہوں گی۔"

"آپ کی امی فکر مند نہیں ہوتی تھیں۔ آپ بھی اُن کو چھوڑ کر چلے جاتے تھے۔"

سلجوق سے مجھے ایسی نالائقی کی اُمید نہ تھی کہ وہ میرے ہی سفرنامے پڑھ کر میرے ماضی کو حوالہ بنا کر مجھے ہی لاجواب کر دے گا۔

"اور مائنڈ نہ کرنا ابو۔" وہ اپنی عینک درست کرتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔ "اس عمر میں آپ کے ساتھ بھی تو کسی کو ہونا چاہیے۔"

"کیا؟" میرا غصہ اُبلتا اور مسکراتا ہوا تھا۔

"میں بُشریٰ آپو کا رک سیک لے آیا ہوں اور اُس میں آپ کا اور اپنا سامان پیک کر دیا ہے ــــ کب چلنا ہے؟"

اور یوں نہ چاہتے ہوئے بھی سلجوق میرے ساتھ تھا اور سفر کے انجام تک پہنچتے پہنچتے میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ میرے ساتھ تھا۔

ویگن راولپنڈی سے نکل کر پشاور روڈ پر آئی تو میں نے اپنے سفر کا پہلا سگریٹ سُلگایا۔ باآوازِ بلند تمام ملکی اور غیر ملکی مسافروں کو درجہ بدرجہ السلام وعلیکم اور گڈ مارننگ کہا اور پھر اُن سے اپنا تعارف کروانے کی درخواست کی کیونکہ سفر پندرہ گھنٹے کا تھا اور ویگن کا تھا اور آپ پندرہ گھنٹے دنیا کے

دشوار گذار ترین پہاڑی سلسلے قراقرم میں سفر کرتے ہوئے انتہائی بردباری اور متانت سے اعلیٰ انگریزی اخلاقیات کا مظاہرہ کرتے ہوئے گھٹنے پر گھٹنا جمائے، بوتھی اوپر اٹھائے لاتعلق سے بیٹھے نہیں رہ سکتے۔ آپ کو رفاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اندر کے خوف اور باہر کی خوبصورتیاں بانٹنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

"میں نواب ہوں" ڈرائیور کی نشست پر براجمان ایک بھاری تن و توش اور چمکتے پالش شدہ شین قاف والے صاحب نے پیچھے دیکھے بغیر فرمایا۔

"آپ ڈرائیور ہیں؟"

"نہیں میں پسنجر ہوں۔ ڈرائیور یہ ہے، بول بھئی اکبر"

"میں ڈرائیور ہوں صاحب، اکبر خاں میرا نام ہے"

میں نے اوائل سفر میں ہی یہ دریافت کرنا مناسب نہ جانا کہ اگر اکبر خان ڈرائیور ہے تو نواب صاحب جو کہ پسنجر ہیں سٹیئرنگ کیوں گھما رہے ہیں —— ویسے اکبر خان وہی صاحب تھے جنہوں نے مجھے آٹا ٹائروں پر جھکے پکڑ لیا تھا۔

وہ صاحب جو عین آخری لمحوں میں ٹیکسی سے اتر کر ہمارے ساتھی بنے تھے۔ راجہ صاحب تھے —— نواب۔ راجہ۔ اکبر —— ویگن میں خاصی رائلٹی جمع تھی۔ راجہ صاحب اسلام آباد انٹرنیشنل ائیر پورٹ پر کسٹم انسپکٹر ہوا کرتے تھے۔ جوانی کے دن اور کسٹم کی راتیں لیکن کسی حاسد کی نظر بد کا شکار ہوئے اور ان کی پوسٹنگ چینی سرحد کے قریب پاکستان کسٹم چوکی، سُوست میں ہو گئی تھی جہاں سے ہر برس ہزاروں چینی مسلمان داخل ہوتے ہیں۔ گلگت، اسلام آباد، کراچی اور مکہ مدینہ —— واپسی پر وہ تمام چینی حاجی بابا بکتاشی

بنے ہوتے ہیں اور اسی سوست کے راستے سے گذر کر ترکستان واپس چلے جاتے ہیں اور وہاں پھر مارکس اور ماؤ کا کلام پڑھنے لگتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہاں اسلام آباد کا انٹرنیشنل ایئرپورٹ، دنیا بھر کی میمیں اور صاحب، مشرقِ وسطیٰ سے لوٹنے والے پاکستانی بھائی بند اور کہاں ایک دور افتادہ پہاڑی گاؤں اور بے چارے چینی بابے ــــ چنانچہ راجہ صاحب اپنی اس پوسٹنگ پر اتنے پر مسرت تو نہیں تھے البتہ دل زندہ رکھتے تھے، انہوں نے اپنی ریش مبارک کے بارے میں فرمایا کہ اُدھر درہ خنجراب کی برفوں کا مقابلہ کرنے کے لئے بڑھائی ہے اور یہ کہ پچھلے پانچ روز سے صبح سویرے ایئرپورٹ پر پہنچتے تھے اور ہر روز فلائٹ کینسل ہو جاتی تھی اور چونکہ نوکری کیلئے رپورٹ کرنا ہے اس لئے مجبوراً ویگن کا سفر اختیار کرنا پڑا ورنہ کوئی بھی شخص جو اپنے حواس میں ہو یہ حماقت نہیں کر سکتا ــــ ایک احسان صاحب تھے۔ نوجوان تھے اور گلگت میں اپنے سینما کے لئے مار دھاڑ سے بھرپور پنجابی فلموں کے پرنٹ لئے جا رہے تھے۔ سکردو کے رہنے والے ایئرفورس کے ایک ملازم تھے جو چھٹی پر جا رہے تھے اور سب سے پچھلی نشست پر ہم دراز سیامی بلیوں کی طرح لاڈ کرتے ہوئے میاں بیوی اطالوی تھے۔

سینیور فیو دورو اور ان کی بیگم صاحبہ۔ دونوں کی شکلیں، ڈیلے جسم اور لباس تقریباً ایک جیسے تھے اور عینک سے پتہ چلتا تھا کہ یہ سینیور فیو دورو ہیں۔

ٹیکسلا کی پہاڑیوں میں سے دھول کے بادل بلند ہو رہے تھے۔ قریب پہنچنے پر معلوم ہوا کہ گڑگڑاتی کرش مشینیں بڑی بڑی چٹانوں کو بجری میں بدل رہی ہیں۔ یہ ساری لینڈ سکیپ اُن زمانوں سے جوں کی توں تھی جب ٹیکسلا تکشلا تھا اور ان پہاڑیوں میں بدھ بھکشو گھوما کرتے تھے۔ دور دراز کا سفر طے

کر کے نوجوان یہاں کی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے آیا کرتے تھے ـــــ لیکن اب ہمیں ایک قدیم تہذیبی لینڈ سکیپ برقرار رکھنے کی بجائے کرش بجری کی زیادہ ضرورت ہے۔ انہی کرش مشینوں کے پیٹ میں سینکڑوں گندھارا مجسّمے بھی چلے جاتے ہوں گے اُن کی بھی ماشاء اللہ بجری بنتی ہوگی اور کسی شاپنگ پلازا کی تعمیر میں کام آتی ہوگی ـــــ اِن علاقوں میں قدیم مجسموں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ایک آدھ بُت شکن کے بس کا روگ نہ تھا چنانچہ یہی کام مشینوں سے لیا جا رہا ہے ـــــ دائیں جانب ایک ٹوٹی پھوٹی سڑک کے باقیات تھے۔ سلجوق نے عینک درُست کر کے وہاں ایستادہ بورڈ پر لکھی عبارت پڑھی " یہ سڑک مغلیہ عہد کی ہے اور کابل سے بنگال تک جاتی تھی "

ظاہر ہے اس زمانے میں یہ بنگال تک ہی جاتی ہوگی مگر اب تو بنگال جانے والی تمام سڑکیں ہم نے خود ہی توڑ پھوڑ ڈالی ہیں۔ دور بہت تھا اور پھر بنگالی زبان اور ثقافت ہم سے بہت مختلف تھی ـــــ اتنی مختلف کہ ہم نے جبر کی کرش مشینوں میں ملک کے اس ٹکڑے کو ڈالا اور اُس کے گوشت پوست کی بجری بنا کر قومی سلامتی اور استحکام کے شاپنگ پلازہ تعمیر کر لئے۔

نواب صاحب نے ویگن کو ایک دھچکے سے موڑا اور جی ٹی روڈ چھوڑ کر ٹیکسلا شہر کے اندر داخل ہو گئے " خان پور روڈ پر ٹریفک کم ہوتی ہے اُدھر سے جلدی پہنچ جائیں گے "

سری کپ کے قدیم دارالسلطنت کے کھنڈروں کے قریب چند مکان تھے جن کے اندر آج بھی گندھارا عہد کے مجسّمے اور سٹوپے " تیار " کیے جاتے ہیں اور انہیں بنانے والے حضرات انہیں آستینوں میں چھپا کر سری کپ اور جولیاں آنے والے سیاحوں کو چوری چھپے دکھاتے ہیں۔ صاحب دو ہزار سال پُرانا

بُڈھا خرید لیے گا ـــــ صاحب ابھی ابھی میرے والد صاحب قبلہ کھیت میں ہل چلا رہے تھے کہ سکندر اعظم کا یہ سر برآمد ہوا ـــــ صاحب سکندر اعظم کا سر صرف پچاس روپے میں" میرے ایک دوست اس قسم کا ایک سکندر اعظم خرید کر لے گئے۔ گھر جا کر تپائی پر سجایا اور اس کے گرد موم بتیاں وغیرہ روشن کر دیں تاکہ ایٹ ہوم محسوس کرے۔ ایک روز کسی کی ٹھوکر سے سکندر اعظم منہ کے بل زمین پر گرے اور موصوف کے دو ٹکڑے ہو گئے ـــــ معلوم ہوا کہ پلاسٹر آف پیرس سے بنائے گئے ہیں اور ابھی ٹھیک طرح سے سوکھ بھی نہیں سکے۔

جُولین کی قدیم بدھ درس گاہ کو جانے والا دھول زدہ راستہ ویران پڑا تھا۔ پچھلے برس اس کے شاندار کھنڈروں میں گھومتے ہوئے میں سلجوق کو سمجھا رہا تھا کہ یہ دیکھو یہاں باورچی خانہ ہوگا، ابھی تک نالیاں جُوں کی توں قائم ہیں۔ یہ خانقاہ کا ہال کمرہ تھا جس کے چاروں اور کھڑکیوں میں مجسّمے سجے تھے اور یہ وہ قدیم سٹوپا ہیں جو دراصل کتابوں کا کام دیتے تھے۔ اِن پر مہاتما بدھ کی زندگی کے مختلف ادوار تراشے گئے ہیں جنہیں طالب علم "پڑھتے" تھے۔ میرے اس عالمانہ لیکچر کے دوران سلجوق نے خانقاہ کے فرش پر سے گولڈ لیف کی ایک خالی ڈبیا اٹھائی اور کہنے لگا "ابو وہ بدھ ہوتے گولڈ لیف پیتے تھے؟" ـــــ اگر اُس نے یہ سوال تمام تر معصومیت اور سنجیدگی سے نہ پوچھا ہوتا تو میں یقیناً ناراض ہو جاتا ـــــ جُولین کے قریب سے گذرتے ہوئے اُس کا چہرہ کھنڈروں کی جانب تھا اور اس کی باچھوں کے پھیلاؤ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مسکرا رہا ہے۔ مجھے فوراً ہی احساس ہو گیا کہ اس نے وہ سوال تمام تر معصومیت اور سنجیدگی سے نہیں پوچھا تھا۔

خان پور شہر میں سے گذرنے کے بعد ہم خان پور ڈیم کی وسیع جھیل کے ساتھ سفر کرنے لگے۔ ہری پور کے نواح پہاڑوں کی قربت اور سکون میں خاموش اور سر سبز تھے۔ حویلیاں کے بعد ایک پہاڑی موڑ پر راجہ صاحب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "تارڑ صاحب یہ دائیں جانب کھوتا قبر ہے"۔

"کھوتا؟" سلجوق چونکا "ابو، کھوتا، گدھے کو ہی کہتے ہیں ناں؟" ——سکول میں انگریزی، گھر میں اُردو اور پنجابی غائب —— پنجابی بچوں کو اب یہ نہیں معلوم کہ "کھوتا" کیا ہوتا ہے۔ وہ اِسے سوفسٹیکیٹڈ طریقے سے گدھا کہتے ہیں یا ڈنکی ——

"کھوتا صرف کھوتا ہوتا ہے میرے بیٹے گدھا اور ڈنکی وغیرہ کہا جائے تو وہ کچھ اور ہو جاتا ہے کھوتا نہیں رہتا"۔

"جناب ایک بہت بڑے بزرگ کا کھوتا تھا" راجہ صاحب بتانے لگے "بڑا کرامتی کھوتا تھا۔ چنانچہ فوت ہوا تو مقبرہ بنا اور اب بڑی بڑی دُور سے لوگ کھوتا زیارت کے لئے آتے ہیں"

سلجوق نے اپنی انگریزی چمکانے کی خاطر یہ کھوتا معلومات ترجمہ کر کے اطالوی جوڑے تک پہنچا دیں جو بقیہ مسافروں سے الگ تھلگ ایک دوسرے سے ناکیں رگڑ رگڑ کر جانے کس بات پر خوش ہو رہے تھے۔

"اوہ ڈونکی" فیودورو نے ناک اُٹھائی "ویری انٹرسٹنگ" اور پھر اسی عمل میں مشغول ہو گیا۔

اکبر نے ناگواری سے ان کی طرف دیکھا "نہ دن دیکھتے ہیں نہ رات خانہ خراب کے بچے"۔

ایبٹ آباد میں ویگن رکی تو سلجوق کہنے لگا "ابو ادھر ہنزہ میں کوکا کولا مل جاتا ہے؟"

"کوکا کولا؟ ـــــ کوہِ قراقرم میں پوشیدہ اس پُراسرار دنیا جہان سے کٹی ہوئی برفانی وادی میں؟ نہیں بیٹے وہاں اس جدید دنیا کی کوئی آسائش دستیاب نہیں ہوتی ۔ وہاں تو راکاپوشی اور کے ٹو کی برفوں سے جنم لینے والی ندیاں ہوں گی ۔ بالتورو اور الترگلیشیئر کے یخ پانی ہوں گے ۔ لیکن یہ پانی نہیں ہوں گے کوکا کولا وغیرہ ـــــ ؟

"اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے یہ پانی نہیں پر جی بھر کے پی لینے چاہئیں"

چنانچہ اس نے جی بھر کے کوکا کولا کی بوتلیں نوش کیں اور پھر راستے کے لئے ایک ڈبل روٹی اور کچھ پنیر خرید لیا ۔ اگرچہ ٹورازم والوں کی جانب سے بشام میں ہمارے لئے ایک اعلیٰ درجے کا لنچ منتظر تھا ۔

ایبٹ آباد سے باہر آئے تو اکبر خان نے نواب صاحب سے درخواست کی کہ ذرا ایکسلریٹر دباتے چلئے سفر ابھی شروع نہیں ہوا اور آپ نے یہیں دوپہر کر دی ہے ۔ چنانچہ نواب صاحب نے ایکسلریٹر دبا تو دیا لیکن اکثر اوقات ڈھلوانوں پر وہ قدرے بے قابو ہو جاتے اور اپنے وزنی جُثے کو لنگر بناتے ہوئے ویگن کے ڈولتے جہاز کو کنٹرول کرتے ۔

"اکبر خان اگر آپ ڈرائیور ہو تو آپ کیوں نہیں چلاتے؟" میں نے بالآخر پوچھ ہی لیا ۔

جواب نواب صاحب کی طرف سے آیا "سفر طویل ہے اسے ذرا ریسٹ مل جائے گا ۔ میں تو صرف شغل کے لئے چلا رہا ہوں"

ان کی ڈرائیونگ سے بھی یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ صرف شغل کے لئے

بلکہ شغل میلے کے لئے چلا رہے ہیں۔ کیونکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا وہ قدرے بے قابو ہوتے جاتے تھے۔

"اس کے علاوہ آپ کا کیا شغل ہے نواب صاحب؟"

نواب صاحب نے زیرِ لب کچھ کلمات ارشاد فرمائے جو مجھ تک نہ پہنچ سکے اور شاید یہی ان کا مدعا تھا۔

"آپ گلگت جا رہے ہیں؟"

"شاید" وہ مسکرائے۔

سفر کے اختتام تک مجھے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ نواب صاحب کون ہیں۔ اس ویگن میں شغل کے علاوہ کیا کر رہے ہیں؟

کہاں جا رہے ہیں ــــ مجھے شک سا ہوا کہ یہ حضرت کوئی جاسوس وغیرہ ہیں لیکن اتنے بھاری بھرکم جاسوس کو میرا ذہن قبول نہ کر سکا۔

مانسہرہ کے بھرے پُرے بازار میں سے ویگن بائیں ہاتھ مڑ گئی۔ وادیٔ کاغان اور مظفر آباد جانے والی سڑک دائیں ہاتھ پر رہ گئی تھی ــــ اُس راستے میں سیاہ جنگلوں میں گھرا بڑا اسی کا ریسٹ ہاؤس پڑتا تھا۔ جہاں ایک طویل قیام کی خواہش کو میں نے ایک مختصر پکنک اور ایک خواب کی رفاقت سے مٹایا تھا۔

مانسہرہ کی آبادی ختم ہوئی تو ہم یکدم جیسے نیچے بیٹھتے بیٹھتے ہموار سطح پر اُتر آئے۔ سامنے ایک طویل اور سپاٹ شاہراہ تھی جس کے کناروں پر سرسبز درخت بلند تھے ــــ دائیں ہاتھ پر ایک پہاڑی کے اُوپر اشوکا کی راکس معلق تھیں۔

اور وہ دن مانسہرہ ریسٹ ہاؤس میں پہلے تین چار دن، دھوپ میں

آنکھیں بند کر کے لان میں بچھی کرسی پر اونگھنے کے دن تھے۔ نیچے قدموں میں وادیٔ مانسہرہ کا پیالا نما میدان تھا جو اُس سُست اور بے فکری کیفیت میں ایک دھندلی تصویر کی طرح نظر آتا رہتا۔ کبھی لاہور واپسی کا ارادہ کرتا تو میری بہن شاہدہ اور بہنوئی میجر الطاف کہتے، ہائیں بھائی جان، اتنی مدت کے بعد تو آپ ہمارے پاس آئے ہیں —— جگہ پسند نہیں؟

"جگہ تو پسند ہے" میں اُن کی محبت کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا۔ شاہدہ اور میمونہ سارا دن بچوں کی دیکھ بھال کرتیں۔ تازہ ترین مقامی سکینڈلوں میں مگن رہتیں اور میجر الطاف فوجی ڈیوٹیوں پر تعینات رہتے اور میں —— لان میں کرسی ڈالے اونگھتا رہتا۔ ایک روز میں اس مراقبے کی کیفیت سے تنگ آ گیا اور ڈیوٹی پر کھڑے ایک حوالدار قسم کی چیز سے پوچھا کہ بھائی اِدھر مانسہرہ میں کوئی قابلِ دید مقامات بھی پائے جاتے ہیں کہ نہیں۔ چونکہ ایک میجر صاحب کا سالا صاحب ہونے کی نسبت سے وہ مجھے بھی کم از کم لفٹین کا رتبہ تو دیتا تھا۔ اس لئے اُس نے پہلے مجھے اور پھر زمین کو دہلا دینے والا ایک سیلوٹ مارا اور میرے کندھے سے پرے دیکھتا ہوا کہنے لگا "صاحب اِدھر قصبے سے پرے ہندوؤں کا پہاڑ ہے"

"ہندوؤں کا پہاڑ؟"

"جی صاحب۔ اُس پر کچھ لکھا ہوا ہے کافروں کی زبان میں۔ ٹورسٹ لوگ اُدھر جاتا ہے۔ آپ بھی ہو آؤ"

یہ ہندوؤں کا پہاڑ دراصل مہاراجہ اشوک کے زمانے کی چٹانیں تھیں۔ اشوک کے فرمان اس کی وسیع سلطنت کے طول و عرض میں بڑی بڑی چٹانوں پر کندہ کر دیئے گئے تھے تاکہ رعایا اپنے مہاراجے کی پُرامن

اور نیک خواہشیں جان سکے اور اُن پر عمل کر سکے۔ اُن چٹانوں میں کھُدی ہوئی عبارت کا متن آثارِ قدیمہ کی جانب سے نصب کردہ تختیوں پر درج تھا۔

سلجوق یہاں بھی میرے ہمراہ تھا۔

"ابو ان چٹانوں پر جو کچھ لکھا ہوا ہے آپ کو کیسے پتہ ہے کہ آثارِ قدیمہ والوں نے اُس کا صحیح ترجمہ کیا ہے؟"

"بھئی مجھے پتہ تو نہیں لیکن —— ٹھیک ہی ہو گا اور تم ابھی مہاراجہ اشوکا کے بارے میں گفتگو کرنے کے لئے بہت چھوٹے ہو۔"

اُس نے ناک چڑھا کر اپنی عینک درست کی اور چٹانوں پر کندہ قدیم عبارت پر یوں جھک گیا جیسے صرف وہی اُسے پڑھنا جانتا ہو۔

"تارڑ صاحب۔"

میں نے ٹھٹک کر پیچھے دیکھا —— سفید وردی میں ملبوس ایک بوڑھا اکڑوں کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ مجھے شک سا ہوا کہ اُس نے مجھے نہیں کسی طارق صاحب کو بلایا ہے کیونکہ اس کا چہرہ میرے لئے مکمل طور پر اجنبی تھا۔

"تارڑ صاحب"

" وہ مجھ سے ہی مخاطب تھا۔

"جی فرمایئے۔"

"خانم آپ کو یاد کر رہی ہیں۔" وہ بُت بنا کھڑا رہا۔ اشوکا کی چٹانوں میں ایک بُت۔

"کونسی خانم؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

اُس کے چہرے پر بے یقینی اور غصّے کے آثار نمودار ہوتے جیسے مجھے جاننا چاہیئے تھا کہ وہ کونسی خانم کی بات کر رہا ہے۔ "وہ اُدھر" اُس نے چٹانوں

سے پرے ایک بلندی پر واقع ایک شاندار حویلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ آپ کی منتظر ہیں۔"

سفر کے دوران ایسا ہو جاتا ہے کہ کھڑکیوں اور دروازوں اور پردوں میں پوشیدہ خواتین مجھے پہچان لیتی ہیں اور بلاوا بھیجتی ہیں کہ ایک پیالی چائے تو پیجئے ہمارے ساتھ اور وہاں جا کر مجھے پشیمانی ہوتی ہے۔ آپ چڑیا گھر کے ایک جانور کی طرح اُن کی دلچسپی کا باعث بنتے ہیں، بُت بنے بیٹھے رہتے ہیں اور وہ آپ کو دیکھ کر ہنستی رہتی ہیں، ایک دوسرے کو کہنیاں مارتی رہتی ہیں۔ جیسے آپ کوئی عجوبہ ہوں، شتر مُرغ یا دو کوہانوں والے تبتی اُونٹ ہوں، انسان نہ ہوں، چنانچہ قابلِ فہم طور پر میں اس قسم کی "ملاقاتوں" سے کتراتا ہوں۔

"آپ خانم کو کہہ دیجئے کہ میرے بچے بھی میرے ساتھ ہیں اور میرے پاس وقت بھی نہیں ہے۔" اس شخص نے مجھے کھا جانے والی نظر سے دیکھا اور بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

چند لمحوں بعد وہ پھر نمودار ہو گیا "خانم کہتی ہیں کہ آپ بچوں کو بھی ساتھ لے آئیں۔ چائے اور کافی تیار ہے ـــــ بچوں کے لئے چاکلیٹ کیک بھی منتظر ہے ـــــ وہ بے حد شکر گزار ہوں گی۔"

"چلتے ہیں ابّو۔" سُمیر نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا "اور ہمیں بھوک بھی لگ رہی ہے"

سُمیر کے اِس فقرے پر بوڑھا پہلی مرتبہ مُسکرایا۔

"تشریف لائیے۔"

ہم آہستہ آہستہ حویلی کی طرف چڑھنے لگے۔ ایک بڑا پھاٹک جیسے خود بخود کُھل گیا۔ سامنے ایک دراز قامت، سفید رنگت اور سفید بالوں والی صحت مند

خاتون ایک لمبے چوغے میں ملبوس کھڑی مسکراہٹیں ہی مسکراہٹیں تھیں۔

"میں بے حد مشکور ہوں"۔

حویلی کے اندر ایک قدیم باس تھی جیسے تاریخی قلعوں کے بند تہ خانوں میں ہوتی ہے۔ ڈرائنگ روم میں چینی طرز کا فرنیچر تھا جس پر نازک بیل بوٹے اور اژدھے کھدے ہوئے تھے۔ دیواروں پر پرانے مجسمے اور منقش ریشمی چادریں تھیں۔ ایک طویل میز اشیاءِ خوردنی کی کثرت سے مختصر ہو رہی تھی جیسے کسی سربراہِ مملکت کی آمد کی منتظر ہو۔

باوردی بوڑھا ایک کونے میں مؤدب ہو کر کھڑا ہو گیا ــــــ اپنے پہلو میں رکھے بدھ کے مجسمے کی طرح خاموش اور ساکت۔

"ہم آپ کو ٹیلی ویژن پر دیکھتے رہتے ہیں۔ آپ کی تحریریں پڑھتے رہتے ہیں ــــــ مجھے ابھی ابھی نیچے بازار سے ٹیلی فون آیا تھا کہ تارڑ صاحب مانسہرہ میں ہیں اور اس وقت اشوکا راکس کی طرف جا رہے ہیں۔ میں نے بھی یہاں سے اس ٹیرس سے آپ کو اُدھر جاتے ہوئے دیکھا ــــــ آپ کچھ لیجیے ناں؟"

بچوں نے بھوکی نظروں سے میری طرف دیکھا ــــــ میں نے اشارہ کیا کہ ابھی نہیں۔

آتش دان پر سنہری فریموں میں پھیکی پڑتی ہوئی بے شمار تصویریں تھیں ان میں سے ایک ماؤزے تنگ کی تھی اور اُس کے پہلو میں مؤدب کھڑی ایک نسبتاً جوان خانم تھیں ــــــ دوسری تصویر میں وہ چواین لائی کے ہمراہ چائے نوش کر رہی تھیں۔۔۔ یا وحشت یہ خاتون کون ہیں اور اِدھر مانسہرہ جیسے چھوٹے سے قصبے میں کیا کر رہی ہیں ــــــ اُن کے لب و لہجے سے غیر ملکی ہونے کا ایک موہوم سا تاثر ملتا تھا

"ماشاء اللہ آپ کے اپنے بچے ہیں ناں؟"

"جی جی بالکل ـــــ"

"تو آپ انہیں کھانے کی اجازت دیں وہ آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں"

میں بے حد شرمندہ ہوا کہ ان ندیدے بچوں نے میرے سارے امیج کا ستیاناس کر دیا ہے بہرحال میں نے سر ہلایا اور وہ نہایت صبر و تحمّل سے لیکن قدرے بھوکے انداز میں پیسٹریاں اُٹھا اُٹھا کر کھانے لگے۔

چائے کے بعد خانم نے اپنی حویلی کے مختلف حصّے دکھائے ـــــ وہی پرانی مہک اور قدیم وضع کی اشیاء اور اُن میں یہ سفید بالوں والی شاہانہ خاتون

ایک چھوٹے سے کمرے کے وسط میں ایک چینی صندوق رکھا ہوا تھا جس کی سیاہ لکڑی پر سنہری اژدہے پھنکار رہے تھے۔

"چینی لوگ ان صندوقوں میں اپنے مُردے دبایا کرتے تھے ـــــ یہ میں اپنے لئے لے آئی ہوں ـــــ" خانم نے اس کی سطح پر پیار سے ہاتھ پھیرا ـــــ مجھے جھُرجھری سی آگئی۔ پتہ نہیں خانم یہ صندوق بلکہ چینی تابوت اپنے لئے کیوں لائی ہیں۔

"خانم آپ ـــــ آپ پاکستانی ہیں؟" میں نے بالآخر پوچھ ہی لیا۔

"الحمداللہ ـــــ انہوں نے جھُک کر سینے پر ہاتھ رکھا" اب میں پاکستانی ہوں ـــــ میرے خاوند پاکستان فارن سروس کے ایک اہم عہدیدار تھے یہ بہت روز پہلے کی بات ہے کہ اُن کی تعیناتی ایران میں ہوگئی ـــــ اور وہاں میں تھی ـــــ" خانم کا سُرخ و سپید چہرہ اپنے شریکِ حیات سے اوّلین ملاقات کی یاد سے قدرے مزید سُرخ ہوا "اور ـــــ بس ہم ایک دوسرے کو پسند آگئے اور ہم نے شادی کرلی ـــــ پھر میں آخری دم تک اُن کے

ساتھ رہی۔ یہ تصاویر اس زمانے کی ہیں جب ہماری پوسٹنگ پیکنگ میں تھی۔ ماؤ اور چواین لائی ہمارے دوست تھے ــــ اور پھر ــــ اور پھر اُن کو موت نے مجھ سے الگ کر دیا۔ اُن کے بعد بھی میرا جی نہیں چاہا یہ وطن چھوڑنے کو، وہ مانسہرہ کے ایک قریبی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ چنانچہ میں نے یہیں مکان بنالیا ــــ بس میں ان تصویروں میں اور اُن کی یادوں میں زندہ ہوں ــــ ماشاء اللہ میرا ایک بیٹا بھی ہے جو اِن دنوں بشام میں تحصیلدار ہے ــــ آپ کبھی گلگت کی طرف جائیں تو اُسے ضرور ملیئے گا ــــ"

بچہ لوگ پیٹ بھر کر کھا چکے تو چینی اژدھوں، بدھ کے مجسموں اور نایاب چینی پیالوں کو اُلٹنے پلٹنے لگے۔ چنانچہ میں نے اُن کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اجازت چاہی ــــ ملاقات کی یادگار کے طور پر خانم نے مجھے ایک خوبصورت چینی برتن تحفے میں دیا۔

ہم مانسہرہ کے راستے اشوکا راکس کے سائے میں سے گذر رہے تھے اور اِن مہیب چٹانوں سے پرے خانم کا گھر دکھائی دے رہا تھا۔

نواب صاحب نے ہموار سڑک سے فائدہ اُٹھایا اور ویگن کی رفتار بے حد تیز کر دی۔

سڑک کے دونوں جانب افغان پناہ گزینوں کی خیمہ بستیاں گذرنے لگیں۔ مویشیوں کی ایک منڈی دکھائی دی۔ جس میں سے ایک منہ زور گھوڑا سرپٹ بھاگتا ہوا سڑک کے قریب آگیا۔

چھتر پلین ایک مختصر اور خاموش سی آبادی تھی جو مانسہرہ وادی میں جیسے اونگھ رہی تھی اور ہماری ویگن کی آمد پر اُس نے ٹھٹک کر آنکھیں کھولیں، جھپکیں

دیکھا اور پھر اونگھنے لگی۔

بٹ گرام اچھا خاصا شہر نما قصبہ تھا اور ہم اس کے بھرے پُرے بازار میں سے ہارن بجاتے ہوئے گذر گئے۔ بٹل کے قصبے سے آگے پوری لینڈ سکیپ یکدم ویران ہو گئی۔۔۔ سڑک خالی سنسان، چیڑ کے درخت ساکت خاموش، کوئی آواز نہ تھی، کوئی پرندہ نہ تھا، نیچے بہتا نامعلوم دریا بھی جیسے کبھی بہتا کبھی رُک جاتا ـــــ صرف نواب صاحب کا بھاری وجود سٹیئرنگ کے گرد بل کھانے کی کوشش میں مصروف تھا اور ہم جیسے چُپ کے دیس میں آنکلے ہوں۔ نیچے چیڑ کے درختوں اور موٹی چٹانوں سے نیچے دریا تھا جس پر لکڑی کا معلق پُل اِس بُلندی سے ایک ماڈل دکھائی دیتا تھا۔۔۔ سلجوق اونگھ رہا تھا۔

"اکبر بھائی"، میں نے اگلی نشست پر اونگھتے ڈرائیور کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا "یہ شاہراہِ ریشم کب شروع ہوگی؟"

"ہیں؟ وہ چونک اٹھا" وہ تو صاحب حویلیاں سے ہی شروع ہوگئی تھی۔"

"ہم شاہراہ ریشم پر سفر کر رہے ہیں"، میں نے پُرمسرت لہجے میں اطالوی جوڑے کو نوید دی۔

"اوہ واقعی؟ ـــــ" وہ دونوں سنبھل کر بیٹھ گئے۔

صرف یہ جان لینے سے کہ ہم اب شاہراہِ ریشم پر جا رہے ہیں ہم سب اپنے آپ کو زیادہ اہم محسوس کرنے لگے۔ اطالوی فیو دورو نے اپنے بیگ میں سے اطالوی زبان میں لکھی ہوئی ایک ضخیم کتاب "پاکستان" نکالی اور ہمیں شاہراہِ ریشم کے بارے میں مکمل معلومات بہم پہنچانے میں مصروف ہوگیا

شاہراہِ ریشم جسے چینی شاہراہِ دوستی کہتے ہیں عرفِ عام میں کے کے ایچ یعنی قراقرم ہائی وے کہلاتی ہے۔ پاکستان کے شہر حویلیاں سے شروع ہو کر آٹھ سو چار کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ترکستان کی سرحد درہ خنجراب پر ختم ہو جاتی ہے۔ اسے پندرہ ہزار پاکستانیوں اور دس ہزار چینیوں نے مشترکہ طور پر مکمل کیا۔ چٹانوں میں راستہ بنانے کے اس عمل میں فی کلو میٹر کم از کم ایک شخص ہلاک ہوا یعنی آٹھ سو چار انسانی جانوں کی قربانی سے آٹھ سو چار کلو میٹر طویل سڑک دنیا کے دشوار گزار ترین پہاڑی سلسلے میں سے وجود میں آئی۔ اس پر ننانوے بڑے پُل ہیں اور سترہ سو آٹھ چھوٹے پل۔ اِس کے ساتھ ساتھ دنیا کے مشہور ترین دریاؤں میں سے ایک یعنی انڈس بہتا چلا جاتا ہے۔ انڈس جسے اباسین اور شیر دریا کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔

"اچھا؟ یہ اِنڈس ہے؟" میں نے گہرائی میں لیٹے ہوئے ایک گدلے نالے کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"نو" فیودوروو نے انگلی اُٹھائی۔ "اِنڈس یہاں سے شروع ہو گا" اُس نے کتاب میں چھپے ہوئے ایک نقشے پر انگلی گراتے ہوئے کہا —— وہاں تھاکوٹ لکھا تھا اور فیودوروو نے اِسے اطالوی لہجے میں تھکوت بنا دیا۔

شاہراہِ ریشم کا نام سننے کے بعد ہم سب میں جو ایڈونچر کی رُوح بیدار ہوئی تھی۔ کچھ پژمردہ سی ہو گئی کیونکہ یہاں راستہ قدرے پُر خطر تو تھا لیکن دنیا کے دشوار ترین پہاڑی سلسلے والی کوئی بات نہ تھی۔ پہاڑ بھی نہایت معمولی اور درمیانے درجے کے تھے اور سڑک بھی بس یونہی سی تھی، شاہراہِ ریشم کے نام کا دبدبہ اور ہیبت اِسے چھُو کر بھی نہیں گیا تھا —— ہم خاصے مایوس ہو چکے تھے —— اور پھر تھاکوٹ آ گیا۔

چیڑ کے درخت چھدرے ہوتے ہوتے کم ہوئے، بلندی سے نیچے اُترنے کا عمل شروع ہوا، پہاڑ ہم سے پرے ہوتے گئے اور پھر ہوا کا ایک ایسا جھونکا آیا جس میں نم ٹھنڈک تھی۔

"انڈوتس"، فیودورو کھڑکی میں سے پوری گردن باہر نکال کر جیسے کسی دوست سے ہمکلام ہوا۔

اور وہاں انڈس تھا۔ اُس کے عقب میں بلند چٹانیں بڑی بے بسی سے اُسے دیکھ رہی تھیں اور وہ بڑے اطمینان سے بڑی دھیرج سے چوڑا ہو کر بہہ رہا تھا ـــ دی مائٹی انڈس۔ دی لائن رِور۔ کنگ آف رِورز اور ہمارا آپ کا سندھ۔ نم ٹھنڈک بدن کے مساموں میں سرسرانے لگی۔ پاپلر کے چند درخت۔ دریا کے کنارے ہموار چھتوں والے گھر۔ سرکاری عمارتیں۔ بیرکیں .... بس یہی تھاکوٹ تھا۔ ایک غیر قدرتی سی لبستی جو انڈس کے عظیم وجود کے سامنے بے حد حقیر لگ رہی تھی۔

ہم اس کے قریب ہوئے اور پھر اس کے پانی ہماری ویگن کے پہیوں کے بہت نیچے بہنے لگے ہم ایک طویل پُل سے گذر کر سندھ کے دوسرے کنارے پر آئے اور دائیں ہاتھ پر پہاڑی سلسلے کی اوٹ میں تراشی ہوئی سڑک پر مڑ گئے۔ ہم جو صبح سے بھوکے پیاسے اونگھ رہے تھے انڈس کی قربت سے چوکس ہو گئے بیدار ہوئے اور تازہ دم ہو کر اُسے دیکھنے لگے اور اس کی گہری گونج دار آواز سننے لگے۔ تھاکوٹ پیچھے رہ گیا۔

فیودورو کھڑکی میں سے لٹک کر تصویریں بنانے میں مشغول تھا اور سلجوق ایک بچے کی طرح جو کہ وہ تھا چٹانوں میں بہتے اس عظیم دریا کو وی سی آر پر چلتی کسی فلم کی دلچسپی کے ساتھ دیکھے جا رہا تھا۔

فیودوروف نے گردن اندر کی اور مسکرا کر کہنے لگا "یہ انڈوس اِز مائی فرینڈ" ....پچھلے برس ہم دونوں میاں بیوی لداخ گئے تھے اور اپنا سفر اس مقام سے شروع کیا تھا۔ جہاں سے انڈس، تبت اور کشمیر میں بہنے کے بعد لداخ میں داخل ہوتا ہے۔ ہم اس کے ساتھ ساتھ چلے اور وہاں چھوڑا جہاں یہ دریا بلتستان میں داخل ہو جاتا ہے۔ اب ہم سکردو جا رہے ہیں اور اُسی مقام سے اپنا سفر شروع کریں گے جہاں سے سرحد پار ہم نے پچھلے برس چھوڑا تھا۔ پھر انڈوس کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے یہاں تک آئیں گے اور پھر اس کے ہمراہ شائد کراچی تک چلے جائیں"

"ہم انڈوس کا پیچھا کر رہے ہیں" اُس کی بیوی نے ہنس کر کہا۔

نیچے چٹانوں پر کھڑے کچھ لوگ انڈس کے اُبلتے پانیوں میں ڈوریاں ڈالے مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ جہاں کہیں کنارے کے ساتھ زمین تھی وہاں کھیت تھے، سبزہ تھا۔

سڑک پُر پیچ تھی۔ انڈس کا بہتا ہوا پانی نظر آتا ـــــ اوجھل ہو جاتا۔ کبھی چھوٹا سا فیتہ کبھی پورے وجود کے ساتھ سامنے ـــــ لیکن سفر پُر خطر نہیں تھا پر لطف تھا۔ سڑک کے کنارے ایک سنگِ میل نظر آیا۔

کاشغر = ۹۷۵ کلومیٹر

پیکنگ = ۵۴۲۵ کلومیٹر

"اکبر خان یہ ویگن سیدھی کاشغر تک نہیں جا سکتی؟" راجہ جو بڑی دیر سے چُپ تھا گردن اُونچی کر کے بولا۔

"میرے پاس چینی ڈرائیونگ لائسنس نہیں ہے جناب، ورنہ کاشغر کیا یہ ویگن سیدھی پیکنگ بھی جا سکتی ہے۔"

اکبر خان ہنس کر کہنے لگا۔

"تمہارا ڈرائیونگ لائسنس کہاں سے شروع ہوتا ہے اکبر خان؟"

راجہ نے پوچھا کیونکہ سٹیرنگ ابھی تک نواب صاحب کے ہاتھوں میں تھا۔

"بشام کے بعد"

"اور بشام کتنی دور ہے؟"

"وہ سامنے"

وہ سامنے ایک گندہ سا اُداس بازار تھا، غلیظ ہوٹل تھے اور گرد، بس اور پیٹرول کی بوئیں بسی ورکشاپیں تھیں۔ اندس ساتھ تھا مگر اُس کی خنک ہوا بھی یہاں بدبودار ہو رہی تھی۔

"کھانے کا وقفہ" اکبر خان نے اعلان کیا۔

"لیکن ——" فیو دورد نے فوراً احتجاج کیا "ہمیں تو بتایا گیا تھا کہ بشام کے ٹورسٹ ریسٹ ہاؤس میں ہمیں لنچ دیا جائے گا، اسی کرائے میں"

اکبر خان نے فیو دورد کی بجائے مجھے مخاطب کرنا مناسب جانا "صاحب اِسے بولو کہ یہاں بازار سے پیچھے ریسٹ ہاؤس میں جا کر کھانا بنوانے میں دو ڈھائی گھنٹے ضائع ہو جائیں گے —— دو بج چکے ہیں اور ابھی تو سفر شروع نہیں ہوا —— یہیں کھا پی لو بازار میں" اور پھر وہ اور نواب صاحب حسبِ معمول ہاتھ میں ہاتھ ڈالے غائب ہو گئے۔

میں نے یہ صورتِ حال فیو دورو تک پہنچا دی جو مُفت کے بُھنے ہوئے مُرغ اور سلاد وغیرہ کے لئے منہ سنوار رہا تھا لیکن صابر و شاکر نکلا فوراً تھیلے میں سے سوکھے ہوئے بسکٹ نکال کر کھانے لگا۔ سلجوق نے یہاں پر بھی مزید کوکے کولے پیئے بلکہ سب مسافروں نے کوکے کولے ہی پیئے کیونکہ بازار میں

کھانے والی کوئی ایسی شے موجود نہ تھی جسے اُبکائی کے بغیر کھایا جا سکتا۔



شیر دریا سندھ اور ہم اور شاہراہِ قراقرم اور ہم۔

ڈھائی بجے کے قریب ہم بشام سے نکلے اور چند کلومیٹر کی مسافت کے بعد ہی ہمیں معلوم ہو گیا کہ بشام جنت تھا اور ہم اُس میں سے نکل آئے ہیں اور اب ہم ایک ایسی سرنگ میں داخل ہو چکے ہیں جس کے دونوں طرف قراقرم کی سیاہ چٹانیں آسمان تک ہیں اور اُن کے درمیان جھگڑتا ہو پُر زور "منہ زور پُر شور اِنڈس ہے جس کی گہرائی پاتال تک ہے اور ہم چٹان سے چمٹے چلے جا رہے ہیں اور بلند پہاڑوں نے شام کر رکھی ہے اور اگر سانس لیں گے تو پُر پیچ سڑک کے رستے پر ڈولتی ویگن کا توازن قائم نہیں رہے گا — اور نیچے انڈس ہے — نیچے انڈس ہے — لیکن کہاں ہے؟ کبھی وہ نظر آ جاتا ہے ایک سفید ربن کی صورت جسے قراقرم کی سیاہی جذب نہیں کر سکی نیچے اور کبھی وہ اوجھل ہو جاتا ہے لیکن آپ کو معلوم ہے کہ وہ سانس لے رہا ہے، اُس کی پھنکار بدستور ہے، وہ منتظر ہے۔ ویگن گھومتی جا رہی ہے۔ دائیں ہاتھ پر عمودی چٹان ہے جس میں سے کھودی ہوئی شاہراہِ ریشم پر ہم ہیں اور بائیں ہاتھ پر اس کا کنارا ہے جس کے عین نیچے

شائد ایک کلومیٹر نیچے یا دو کلومیٹر نیچے کہیں نیچے گہرائی میں انڈس کے پُرشور پانی ہیں اور ویگن کا پہیہ اُس کنارے پر ہے اور چل رہا ہے اور اُس کے نیچے آتے کنکر اور چھوٹے چھوٹے پتھر اچھل اُچھل کر نیچے جا رہے ہیں اور پتہ نہیں کہاں جا رہے ہیں۔

پہلے پہل تمام مسافروں پر ایک پُرخطر مسرت کا جذبہ غالب آیا کمال ہے اتنی خطرناک سڑک ——— واقعی سفر تو اب شروع ہوا ہے ——— بھئی ذرا جھانک کر تو دیکھو، اِدھر جدھر نیچے انڈس ہے ——— پتہ نہیں کہاں ہے ——— چھوٹا سا لگ رہا ہے ——— فاصلہ بہت ہے ناں جیسے ہوائی جہاز سے نظر آتا ہے ——— لُطف آ گیا ——— یہاں سے نیچے دیکھو تو سڑک نظر نہیں آتی ہم عین کنارے پر جا رہے ہیں۔ شکر ہے ویگن اب اکبر خان کے تجربہ کار ہاتھوں میں ہے ——— اکبر خان پکی بات ہے ناں کہ تم پہلے بھی اِدھر آتے رہتے ہو، کبھی کوئی حادثہ تو نہیں ہوا ——— ظاہر ہے نہیں ہوا ہو گا ورنہ تم ——— ہا ہا ہا ——— اکبر خان صرف مسکراتا ہے کسی کی جانب دیکھتا نہیں ہے۔

——— میں بھی قدرے بخار آلود حالت میں چند تصویریں بناتا ہوں اگرچہ کیمرے میں نیچے دیکھنے سے مزید ہول اُٹھتے ہیں۔ سلجوق کو جو کہ کھڑکی کے ساتھ بیٹھا ہے اُٹھا کر خود وہاں بیٹھ جاتا ہوں تاکہ وہ خطرے سے ذرا سا دُور ہو جائے۔ زبردستی مسکرا مسکرا کر اسے بتاتا ہوں کہ دیکھو یہاں سے انڈس تو ایسے لگ رہا ہے جیسے طوفانی سمندر ہو۔ غصّے میں سر پٹختا ہوا اور ہیبت ناک اور وہ کہتا ہے "ابو اس میں وہیل مچھلیاں تو نہیں ہو سکتیں لیکن پھر بھی اس کی سطح اس طرح اُبل رہی ہے جیسے اس کے اندر درجنوں وہیل مچھلیاں کروٹیں لے رہی ہوں۔ میں اُسے بتاتا ہوں کہ یہاں زیرِ سطح چٹانوں کا ایک سلسلہ

ہے، گہری وادیاں ہیں جن کو بھرتے ہوئے یہ دریا اُن سے ٹکراتا ہے اور یوں سطح اُبلتی دکھائی دیتی ہے ——

تھوڑی دیر بعد تمام مسافر ایڈونچر کے تمام جذبوں سے خالی ہو جاتے ہیں اور اُن میں قراقرم کا سیاہ خوف بھر جاتا ہے۔

ویگن یکدم بلند ہوتی ہے اور ایک موڑ کاٹتی ہے۔

"یہاں سے پچھلے ماہ کوہستان والوں کی بس گئی تھی" اکبر خان کہتا ہے۔

"کہاں گئی تھی؟" راجہ گھگھیا کر پوچھتا ہے۔

"اُدھر نیچے"

"پھر؟"

"پھر پتہ نہیں —— پچاسی مسافر تھے"

"نکالی نہیں؟"

"اِدھر اس کی گہرائی کا کچھ پتہ نہیں نکالنا کیا تھا —— اور نکالنے کیلئے کچھ بچتا بھی نہیں ہے ——"

"کیوں کیوں"

"بس کا ڈھانچہ چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر گیند بن جاتا ہے۔ صاحب اور پھر نیچے چلا جاتا ہے۔ کیا نکالنا ہے"

"سارے ڈوب گئے؟" راجہ یقین نہیں کرنا چاہتا۔

فیودور دبے حد پُرسکون اور بظاہر نارمل ہے" فکر کرنے کی کوئی بات نہیں ہم اندُس میں ڈوب کر نہیں مر سکتے"

"اچھا اچھا"

"کیوں بھئی فیودور وہ کیسے؟ وہ کیسے؟" "بھئی فیودور و بتاتا ہے "اس لئے کہ اتنی بلندی سے اگر ویگن نیچے گر جائے تو صرف بلڈ پریشر کے ہائی ہونے سے انڈس کی سطح پر کریش ہونے سے بہت پہلے ہی آدمی مر مرا جاتا ہے۔"

میں نے سلجوق کا ہاتھ تھام رکھا ہے۔ جو پسینے کی وجہ سے پھسل پھسل جاتا ہے۔

یکدم ویگن رک گئی۔ ہم سب اتنی تیزی سے باہر آئے جیسے وہ کھسک کر دریا میں گرنے کو ہے "ابو اب تو میرا ہاتھ چھوڑ دیں"

زمین پر قدم رکھا تو زندگی لوٹ آئی۔

قراقرم کی سیاہی میں شام کی آمیزش ہو رہی تھی۔ انڈس بھی دو ٹکڑوں میں بٹا ہوا تھا، ایک سورج کی زد میں آیا ہوا چمکتا ہوا اور دوسرا چٹانوں کے سائے میں سیاہ ہوتا ہوا۔۔۔۔ اور یہاں بالکل بے آواز تھا۔ چپ چاپ بہہ رہا تھا۔ جیسے وہ اپنے شور اور گڑگڑاہٹ سے صرف ہمیں خوفزدہ کرنا چاہتا تھا، اپنی ہیبت کی دھاک بٹھانا چاہتا تھا اور اس مقصد کے پورا ہونے کے بعد وہ اطمینان سے آرام کر رہا تھا۔ جو شور ہم سن رہے تھے وہ ہمارے کانوں میں ماضی کی گونج تھی اور وہ پہاڑی ندی تھی جو چٹانوں میں سے ایک آبشار کی صورت نیچے گر رہی تھی۔۔۔ شام اتنی قریب نہ تھی جتنی لگ رہی تھی، قراقرم ترکی زبان کا لفظ ہے۔ قرا کا مطلب سیاہ اور قرم بھر بھری چٹانوں کو کہا جاتا ہے اور یہ قراقرم کی سیاہی تھی جو شب کی سیاہی کا سماں قریب لا رہی تھی۔ سڑک سے اتر کر ہم ندی کے کنارے تک پہنچے، اس کے یخ پانیوں سے اپنے حواس بحال کئے۔ سلجوق نے پلاسٹک کی بوتل کو لبریز کیا اور واپس سڑک پر آگئے جہاں ویگن کھڑی تھی۔ اکبر خان ہارن بجا رہا تھا اور مسافر

اس کے اندر بیٹھنے سے ہچکچا رہے تھے۔ جیسے وہ اُس میں بند ہو کر حرکت کرنے کے بجائے گلگت تک پیدل سفر کرنے کو ترجیح دیتے ہوں ـــــ

سفر پھر شروع ہو گیا ـــــ وہی دو طرفہ بلند چٹانوں میں انڈس اور اس کی سطح سے کئی کلو میٹر اُوپر سرکتی ہوئی ویگن ـــــ اور انڈس ـــــ کبھی کبھار وہ اوجھل ہوتا تو بے چینی سی ہوتی کہ کہاں چلا گیا۔ جیسے دشمن گھات میں ہو تو زیادہ پریشان کرتا ہے۔

"اکبر ـــــ انڈس کب تک ہمارے ساتھ چلے گا؟"

"جنگلوٹ تک۔"

"اور جنگلوٹ کہاں ہے؟"

"گلگت سے تینالیس کلو میٹر اِدھر۔"

اکبر سگرٹ نہیں پی رہا تھا۔ اِدھر اُدھر نہیں دیکھ رہا تھا کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ صرف ونڈ شیلڈ کے پار نظریں جمائے بیٹھا تھا اور اُس کے ہاتھ پاؤں ایک مکانکی تواتر کے ساتھ حرکت کر رہے تھے۔

اور ویرانی سی ویرانی تھی ـــــ نہ کوئی گاؤں نہ آبادی، صرف سڑک چٹانیں اور انڈس، جیسے زمین نہ ہو کوئی بے آباد سیارہ ہو۔ اردگرد کے پہاڑوں کو دیکھ کر آنکھیں تھکنے لگتی تھیں۔ اُن پر کوئی پگڈنڈی بھی نہ تھی۔ کیونکہ اُس پر کون چلتا اور کہاں جاتا ـــــ

پٹن کا قصبہ نظر آیا تو دریا کا پاٹ چوڑا ہو گیا اور ہم بھی نیچے اُتر کر اس کے قریب آ گئے، قربت میں خطرہ نہ تھا صرف دوری میں خدشہ تھا۔ ویگن رُکی تو دو مسافر اندر آ گئے اور پچھلی نشستوں پر چپکے سے بیٹھ گئے۔ انہوں نے چادروں سے اپنے چہرے ڈھانپ رکھے تھے۔ صرف آنکھوں

کی وحشت ننگی تھی۔ پتن سے نکلے تو پھر وہی منظر ہوا، قراقرم کی طویل سرنگ انڈس اور ہم۔

"بچہ سیب لو"، ایک مسافر کا ہاتھ سلجوق کی طرف بڑھا۔

سلجوق نے میری طرف دیکھا اور سیب لے لیا۔

"آپ بھی لو" اس نے ایک سیب مجھے بھی تھما دیا اور پھر اپنے چہرے سے چادر ہٹا دی۔ یہ ایک بے جان اور خوف کی آماجگاہ چہرہ تھا جس پر کئی روز کی سیاہ داڑھی سرکنڈوں کی طرح اُگی ہوئی تھی۔

"صاحب آپ سیر کو آئے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں"

"پہاڑ دیکھنے کے لئے؟"

"ہاں"

"پہاڑ دیکھنے تھے تو اُدھر سوات کو جاتے اِدھر کیا ہے ---- اِدھر پہاڑ تو نہیں ہے صاحب اِدھر تو خوف ہے" اور ہم پر جھکے ہوئے قراقرم حقیقتاً پہاڑ نہیں تھے، سیاہ خوف کا ایک سلسلہ تھا۔ بے آب و گیاہ نہ پھول نہ پتہ نہ درخت نہ سبزہ، بلندی اور چٹیل ویرانی اور شام کی سیاہی مزید ہیبت ناک اور نامعلوم خدشوں کے حمل سے ہم پر بوجھ ہوتی ہوئی ---- بائیں جانب عمودی بلندی اور دائیں طرف عمودی گہرائی ---- جب کبھی دائیں طرف کوئی چٹان یا زمین کا ٹکڑا نظر آتا تو اطمینان سا ہوتا کہ کم از کم اس ٹکڑے پر سے گذرتے ہوئے ہم نیچے تو نہیں جائیں گے۔

"آپ کدھر جا رہے ہیں؟"

"یہ سامنے جو داسو کا پہاڑ نظر آ رہا ہے ناں؟"

"یہ بھی بالکل سیاہ ہے۔"

"یہاں سے دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس پر دیودار کا ایک بہت بڑا گھنا جنگل ہے، ہم اسے خریدنے کے لئے جا رہے ہیں۔ داشو میں اتر کر ساری رات پیدل چلیں گے اور کل صبح اوپر پہنچیں گے ——" پہاڑی سلسلے کی چوٹی پر ایک سیاہ دھبہ تھا۔ جو دیودار کا جنگل تھا۔

"آپ پٹھان ہیں؟"

"نہیں میں کوہستانی ہوں —— لیکن اِدھر کوہستان میں نہیں رہتا۔ صاحب یہ علاقہ انسانوں کے رہنے والا نہیں ہے۔ نرا خوف ہی خوف۔ بھوک بیماری اور جہالت —— نہ خوراک نہ کھیت —— بس بھربھری مٹی کے پہاڑ ہیں جن میں صدیوں سے لوگ رہتے چلے آئے ہیں۔ انہیں باہر کی دنیا کا کچھ پتہ نہیں۔ غیر قوموں کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس لئے کچھ سیکھ نہیں سکے —— ذاتی دشمنیاں اس حد تک ہیں کہ ہم لوگ رات کو ایک جگہ پر نہیں سوتے دو تین ایک آتے ہیں اور جگہ بدل لیتے ہیں تاکہ سوتے میں کوئی دشمن وار نہ کر جائے۔ اپنے چہرے چھپا کر رکھتے ہیں تاکہ کوئی پہچان نہ لے —— میں ایک عرصے سے باہر رہتا ہوں لیکن جب کبھی کاروبار کے سلسلے میں اِدھر آتا ہوں تو چہرہ چھپا کر آتا ہوں کون جانے میرے دادا پردادا کی کس کے ساتھ دشمنی تھی اور اُس کی اولاد میں سے کوئی مجھے پہچان کر ختم کر دے —— جانور بن گئے ہیں صاحب —— اس لئے تو لوگ کہتے ہیں کہ کوہستانیوں میں پٹھانوں کی ساری برائیاں تو ہیں لیکن اُن کی خوبی ایک بھی نہیں۔"

داشو آیا تو وہ دونوں اُتر گئے لیکن اس سے پیشتر انہوں نے اپنے چہرے چادروں سے اچھی طرح چھپا لئے تھے۔

داسُو سے آگے سڑک پر جابجا بڑے بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے جو ہمارے پہلو میں بلند ہوتے ہوئے سلسلۂ کوہ سے ٹوٹ کر نیچے آگرے تھے ـــــ اور یہاں پتھر گرتے رہتے ہیں۔ اکثر اوقات خالی سڑک پر اور کبھی کبھار اُس پر سفر کرتے ہوئے کسی مسافر یا خچر پر ـــــ کہا جاتا ہے کہ شاہراہِ ریشم کی تعمیر کے دوران جب ان پہاڑوں کو بار بار ڈائنامائٹ کے ذریعے اُڑایا اور توڑا گیا تو پورے سلسلۂ کوہ میں شگاف اور دراڑیں پڑ گئیں چنانچہ اب وقتاً فوقتاً وہ دراڑیں پھیلتی ہیں یا کسی ہلکی سی لرزش کی بنا پر کھسکتی ہیں اور چٹانوں اور پتھروں کی صورت میں سڑک پر گر جاتی ہیں۔ شاہراہ پر لینڈ سلائڈز کی ایک وجہ یہ بھی ہے ـــــ ہماری ویگن بار بار رُکتی اور ہم باہر نکل کر راستے میں حائل پتھروں کو اُٹھا اُٹھا کر راستہ صاف کرتے ـــــ اور اس دوران ہمہ وقت اوپر دیکھتے رہتے کہ ـــــ ہمارے سر پر معلق کوئی چٹان اِسی لمحے نیچے آنے کا فیصلہ نہ کر لے ـــــ

ایک سوکھے اور خشک پہاڑ کے دامن میں چند جھونپڑوں پر مشتمل ایک آبادی کے باہر ایک فوجی جوان نے ہاتھ دیا۔ ویگن ایک دھچکے کے ساتھ رُکی تو اُس نے بتایا کہ چند کلومیٹر کے فاصلے پر ایک ناقابلِ عبور لینڈ سلائڈ سڑک پر گری ہے اس لئے صرف یک طرفہ ٹریفک چل رہی ہے۔ وائرلیس سے اطلاع ملی ہے کہ اُدھر سے ایک ٹرک آرہا ہے اس لیے آپ تھوڑی دیر کے لئے رُک جائیں۔

ہم ویگن سے باہر آگئے۔ دو تین تنور تھے جن کے باہر بان کی بڑی بڑی چارپائیوں پر اپنے منہ سر لپیٹے چند کوہستانی بیٹھے تھے۔ انہوں نے ہمیں دیکھ کر کسی حیرت، مسرت، اچنبھے یا دلچسپی کا اظہار نہ کیا، بس بیٹھے رہے۔ اُن

کے لیئے ہمارا کوئی وجود نہ تھا، چند لوگ جو باہر کی دنیا سے آتے تھے اور کچھ لمحوں کے بعد باہر چلے جائیں گے ---- ایک بنجر اور تہذیب کے دھارے سے کٹے ہوئے پہاڑی سلسلے میں صدیوں سے مقیم یہ لوگ آسانی سے دوست نہیں بنتے، اُن کے مزاج میں صرف شک اور خوف ہے۔ ڈاکٹر لٹنر نے ان لوگوں کو درد اور اس علاقے کو "دردستان" کا نام دیا تھا۔ اُس کے خیال میں کوہستان کا سب سے بڑا قصبہ چلاس دراصل کیلاش ہے۔ جسے ہندو دیوی دیوتاؤں کی جنم بھومی کہا جاتا تھا۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے پہلے پرنسپل پنجاب یونیورسٹی کے بانی اور تقریباً خبطی محقق ڈاکٹر لیٹنر وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے اس علاقے کی زبان اور رہن سہن کے بارے میں ضخیم کتابیں لکھیں۔ گلگت میں قیام کر کے انہوں نے اِن پہاڑوں میں ڈھول بجا بجا کر منادی کروائی کہ اگر آپ لوگ میرے پاس تشریف لائیں تو اچھا کھانے کو ملے گا اور کچھ تحفے تحائف بھی پیش کیئے جائیں گے۔ چنانچہ چند کوہستانی تجسس کی خاطر نیچے اُتر کر اُن کے قریب آ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ڈاکٹر لٹنر کی تمام تر ریسرچ ان چند کوہستانیوں کی فراہم کردہ معلومات پر مبنی تھی۔ بہرحال اُن کے خیال میں یہ جگہ سنسکرت جغرافیے کا وہ علاقہ ہے جسے دراداس کہا جاتا تھا اور سترالو یونانی نے اِسے دردائے کے نام سے پکارا تھا اسی لئے ڈاکٹر لٹنر نے اسے "دردستان" کہا جو بعد میں گلگت اور ہنزہ تک کے علاقوں کے لیئے استعمال ہونے لگا۔ اُس زمانے میں اِن پہاڑوں میں چھوٹی چھوٹی بے شمار ریاستیں تھیں جن کے راجہ کا انتخاب ووٹ کے ذریعے مقامی باشندے کرتے تھے ---- یعنی قدیم زمانوں میں بھی یہاں جمہوریت رائج تھی اور اسی لئے ان ریاستوں کو دردستانی ری پبلکس کہا جاتا تھا۔

میں نے ایک دردیعنی کوہستانی کے قریب جا کر اس سے بات چیت کی کوشش کی ــــــ لیکن وہ ایک شرمیلی خاتون کی طرح منہ موڑ کر دوڑ گیا اور ظاہر ہے دردستان میں آپ کو کوئی دردی یعنی کوہستانی خاتون کہیں نظر نہیں آتی۔

مخالف سمت سے ایک فوجی ٹرک نمودار ہوا اور فوجی جوان نے ہمیں سفر جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔ اس کوہستانی بستی سے چند کلو میٹر کے فاصلے پر وہ لینڈ سلائڈ تھی جس کی وجہ سے ہمیں رُکنا پڑا تھا اور اب بھی رُکنا پڑا۔ تمام مسافر ویگن سے اُتر گئے اور کیچڑ اور پتھروں کے اس ملغوبے کا بغور مطالعہ کیا جو ہماری زندگی کی پہلی لینڈ سلائڈ تھی۔ اکبر خاں نے دو تین مرتبہ ایکسیلریٹر کو پوری قوت سے دبا کر اس پتھریلی دلدل میں سے نکلنے کی کوشش کی لیکن ہر مرتبہ ویگن کے نچلے حصے میں کوئی پتھر دھڑام سے جا لگتا اور وہ ہچکی لے کر ساکت ہو جاتی۔

"مشکل ہے" اکبر خاں بولا۔

"کیوں مشکل ہے؟" نواب صاحب بولے اور آستینیں اُٹھا پائنچے چڑھا دلدل میں جا گھسے اور بڑے بڑے پتھروں کے ساتھ زور آزمائی کرنے لگے۔ جب انہوں نے پہلا پتھر راستے سے ہٹایا تو بقیہ مسافروں نے بھی کمر ہمت باندھی اور اس کارِ خیر میں شریک ہو گئے۔ البتہ انڈس کے کنارے ایک چٹان پر براجمان دو کوہستانی ہم سے پردہ کئے چپ چاپ لاتعلق ہو کر بیٹھے رہے۔

ہم نے لینڈ سلائڈ عبور کی تو سورج قراقرم کی بلندیوں میں دفن ہو چکا تھا اور اب صرف اس کی یاد اس کی چھوڑی ہوئی ہلکی سی روشنی فضا میں دھیرے دھیرے تحلیل ہو رہی تھی۔ ویگن جیسے نیم تاریکی میں ٹامک ٹوئیاں

مارتی ہوئی چلے جا رہی تھی۔ مسافروں کو بھی جیسے قرار سا آگیا تھا کہ یہ سیاہ پُر ہیبت بلندیاں اور گہرائی میں اُن کا منتظر انڈس اب اُن کا مقدر ہے۔ انسان کتنی دیر تک مسلسل خوفزدہ رہ سکتا ہے بالآخر سُن ہو جاتا ہے بے پرواہ ہو جاتا ہے اور سُنا ہے کہ پھانسی کے تختے پر بھی نیند آجاتی ہے۔ لیشام کے بعد پہلی مرتبہ یہ سکوتِ مرگ ٹوٹا کچھ کھسر پھُسر ہوئی کہ بھئی صبح سے کچھ کھایا نہیں بھوک لگی ہے۔ اس پر اکبر خان نے تسلی دی کہ بس چلاس پہنچ جائیں سب کچھ مل جائے گا۔ کسی نے پوچھا، کوئی مشروب وغیرہ؟ ہاں ہاں مل جائے گا —— کیا گوشت یا پراٹھے وغیرہ —— ہاں ہاں چلاس میں —— اب ہم چلاس کے چاؤ میں تھے جہاں دنیا جہان کی نعمتیں ہماری منتظر تھیں۔

باہر تاریکی مکمل ہو چکی تھی اور ہم تاریکی کی اس سُرنگ میں رینگتے چلے جا رہے تھے۔ اگرچہ اب بھی ہم انڈس سے کئی کلومیٹر بلندی پر قراقرم کی چٹانوں میں کھدی ہوئی شاہراہ پر کچھوے کی طرح رینگتے لیکن نیم مردہ سانپ کی طرح بل کھاتے چلے جا رہے تھے لیکن ایک فرق کے ساتھ کہ اب ہمیں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا سوائے ویگن میں بیٹھے ہوئے چہروں کے اور باہر تاریکی تھی اور تاریکی گناہوں کے ساتھ ساتھ خوفزدہ کرنے والے مناظر کو بھی چھپا لیتی ہے اور ہم خوفزدہ ہو ہو کر تھک چکے تھے، لاپرواہ ہو چکے تھے اور پھر باہر کچھ بھی نہ تھا صرف تاریکی تھی۔ کبھی کبھار ونڈ شیلڈ سے پرے کہیں بہت دور خلا میں معلق ایک مدھم اور ہلکی سی روشنی دکھائی دیتی جیسے ایک وسیع ویرانے میں اندھیری شب میں تنہا جگنو کی لو .... اور یہ روشنی کسی ٹرک یا جیپ کی ہوتی جو اس شاہراہِ ریشم پر ہم سے تیس چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر کسی پہاڑی سلسلے میں معلق ہماری طرح سفر پر گامزن تھا —— سیاہ

پہاڑوں کے درمیان میں اٹکا ہوا تنہا جگنو۔

راجہ صاحب نے بشام سے چلنے کے بعد پہلی مرتبہ گنگنانا شروع کردیا اور پھر اپنے بیگ میں سے ایک کیسٹ نکال کر ویگن کے سٹیریو میں فٹ کردی۔ موسیقی نے ہمیں آس پاس کے خطرات سے مزید بے پرواہ کردیا ــــ تب پہلی مرتبہ بجلی چمکی اور تاریکی میں پوشیدہ سیاہ قراقرم ایک بھیانک خواب کی طرح پھر سامنے آیا اور ہماری آنکھوں پر ایک تصویر کی طرح ثبت ہوگیا۔ بادل نہیں تھے۔ بجلی صرف چمکتی تھی۔ کڑکتی نہیں تھی، بغیر کسی شور کے بے آواز۔ اور اُس کی روشنی قراقرم کی وسعتوں اور اندھس کی گہرائیوں کے لئے ناکافی سی رہتی کیونکہ وہ چمکتی اور یکدم بجھ جاتی۔ ہم صرف اپنے تخیل کے زور سے پوری وادی اور پہاڑوں کے ہیولے دیکھ لیتے ورنہ وہ تو چمکتی اور وسعتوں میں تحلیل ہو جاتی ــــ ایک موڑ کاٹنے کے بعد ہم نے دیکھا اور ہماری آنکھیں چندھیا گئیں، سڑک پر روشنیاں ہی روشنیاں تھیں اور ایک گہری گونج لئے شور تھا اور انسانوں کی آوازیں تھیں۔ اکبر خان نے بریک پر پاؤں رکھ دیا۔

رات کی تاریکی میں چٹانوں کے کہیں اوپر سے جہاں ایک خلا تھا پتھروں اور پانی کا ایک ملا جلا سیلاب رواں تودوں کی صورت میں سڑک پر بہتا چلا جا رہا تھا اور اُس کا شور تھا۔ سڑک کے دونوں طرف چند ٹرک اور جیپیں اپنی ہیڈ لائٹس جلائے جیسے اُسے دیکھ رہے تھے اور اُن کے ڈرائیور نزدیکی چٹانوں پر بیٹھے ہوئے گڑگڑاتے سیلاب کی طرف مبہوت ہو کر دیکھ رہے تھے۔ سڑک پر سے گذرنے کے بعد پتھروں کا یہ سیلاب نیچے کھائی میں گر رہا تھا لیکن ہم صرف اندازہ کرسکتے تھے کہ وہ کہیں گر رہا ہے

کیونکہ ہمارے سامنے صرف وہی حصّہ واضح تھا جو چمکتی ہیڈ لائٹس کی زد میں تھا۔ آس پاس صرف رات تھی اور پہاڑ تھے۔ پانی میں بہتے ہوئے پتھروں کی ہیئت نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ آبی گولوں کی طرح لڑھکتے ہوئے سڑک پر اُچھلتے اُچھلتے کھائی کی تاریکی میں گرتے جاتے ——— اور یہ پتھریلا سیلاب ناقابلِ عبور تھا ——— دونوں جانب ٹریفک رُکی ہوئی تھی اور ہیڈ لائٹس ایک دوسرے کو گھور رہی تھیں اور درمیان میں پانی کا اژدھا پھنکارتا ہوا اُن کا راستہ روکے ہوئے تھا۔

سڑک کے ساتھ دریا کی جانب ڈھلوان پر کوئی دیو زاد شے آہستہ آہستہ سرک رہی تھی۔ خاصی دیر بعد ہمیں احساس ہوا کہ یہ ایک آئل ٹینکر ہے جو سیلاب کے دھارے میں پھنسا ترچھا ہو کر دھیرے دھیرے انڈس میں گرنے کو ہے۔ اُس کا سٹرک کے کنارے ماتھے پر ہاتھ رکھے۔ انتہائی بے بسی کے عالم میں اُس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

جیسے باپ اپنے ڈوبتے ہوئے بچّے کو دیکھتا ہے اور کنارے پر کھڑا اُس کیلئے کچھ کر نہیں سکتا۔ اکبر خان نے اپنے ایک ساتھی ڈرائیور کے رنج کو محسوس کیا اور اس کے قریب جا کھڑا ہوا " فکر نہ کرو یار اگر سیلاب کا زور ٹوٹ جائے تو تمہارا ٹینکر کہیں نہیں جائے گا۔ یہیں پر کھڑا رہے گا اور صبح فوج والے آ کر اسے کرین سے نکال لیں گے ——— پر یہ سٹرک سے نیچے کیسے جا گرا؟"

"قسمت کی بات ہے بھائی صاحب ———" اس کی نظریں سیلاب سے جھولتے ہوئے ٹینکر پر تھیں "میں گلگت سے آ رہا تھا۔ راستے میں سب خیریت تھی۔ یہاں سٹرک پر سے کوئی چھوٹا موٹا پانی بہہ رہا تھا، میں نے سوچا خیر ہے اور ٹینکر کو روکا نہیں۔ پھر ٹائر کے نیچے کوئی بڑا پتھر آ گیا۔ میں نیچے

مڑ کر اس پتھر کو ہٹا رہا تھا کہ اُوپر سے شور پیدا ہوا۔ رات کی وجہ سے دکھائی تو کچھ دیا نہیں بس شور سنائی دیا اور بس پھر اُس وقت میرے اُوپر پتھر اور پانی اس طرح آیا اس طرح آیا کہ مشکل سے جان بچا کر باہر آیا ــــ اور پھر یہاں میرے سامنے ٹینکر پانی کے زور سے آہستہ آہستہ سڑک پر سے گرا اُدھر کھائی میں جا کر اٹک گیا اور اب وہاں سے بھی کھسک رہا ہے۔"

"اللہ خیر کرے گا" اکبر خان نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور پھر آگے بڑھ کر سڑک پر بہتے پر شور ریلے کا جائزہ لینے لگا۔

ایک تاریک شب۔ شاہراہِ قراقرم پر مہیب چٹانوں میں سے بہتا ہوا پتھروں کا شور۔ دریائے سندھ اگرچہ کہیں گہرائیوں میں گم لیکن اس کی موجودگی کا وسوسہ۔ پہاڑ جھکے ہوئے۔ سڑک پر ایک سیلاب اور جیپوں اور ٹرکوں کی فل ہیڈ لائٹس جو تاریکی میں آسمانی چڑیلوں کی طرح چمک رہی تھیں اور اس شور اور اِس روشنی میں گھومتے ہوئے چند نامانوس چہرے ــــ اور بھوک اور جسم اور اعصاب کی تھکاوٹ ــــ

"رات تو یہیں کاٹنی پڑے گی صاحب" اکبر خان نے اندھیرے میں سے برآمد ہوتے ہوئے مجھے کہا۔ "ویگن تو پار نہیں جا سکتی"

"یار تم کوشش تو کرو" نواب نے مشورہ دیا۔

"کوشش؟ وہ ٹینکر والے نے بھی کوشش کی تھی اُس کا حشر دیکھ رہے ہو۔ بابا بڑے بڑے ٹرک رُکے ہوئے ہیں یہ چھوٹی سی ویگن تو منٹوں میں جائے گی نیچے، ڈرائیور سمیت ــــ بس رات تو یہیں پر بسر ہو گی۔ ویگن میں سو جائیں گے"

"لیکن ہمارے پاس تو کھانے دانے کے لئے بھی کچھ نہیں ــــ پانی تک

نہیں ہے" راجہ پریشان ہو کر بولا۔

"پانی میرے پاس ہے جناب" سلجوق نے فوراً کہا "پوری بوتل ہے"
"یہ ڈرائیور کیا کہتا ہے" فیو دورو جو اب تک سیلاب سے لاتعلق ویگن
میں اپنی بیگم کے ساتھ چہلیں کر رہا تھا باہر آکر مجھ سے پوچھنے لگا۔
"میرا خیال ہے ہمیں رات یہیں گذارنا ہو گی"
میں نے سلجوق کی طرف دیکھا۔ لائٹس اس کی عینک کے شیشوں پر چمک رہی تھیں
اور اُس کے چہرے پر بھوک اور تھکن تھی۔ تجسس کا وہ مادہ جو آج صبح
راولپنڈی سے چلتے وقت اس کے اندر اُبل رہا تھا، اب ٹھنڈا ہو چکا تھا۔
اب وہ صرف ایک بچہ تھا، تھکا ہوا جسے آرام کی ضرورت تھی —— توے پر سے
اُترتی گرم روٹی اور سالن کی اور ایک بستر کی ضرورت تھی۔
راجہ اس ہنگامے سے دُور منہ اُٹھائے اُوپر کی طرف دیکھ رہا تھا "تارڑ
صاحب اِدھر آنا" میں چلا گیا۔

"اِدھر اس ویگن میں سونا خطرناک ہے۔ یہ پہاڑ دیکھ رہے ہیں، بالکل
سڑک کے اُوپر جھکا ہوا ہے۔ اگر سیلاب آسکتا ہے تو یہ بھی آسکتا ہے"
اور اُس کا خدشہ درست تھا۔ سڑک پر بے شمار پتھر بکھرے پڑے
تھے جو اس بات کا پتہ دیتے تھے کہ یہ پہاڑ ڈائنامائٹ کی وجہ سے بھربھرا
اور کھوکھلا ہو چکا ہے اور اس کے حصے رات کے وقت سڑک پر گر سکتے
ہیں اور جیسا کہ ظاہر تھا گرتے رہتے ہیں ... دائیں ہاتھ پر ہمارے سروں
کے اُوپر جھکا ہوا بوسیدہ پہاڑ اور دائیں ہاتھ پر گہرائی میں گونجتا انڈس
رات بسر کرنے کے لئے کتنی خوشگوار اور محفوظ جگہ
"تو پھر کہاں سویا جائے؟"

"اکبر خاں کو کہتے ہیں کہ ویگن واپس موڑ کر چلتا جائے۔ جہاں بھی کوئی نسبتاً محفوظ جگہ ہو گی رات گذار لیں گے۔"

"ہماری ویگن کے پیچھے دو ٹرک آکر کھڑے ہو چکے ہیں اس لئے واپس نہیں جا سکتے۔" سلجوق کہنے لگا۔

"تو پھر پیدل چل پڑتے ہیں۔ میں تو اس پہاڑ کے نیچے نہیں سو سکتا" راجہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"اس تاریکی میں سڑک پر پیدل چلنا دانشمندی نہیں ہے۔"

"اور یہ دانش مندی ہے؟" اُس نے اوپر اشارہ کیا اور عین اس وقت ایک ہلکا سا دھماکہ ہوا۔ "دیکھا تارڑ صاحب ـــــ یہ کہیں پتھر گرا ہے۔"

اتنی دیر میں نواب صاحب جو ویگن رکتے ہی غائب ہو گئے تھے نمودار ہوئے اور کہنے لگے۔ "سیلاب میں کمی ہو رہی ہے۔ ہو سکتا ہے تھوڑی دیر میں پانی اتنا کم ہو جائے کہ ہم ویگن کو اس کے بیچ میں سے گذار لے جائیں ـــــ اگر اکبر خاں اچھا ڈرائیور ہے تو ـــــ ورنہ میں تو ہوں ہی۔"

میں نے سگریٹ سلگایا اور سلجوق کا ہاتھ پکڑے سڑک پر گرے ہوئے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

فیودورد واپس ویگن میں چلا گیا۔ تقریباً نصف گھنٹے کے بعد دوسری جانب سے یعنی گلگت کی طرف سے مسافروں سے لدی پھندی دو بسیں نمودار ہوئیں۔ پانی کو دیکھ کر بریکیں لگیں اور پھر ڈرائیوروں نے باری باری پورے ایکسلریٹر دبا کر انہیں سیلاب زدہ حصے میں اتار دیا۔ بسوں کے اندر بے شمار رنگ برنگی روشنیاں تھیں اور پورے کے پورے خاندان آباد تھے۔ کیسٹ ریکارڈروں کے سپیکر پوری آواز سے کھلے ہوئے تھے ـــــ سیلاب کے زور

سے بسوں کے پہیئے قدرے پھسلے اُن کے ڈھانچے لڑکھڑانے لگے لیکن ڈرائیوروں نے ایکسیلریٹروں کو تب تک دبائے رکھا جب تک کہ وہ اُچھلتی کودتی لڑکھڑاتی سیلاب کو پار نہ کر گئیں اور پھر ہارن بجاتی ہوئیں شاہراہِ ریشم کی تاریکی میں گم ہوگئیں۔

"میری ویگن ان سالی بسوں سے زیادہ طاقتور ہے" اکبر خان کھول اُٹھا اور ہمارے روکنے کے باوجود ویگن میں سوار ہوا اور اسے سٹارٹ کر کے پانی میں اُتار دیا۔ عین درمیان میں جا کر پورے ایکسلریٹر کے باوجود اُس کے پہیئے ایک ہی جگہ گھومتے رہے اور وہ جھولنے لگی اور پھر بہت ہی آہستگی سے پانی اُسے کھائی کی جانب دھکیلنے لگا۔ اپنی ویگن کو یوں گم ہوتے ہم دیکھ نہ سکے اور تمام مسافر خطرے سے بے پرواہ ہو کر پانی میں اُتر گئے اور اُسے دھکیلنے لگے۔ دوسرے ڈرائیور حضرات بھی ہماری مدد کو آ گئے۔ پانی بے حد ٹھنڈا تھا اور ہم سب صرف اس لئے محفوظ تھے کہ ویگن کو سائڈ سے دھکا لگا رہے تھے اور جب کبھی پانی ہمارے قدم اُکھاڑتا ہم ویگن سے بغل گیر ہو جاتے اور پھر کھڑے ہو جاتے۔ کبھی کبھار کوئی چھوٹا موٹا پتھر بھی ٹانگوں سے آ ٹکراتا ہماری مشقتوں کی برکت سے ویگن یکدم ہمارے ہاتھوں سے نکلی اور سیلاب پار کر گئی لیکن مسئلہ ابھی حل نہیں ہوا تھا کیونکہ ویگن تو اُدھر چلی گئی لیکن ہم سب اِدھر ہی کھڑے تھے اور سیلاب کے مرکزی دھارے کو عبور کرنا بے حد خطرناک کام تھا۔ اکبر خان نے ویگن پار لے جاتے وقت اگرچہ سب کو دعوت دی تھی کہ وہ سوار ہو جائیں لیکن اس لمحے ہمارا یہ خیال نہیں تھا کہ پار چلی جائے گی بلکہ یقین تھا کہ نیچے چلی جائے گی اور واقعی اگر ہم بیٹھ جاتے تو ایسا ہی ہوتا کیونکہ دھکا لگانے والے تو اندر ہوتے۔ بہر حال پانی کی کمی

کے باوجود ابھی تک پتھر اُسی طور لڑھکتے چلے آرہے تھے... سب سے پہلے فیودورو نے ہمت کی اور بہتے بہتے بچا۔ پھر اُس نے اپنی بیگم کا ہاتھ پکڑ کر اُسے محفوظ کر لیا۔ اُن کے بعد بقیہ مسافر ہمت کرتے رہے، گرتے رہے، بھیگتے رہے لیکن پار پہنچتے رہے اور سب سے آخر میں میں سلجوق کا ہاتھ پکڑ کر پانی کے اندر گیا اور پھر اُسے کھینچتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ بہاؤ اتنا سرکش اور وحشی تھا کہ میرے قدم باقاعدہ اُڑ رہے تھے اور میں جانے کس طرح انہیں قابو میں رکھے آگے بڑھ رہا تھا۔ میرے جسم کی تمام تر توانائی اس ہاتھ میں تھی جس میں میرے بیٹے کا ہاتھ تھا۔ اور میں اپنے قدموں کے آگے بہتے تیز پانی پر نظریں جمائے اُس شور کو سُن رہا تھا جو ہمارے عین اُوپر سے اُٹھ رہا تھا۔ قدموں میں بہہ رہا تھا اور پھر کھائی کی تاریکی میں گر رہا تھا۔ تمام ہیڈ لائٹس اس حصے پر مرکوز کر دی گئی تھیں جہاں سے ہم گذر رہے تھے۔ مجھے یہ چند میٹر کا فاصلہ کئی کلو میٹر کا محسوس ہوا جو ختم ہی نہیں ہو رہا تھا۔ ایک چھوٹا سا پتھر میرے ٹخنے پر گولی کی طرح آ کر لگا اور میں تکلیف کی شدت سے گرنے کو تھا کہ سلجوق نے مجھے سنبھال لیا۔

دراصل وہ مجھے پار لے کر جا رہا تھا۔ مجھے صرف کسی بڑے پتھر کا خوف تھا جو چشم زدن میں میری ٹانگوں کو مفلوج کر کے مجھے گرا دے گا... پھر میرے پاؤں میرے قابو میں آتے چلے گئے اور دوسری جانب کھڑے ہمارے ساتھیوں نے ہاتھ بڑھا کر ہمیں کھینچ لیا۔

ویگن میں سوار ہو کر سب نے بلند آواز میں "اللہ تیرا شکر ہے" صدقِ دل سے اس طرح کہا کہ فیودورو بھی مسکرا دیا اور کہنے لگا "تھینک یو اللہ"

سفر پھر شروع ہو گیا۔

اور اس کے ساتھ ہی ہلکی ہلکی بارش ونڈ شیلڈ پر پڑنے لگی۔

"اس کو کہتے ہیں مرے کو مارے شاہ مدار" نواب صاحب اپنے کپڑے نچوڑتے ہوئے بولے "بارش میں اس سڑک پر سفر کرنا خودکشی کے مترادف ہے اور رات کے وقت؟ ... اللہ!"

راجہ بیزار ہو کر کہنے لگا "نواب صاحب ہم سب یہ سمجھتے ہیں کہ ہم مر چکے ہیں۔ مزید کیا مریں گے، سفر جاری رہنا چاہیئے"

"کیوں صاحب؟" اکبر خان مجھ سے مخاطب ہوا "ویسے ہم لوگ اِدھر بارش میں گاڑی نہیں چلاتے"

"یہاں پر کھڑے بھی تو نہیں ہو سکتے ــــ کہ ہو سکتے ہیں؟"

"کھڑے تو ہو سکتے ہیں صاحب لیکن اگر بارش زیادہ ہو گئی تو پہاڑ ضرور گرتا ہے ــــ"

"تو پھر چلتے رہو رب کا نام لے کر"

"بس چلاس پہنچ کر رات گذاریں گے ــــ وہاں بہت ہوٹل ہیں۔

فیودوردنے مجھ سے رابطہ قائم کیا "ڈرائیور کیا کہتا ہے؟"

میں نے بتایا کہ چلاس میں رات گذارنے کا ارادہ ہے۔ کہنے لگا۔ اس سے پوچھو کہ وہاں ہوٹل میں ہمیں گرم چکن سوپ، روسٹ لیمپ، گرم بستر اور گرم پانی ملے گا۔ میں نے کہا بالکل ملے گا ــــ اور ہماری ویگن رات کی سیاہی میں بارش سے بھیگتی شاہراہ قراقرم پر آہستہ آہستہ چلتی کبھی کبھار پھسلتی سفر کرتی رہی۔ ہم اب اتنے نڈر ہو چکے تھے کہ اونگھنے لگے حالانکہ وہی بلندیاں تھیں۔ وہی گہرائیاں تھیں۔ لیکن اب تھکاوٹ اور رات کا پردہ تھا اور روپوشی تھی .... ہمیں صرف چلاس کا انتظار تھا۔

رات گیارہ بجے کے قریب برستی بارش کی اوٹ میں سے چند مکان دکھائی دیئے ــــ نہ بندہ نہ پرندہ، نہ کوئی بازار، نہ ہوٹل، دو تین بوسیدہ سی دکانیں تھیں جو بند ہو چکی تھیں۔ اکبر خان ویگن سے اُترا اور ایک دکان کے برآمدے میں لیٹے ہوئے ایک کوہستانی کو بیدار کر کے اس سے کچھ دریافت کیا اور پھر واپس سٹیئرنگ پر آ بیٹھا "صاحب ادھر تو کچھ نہیں ملے گا ــــ بازار بند ہو چکا ہے۔ کوہستانی کہتا ہے کہ یہاں سے تھوڑی دور ایک بڑا ہوٹل ہے۔ وہاں سے شائد کچھ کھانے پینے کو مل جائے ــــ ویسے میں تو کہتا ہوں اللہ کا نام لے کر گلگت ہی چلے چلتے ہیں"

اس بیان پر تمام مسافروں نے یک زبان ہو کر احتجاج کیا کہ بندہ خدا رات کے وقت اس بارش میں اور اتنی خطرناک سڑک پر ــــ اور بھوکے پیٹ ہم گلگت ہرگز نہیں جائیں گے ــــ رات ہوٹل میں بسر کریں گے، پیٹ پوجا کریں گے اور صبح سویرے جانبِ گلگت ــــ

"ہوٹل شینگری لا" چلاس کی بے آباد نم رات میں، ایک برباد لینڈ سکیپ میں ایک معجزے کی طرح رُونما ہوا۔ اس کی جدید عمارت اس کے اندر کے آرام اور آسائش کا پتہ دیتی تھی اور ہم ذہنی طور پر اُس کے نرم بستروں میں گُھس کر من پسند خوراکوں کے آرڈر دینے لگے۔ ویگن پورچ میں رُکی تو ایک مہذب بننے کی کوشش کرتے ہوئے مینجر صاحب باہر تشریف لے آئے۔ ایک کمرے کا کرایہ ساڑھے تین سو روپے اور ڈنر کے لئے اسی روپے فی کس فلش سسٹم اور گرم پانی کا معقول انتظام ــــ صرف پانچ چھ گھنٹوں کی راحت کے لئے یہ چارجز میرے لئے خاصے غیر معقول تھے اور میں سوچ میں پڑ گیا۔ لیکن بقیہ مسافروں کے لئے یہ بالکل نامعقول تھے اور وہ مینجر کو کچا کھا جانے کے موڈ میں تھے ــــ

گلگت ایک قید خانہ ہے جس کی دیواریں چٹانیں ہیں، ایک اُداس اور تنہا بستی ہے۔ یہاں ہاورڈ کی قبر تھی جسے انگریزوں کے بقول یاسین ریاست میں سورج کی جانب منہ کر کے قتل کر دیا تھا اور پھر وہ انگریز شاعروں کا محبوب موضوع بنا۔ ڈاکٹر لِٹنر اپنے ایک ساتھی کی لاش کو تابوت میں بند کر کے یہاں سے لے گیا۔

لیکن شائد گلگت کی تنہائی اِس کی دور افتادگی اور اُداسی میں ہی اس کی کشش پنہاں ہے۔

ایک ایسی تہذیب جو کسی حد تک جدیدیت کے رنگ سے بچی ہوئی ہے۔

ایک ایسا گوشہ جس کے چاروں طرف کھڑے پہاڑوں نے پوری دنیا کا شور وغل روک رکھا ہے۔

اس کی ہوائیں ازل سے وہی ہیں جو خالق نے زندگی کا سانس دیتے وقت کائنات کو عطا کی تھیں، اِن میں انسانی اور صنعتی آلودگی نہیں ہے۔

یہ ایک ایسا قفس ہے جس کے گوشے میں آرام بہت ہے۔ یہاں صرف دریائے گلگت کی ہلکی آواز ہے یا باغوں میں چلنے والی ہواؤں کی سرسراہٹ ہے۔ اُداسی وہ ہے جو انسان روزِ ازل سے اپنے اندر لئے پھرتا ہے اور یہاں آکر وہ ظاہر ہو جاتی ہے۔

گلگت بازار پہنچ کر احساس ہوا کہ یہاں کی آبادی ایک طرح کی ''پاٹ پوری'' ہے، کاک ٹیل ہے — پٹھان، چینی، کرغیز، کوہستانی، بلتی، لداخی، تبتی اور جانے کون کونسی نسل کے خون کی آمیزش، کئی دکاندار تو اتنے چینی ہیں کہ اُن سے اُردو میں بات کرتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی ہے۔

رینگتے چلے جا رہے ہیں۔ آسمان پر چاند بھی نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو شاید بادلوں میں سے کہیں نہ کہیں تو جھانکتا۔ بس سیاہ دیواریں ہیں۔ جو شاید پہاڑ ہیں اور وہ ازلی دشمن انڈس ہے جو گھات لگائے تاک میں ہے، ہمارے گرنے کا انتظار کر رہا ہے۔ پہلے ہم ویگن کے جھٹکوں کے بعد اپنے آپ کو سنبھال لیتے تھے لیکن چلاس سے نکلنے کے بعد ناتوانی کا یہ عالم تھا کہ جو جہاں پر کھسک کر گیا وہیں پڑا رہا اور ہلتا رہا۔

"ابّو" یکدم سلجوق نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "ابو میرے بازو پر کسی چیز نے کاٹ لیا ہے"

میں نے اُس کا بازو اُٹھا کر روشنی کے سامنے کیا ایک ہلکا سا سُرخ نشان تھا، شاید کسی مچھر نے کاٹ لیا تھا اور چلاس جہاں گرمی ایک سو بیس درجے فارن ہائٹ تک پہنچتی ہے اور جہاں کا حبس جان لیوا ہوتا ہے اپنے موٹے اور زہریلے مچھروں کے حوالے سے بھی جانا جاتا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد سلجوق کے چہرے پر شدید اذیت کے آثار نمودار ہونے لگے "ابو بہت زیادہ درد ہو رہا ہے —— آپ اپنا رومال اس پر باندھ دیں" میں نے فوراً رومال کس کر باندھ تو دیا۔ لیکن میرا دل دھڑکتا رہا —— پتہ نہیں اِسے کس شے نے کاٹا ہے۔ درد کم نہ ہوا تو کیا ہوگا؟ ہم دردستان میں ہیں یہاں درد کی دوا کس کے پاس ہوگی۔ لاہور واپسی پر جب میں ایک جرمن سیّاح کا پُرانا سفرنامہ "گلگت" پڑھ رہا تھا تو اُس میں مندرجہ ذیل فقرہ بھی آیا "چلاس میں ایک انتہائی زہریلی مکھی پائی جاتی ہے جو اگر کاٹ لے تو انسان درد کی اذیت کو برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر زیادہ مکھیاں کاٹ لیں تو جان ضائع ہونے کا خطرہ بھی ہوتا ہے" بہرحال اس وقت چلاس

کی اس زہریلی خصوصیت کا مجھے علم نہ تھا۔

اندھیرے میں رینگتی ہوئی ویگن ایک مرتبہ پھر رک گئی۔

سامنے پتھروں اور کیچڑ کی ایک ایسی دلدل تھی جو پہاڑ سے اُتر کر سڑک کے عین کنارے تک چلی گئی تھی۔

"اگر سب لوگ آرام اور سکون سے بیٹھے رہیں تو کنارے کے قریب اتنی جگہ تو ہے کہ ہم آسانی سے گذر جائیں۔"

میں نے ونڈ شیلڈ میں سے نظر آتی اُس چھوٹی سی جگہ کو دیکھا جو لینڈ سلائڈ سے محفوظ تھی اور جس پر سے بقول اکبر خان ہم آسانی سے گذر سکتے تھے۔ کنارے کے عین نیچے کہیں دُور اتھاہ گہرائیوں میں انڈس تھا جو ہمیں اپنی موجودگی کی خبر تاریکی کے باوجود اپنے ہیبت ناک شور سے دے رہا تھا کہ میں یہاں ہوں اور اُوپر دو کلومیٹر اوپر چٹان کے کنارے پر تم ہو اور دیکھ لینا رات بھی ہے۔

"میرا خیال ہے کہ میں پیدل چلنا پسند کروں گا۔" میں نے سلجوق کا ہاتھ تھاما اور نیچے اُتر آیا۔ ہم بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوئے اور بقیہ مسافر بھی قدرے کھسیانے سے ہو کر نیچے اُتر گئے۔

اکبر خان نے ویگن کو بیک کیا اور پھر اس چار پانچ فٹ کے نسبتاً صاف حصے پر لے آیا جو سڑک کے کنارے پر واقع تھا۔ اُس نے ایکسیلیریٹر دبایا، ویگن چند قدم آگے گئی اور پھر دلدل میں پھنس کر کانپنے لگی۔ "آپ لوگ اندر آ کر بیٹھو اس طرح خالی ویگن ڈولتی ہے پار نہیں جائے گی۔" چنانچہ مجبوراً پھر اپنی اپنی نشستوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ میں نے سلجوق کو دروازے کے قریب بٹھا کر ہدایت کی کہ وہ ہینڈل پر ہاتھ جمائے رکھے اور جونہی ویگن زیادہ

لڑکھڑائے یا میں شور مچا دوں تو وہ فوراً دروازہ کھول کر باہر کود جائے۔ اس کا دوسرا ہاتھ میں نے دبوچ رکھا تھا۔ اکبر خان نے ویگن دوبارہ سٹارٹ کی۔ اُس کا پاؤں ایکسیلریٹر پر تھا اور وہ بڑی احتیاط سے اُسے آگے بڑھا رہا تھا لیکن پھر بھی ویگن کا پورا ڈھانچہ لرز رہا تھا.... اور اُس کی لرزش انڈس کی طرف زیادہ مائل تھی۔ باقی مسافر یا تو آنکھیں بند کئے بیٹھے تھے اور یا کلمہ شریف کا ورد کرنے میں مشغول تھے۔

"ابو"، سلجوق جو پہلی مرتبہ خوفزدہ دکھائی دیا کہنے لگا " اگر میں کُود گیا تو آپ بیٹھے رہیں گے؟"

"نہیں بیٹے تم دروازہ کھول کر باہر جاؤ گے تو میں بھی چھلانگ لگا سکوں گا نان—— ورنہ نہیں"

"آپ فکر نہ کریں"، اُس نے ہینڈل پر اپنی گرفت مضبوط کر دی۔

اُس ایک فرلانگ کے آفت زدہ ٹکڑے کو ہم نے تاریکی میں لرزتے، جھولتے، کپکپاتے طے کیا اس طرح کہ ہم میں اور دو کلو میٹر نیچے بہتے انڈس کے درمیان حائل فاصلے ختم ہوتے ہوتے رہ جاتے۔ جونہی ویگن کے پہیے ہموار سطح پر آئے تو اکبر خان نے انجن بند کر کے سگرٹ سلگا لیا، "صاحب مجھے بھی ٹائم چاہیے دماغ ٹھیک ہونے کو"

سفر پھر جاری ہو گیا۔ کسی نے ٹیپ ریکارڈر چلانے کی فرمائش کی تو سب نے اسے بُری طرح لتاڑا کہ دماغ خراب ہے—— آہستہ آہستہ—— بارش اور پہاڑ اور تاریکی اور بلندی—— یکدم ایک دھماکہ ہوا۔ نواب صاحب بھی چونک گئے۔

"کہیں سلائڈ گری ہے"، اکبر بولا "آپ لوگ ذرا احتیاط سے بیٹھ جائیں

اور کان لگا کر سنتے جائیں۔ مجھے تو یہاں انجن کی وجہ سے کچھ پتہ نہیں چلے گا آپ آواز سنو تو شور مچا دو"

تب ہم مجسموں کی مانند بے حس و حرکت اکڑوں بیٹھ گئے اور ہمارے سب کے کان باہر تھے۔

"ادھر رات کے وقت پہاڑ گرتا ہے اور خاص طور پر بارش کے وقت لیکن گرنے سے پہلے خبر کرتا ہے، آپ شور ضرور مچانا"۔ اکبر بھی خاصا فکرمند تھا۔ لیکن ہماری تو گھگھی بندھی ہوئی تھی۔

ہم ایک ڈراؤنے خواب میں سے گذرتے رہے۔ خواب اس لئے کہ گذر گئے نہ گذرتے تو گذر گئے ہوتے۔ چند کلومیٹر طے کرنے کے بعد ونڈ شیلڈ میں سے ایک اور لینڈ سلائیڈ کے آثار نظر آئے۔ اکبر نے بریک لگا کر ویگن روکی اور نیچے اتر کر اس کا معائنہ کیا۔ ویگن کی لائٹس میں بے شمار پتھر کیچڑ میں پھنسے کچھوؤں کی طرح پڑے تھے۔

"اس کے پار نہیں جا سکتے" اکبر واپس آگیا" بالکل جگہ نہیں ہے"

نواب صاحب حسب معمول بڑے اعتماد سے آگے بڑھے اور ٹارچ کی مدد سے لینڈ سلائیڈ کا بغور مطالعہ کرنے لگے۔ پھر انہوں نے ایک سگریٹ پیا اور سڑک کے کنارے پر جھک گئے "گذر تو سکتی ہے۔ لیکن ذرا احتیاط کے ساتھ"

"نواب جی" اکبر ناراض ہو گیا "کدھر سے گذر سکتی ہے؟"

"ادھر سے" نواب صاحب سڑک کے عین کنارے پر کھڑے ہو کر کہنے لگے" ادھر اتنی جگہ ہے کہ ویگن کے پہیے اس پہ آجائیں"

اکبر نے جھک کر اس جگہ کو بالشتوں سے ماپنا شروع کر دیا اور پھر کھڑا

ہو گیا نہیں جی اتنی جگہ نہیں ہے"

"دیکھو میں ٹھیکیدار بھی رہا ہوں" نواب صاحب نے سینہ پھلا کر بڑے فخر سے "عمارتوں میں سینٹی میٹروں کا حساب چلتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اگر بالکل سیدھی چلاؤ گے تو پہیہ کنارے سے نہیں اُترے گا، گذر جائے گی"

"کیا خیال ہے؟" اکبر خان نے مجھ سے پوچھا۔

"اگر گذرے گی تو اِس مرتبہ میں اس میں نہیں بیٹھوں گا" میں نے سلجوق کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

فیودور جو پچھلی نشست پر اپنی بیگم کی گود میں سر رکھے سو رہا تھا باہر آگیا، "ہم گیل گت پہنچ گئے" اس نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔

"ہم یہاں پہنچ گئے ہیں" میں نے سڑک پر گرے ہوئے پتھروں اور کیچڑ کے ڈھیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور پھر اسے بتایا کہ ڈرائیور شاید عین کنارے پر ویگن کو چلاتا ہوا دوسری جانب لے جائے۔

"ڈرائیور کریزی ہے" فیودور نے غصے سے کندھے اچکائے اور اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑ کر باہر سڑک پر لے آیا "ہمیں اٹلی واپس جانا ہے۔ یہیں دفن نہیں ہو جانا گاڈ ڈیم انڈس میں"

تاریکی خاموش تھی، دریا کا شور تھا اور ویگن کی لائٹس قراقرم کے سلسلۂ کوہ میں پھیل رہی تھیں۔

"میں آگے کھڑا ہو کر تمہیں گائڈ کرتا ہوں" نواب صاحب ہیڈ لائٹس کے سامنے دونوں ہاتھ اٹھا کر کھڑے ہو گئے۔ وہ ایک بھٹکے ہوئے جن کی طرح لگ رہے تھے۔

"ہاں تو اکبر اللہ کا نام لو اور سٹارٹ کر دو" اکبر نے انجن سٹارٹ کر دیا۔

"اب بالکل سیدھے چلے آؤ، شاباش"

"بھائی میرے تو اکلوتے ماں باپ ہیں" راجہ صاحب داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ویگن سے کود پڑے۔

"تم بیٹھ جاؤ جی" اکبر نے غصے سے کہا "یہ تارڑ صاحب تو اپنے بچے کی وجہ سے حوصلہ ہار جاتے ہیں"

"تم بیٹھ جاؤ ——"

راجہ صاحب نے بقیہ دو مسافروں کی طرف دیکھا جو اس فیصلے کے منتظر تھے کہ ویگن سے اُترنا ہے یا بیٹھے رہنا ہے اور پھر "رب خیر کرے گا" کہہ کر اندر چلا گیا۔

نواب صاحب نے اشارہ کیا اور ویگن اُن کی جانب رینگنے لگی۔ اُس کے بائیں طرف کے پہیے تو یقیناً سڑک کے عین کنارے پر تھے لیکن اُن کے اُوپر باڈی کا حصہ عین انڈس کے اوپر معلق تھا۔ "آجاؤ۔ آجاؤ" نواب صاحب پیچھے ہٹتے گئے اور ویگن اُن کے اشارے پر ایک سدھائے ہوئے پلّے کی طرح آگے بڑھتی گئی۔ یکدم اس کے دائیں جانب کے ٹائر بلند ہو گئے اور ویگن کھائی کی طرف جھکنے لگی۔ اکبر نے کھڑکی میں سے سر نکالا اور سرگوشی کے انداز میں آہستہ سے کہنے لگا "نواب جی مروا دیا ہے ناں —— یہ اب نیچے جا ہی جائے"

میں سلجوق، فیودورا اور اس کی بیوی دم سادھے کھڑے رہے۔

"ویگن میں بیٹھے رہو۔ ہلنا مت ——" اکبر مسافروں سے کہہ رہا تھا۔

پھر اُس نے سر باہر نکالا "بھائی نواب اب کیا کریں؟"

"تم حرکت مت کرنا ۔۔۔" نواب صاحب بھاگتے ہوئے قریب آئے اور بڑی احتیاط سے اس جگہ کو دیکھا جس پر ویگن کے پہیے چڑھے ہوئے تھے۔
"ایک بڑا پتھر راستے میں آگیا ہے اس پر چڑھ گئے ہیں ۔۔۔ تم حرکت نہ کرنا میں کچھ کرتا ہوں"۔
"اب کیا کرو گے" اکبر بے حد آہستہ سے بولا جیسے زور سے بولنے سے ویگن کا توازن بگڑ جائے گا اور وہ بگڑ سکتا تھا" میں تو باہر بھی نہیں آ سکتا۔ میری طرف کا دروازہ تو کھائی کے عین اُوپر کھلتا ہے نواب بھائی"
اس دوران ویگن میں بیٹھے ہوئے مسافروں کی آواز بالکل نہیں آئی، وہ چپکے بیٹھے رہے۔
نواب صاحب نیچے بیٹھے اور پہیوں کے آگے کیچڑ میں ہاتھ ڈال کر ٹٹولنا شروع کر دیا اور پھر خاصی دیر بعد اُٹھ کر کہنے لگے "میں اطمینان کر لیا ہے۔ اس سے آگے کوئی بڑا پتھر نہیں ہے ۔۔۔ لے آؤ"
"رتی بھر کی گنجائش نہیں ہے نواب صاحب" اکبر خان کی آواز میں پہلی مرتبہ سراسیمگی سنائی دی" اگر ایک سینٹی میٹر بھی بلند ہوئے تو گئے ۔۔۔ نیچے"
"تم لے آؤ ۔۔۔ میں ٹھیکدار رہا ہوں" نواب صاحب کو بھی غصہ آگیا۔
اکبر نے ویگن سٹارٹ کی جو ایک دھچکے کے ساتھ اُسی ٹیڑھی حالت میں لرزنے لگی۔ نواب صاحب حسبِ معمول ہدایات دیتے رہے اور وہ چھوٹے چھوٹے دھچکوں کے ساتھ آگے ہوتی گئی، بالآخر اُس کا بلند حصّہ نیچے ہوا اور ویگن سیدھی ہو کر لینڈ سلائڈ سے باہر نکل آئی۔
میں سلجوق کا ہاتھ تھامے اندر داخل ہوا تو راجہ، احسان اور ائیر فورس والے صاحب کے چہرے تاریکی میں زرد ہو رہے تھے، باقاعدہ دکھائی دے

رہے تھے۔ جیسے فلورسنٹ رنگ اُن کے چہروں پر مل دیا گیا ہو اور وہ اندھیرے میں چمک رہے ہوں لیکن صرف زرد رنگ

"آپ نے اچھا کیا تارڑ صاحب جو اندر نہیں بیٹھے۔" راجہ کی مری ہوئی آواز آئی" یہ ہمیں معلوم ہے کہ ہم نے پچھلے بیس سیکنڈ کس طرح گذارے ہیں"

"آپ کے چہرے بتا رہے ہیں کہ آپ نے یہ بیس سیکنڈ کس طرح گذارے ہیں"

میں نے پلاسٹک کی بوتل کو منہ لگایا اور اپنے حلق میں اٹکے معدے کو نیچے کیا۔

اس طرح ایک اور نہ ختم ہونے والے سفر کا پھر آغاز ہوا۔ ایک سفر ختم نہیں ہوتا تھا اور دوسرا شروع ہو جاتا تھا۔ ایک داستان کے اختتام پذیر ہونے سے پیشتر ہی دوسری داستان شروع ہو جاتی تھی۔ در اصل یہ صرف ایک سفر نہیں تھا ہزار ہا سفر تھے۔ ایک نہیں ہزار داستان تھا۔

کسی نامعلوم جگہ پر پہنچ کر اکبر نے مجھے بتایا کہ ہم جنگلوٹ میں سے گذر رہے ہیں جہاں سے دن کے وقت نانگا پربت اپنی تمام تر خوفناک حقائتوں اور خوبصورتیوں کے ساتھ نظر آتی ہے ——— ادھر اس مقام سے بائیں ہاتھ پر دیکھئے ——— نہیں کچھ نظر نہیں آیا ——— آپ واپسی پر دیکھ لینا۔

اسے معلوم نہیں تھا کہ میں نے اس راستے سے واپس نہ آنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ مجھے چاہے اس فاصلے کو پیدل طے کرنا پڑے میں ایک مرتبہ پھر ان اذیتوں میں سے گذرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا ——— مجھے بہت بعد میں پتہ چلا کہ میں نے اس سفر کو موت کی اذیت سے بڑھ کر کیوں محسوس

کیا — میرے دل و دماغ کو انڈس اور قراقرم نے کیوں مفلوج کر کے رکھ دیا — کیا اس سے پیشتر میں نے کئی مرتبہ موت کے سرد سانس اپنے چہرے پر محسوس نہیں کئے تھے .... تو پھر اس سفر نے مجھے کیوں اتنا بزدل اور کم ہمت بنا دیا تھا — شاید اس لئے کہ میرا بیٹا میرے ساتھ تھا اور یہ وسوسے اُس کے لئے تھے ، یہ خدشات اُس کی وجہ سے تھے جو میرے پیٹ میں خوف کی گانٹھیں باندھ دیتے تھے — اور یوں بھی شاہراہِ ریشم اور انڈس کے امتزاج سے جو خوف تخلیق ہوتا ہے وہ دنیا بھر سے الگ ہوتا ہے ۔

یہیں کہیں جنگلوٹ کے آس پاس ایک گاؤں "گور" نام کا ہے ، وادی سائی ہے جہاں سے ایک دشوار راستہ سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ایک ایسے مقام تک جاتا ہے جہاں سارا سال تیز اور برفیلی ہواؤں کا راج رہتا ہے ۔ اس مقام پر کھڑے ہو کر اگر آپ مشرق کی جانب نگاہ کریں تو بلتستان میں سر بلند دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے ٹو یا "شاہ گوری" کی دھند آلود شباہت دکھائی دیتی ہے ۔ شمال کی جانب چہرہ کریں تو دوبانی اور راکاپوشی کے سفید معبد جلوہ گر ہیں اور جنوب میں ہمالیہ ہیں اور ان میں نانگا پربت کھڑی نظر آتی ہے اور اگر یہاں سے آپ نیچے جھانکنے کی ہمت کر سکیں تو دنیا کی ڈھلوان ترین سطح آپ کی نظروں کے سامنے آئے گی — جس کا فاصلہ تیئس ہزار فٹ کے قریب ہے ۔ ایک یورپی سیّاح کے بقول ہمالیہ میں سب سے خوفناک اور عظیم نظارہ اس مقام سے دکھائی دیتا ہے" — اس حیرت انگیز منظر کی کشش کبھی نہ کبھی مجھے اپنی طرف کھینچ لے گی ۔ لیکن اس وقت — مجھے نانگا پربت یا گور کی بلندیوں سے دکھائی دینے والے ہمالیہ میں سب سے خوفناک اور عظیم نظارے سے کوئی سروکار نہ تھا

میں صرف گلگت پہنچنا چاہتا تھا۔

تتا پانی تو دہشت کی ایک طویل سرنگ تھی۔ ہماری ویگن پتھروں اور کیچڑ میں سے ٹھوکریں کھاتی آگے بڑھ رہی تھی اور ہمارے اُوپر ایک بھربھرا پہاڑ جھکا ہوا تھا جس میں سے جابجا پانی پھوٹ رہا تھا اور اتنا گرم تھا کہ اس میں سے بھاپ نکل رہی تھی ـــــ گیلی مٹی کے گرنے کی آواز آتی تھی اور ہم اکبر خان کی ہدایت پر کسی بڑی لینڈ سلائڈ کے دھماکے کی آواز سننے کے لئے خاموش تھے اور ہماری آنکھیں کھلی تھیں اور کان باہر تھے۔

پورے علاقے میں سب سے زیادہ لینڈ سلائڈز یہیں پر ہوتی ہیں اور تتا پانی کا علاقہ عبور کرتے ہی سب نے ایک طویل سانس اطمینان کا لیا اور ایسے سانس ہم کو بار بار لینے پڑتے تھے۔۔۔۔

اور وہاں جنگلوٹ میں سے گذرتے ہوئے اکبر خان کے چہرے پر بالآخر مسکراہٹ آئی اور کہنے لگا "تارڑ صاحب، آپ کے لئے خوشخبری ـــ ہم انڈس سے جدا ہو چکے ہیں"

"کدھر گیا؟" راجہ ایک دم یوں بڑبڑایا جیسے اُس کی کوئی شے گم ہو گئی ہو۔

"اُدھر چلا گیا سکردو، بلتستان کی جانب ـــ"

"فیودورو، تمہارا انڈس اُدھر چلا گیا ہے، تم بھی جاؤ ـــ" میں نے فیودورو کو آواز دی۔

"جانے دو ـــ پہلے گلگت پہنچ کر ایک ہفتہ آرام اور پھر انڈس کو دیکھ لیں گے"

"لیکن پانی کی آواز تو ابھی تک آ رہی ہے" میں نے اکبر خاں سے پوچھا۔

"یہ دریائے گلگت ہے" وہ کہنے لگا۔

"جہاں جاؤ گے کوئی نہ کوئی دریا ساتھ ہوگا تارڑ صاحب" نواب نے شرارت سے کہا۔

بارش بالآخر ختم گئی۔ رات کا ایک بجنے کو تھا اور ہمارے تھکے ہوئے بدن آسودگی محسوس کرنے لگے کیونکہ ویگن اب ایک نسبتاً ہموار علاقے میں سے گذر رہی تھی۔

"یہ تو بالکل میدانی علاقہ ہے" راجہ نے کہا۔

"نہیں بڑا ظالم علاقہ ہے" اکبر خان نے کہا "اب دیکھو لگتا یہ ہے کہ ہم چڑھائی پر جا رہے ہیں لیکن در حقیقت یہاں اُترائی ہے"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے اکبر خان، ہم یقیناً چڑھائی چڑھ رہے ہیں ——"

نواب صاحب نے سر ہلایا۔

"نہیں اُترائی ہے"

"نہیں چڑھائی ہے"

"میں جو کہہ رہا ہوں کہ ہم ڈھلوان پر ہیں اور نیچے جا رہے ہیں میں ڈرائیور ہوں نواب صاحب"

"اور میں ٹھیکیدار رہا ہوں مجھے نہیں پتہ —— ہم چڑھائی پر ہیں"

"اچھا تو میں ویگن کو نیوٹرل گیئر میں ڈال دیتا ہوں، دیکھنا کدھر جاتی ہے"

ہم تھکے ہوئے پژمردہ اور بھوکے تھے اور اکبر خان ویگن کو نیوٹرل گیئر میں ڈال کر سٹیئرنگ سے ہاتھ اٹھائے کہہ رہا تھا "اب دیکھنا یہ خود بخود نیچے جائے گی"

"اکبر خاں یار ہم جو مانتے ہیں کہ یہاں اُترائی ہے تم خدا کے لئے ویگن کو گیئر میں ڈال کر سفر جاری رکھو"

"نہیں صاحب، نواب صاحب کو بھی معلوم ہو جانا چاہیئے کہ یہ اُترائی ہے" وہ ہتھیار ڈالنے والے سپاہی کی طرح ہاتھ اٹھائے بیٹھا رہا ——— خاص دیر کے بعد معلوم ہوا کہ ویگن ایک ہی جگہ پر کھڑی ہے، نہ آگے نہ پیچھے نہ اُترائی تھی اور نہ چڑھائی۔

تھوڑی دور جا کر پھر بھی بحث چھڑ گئی کہ ذرا دیکھئے یہاں پر اُترائی محسوس ہو رہی ہے لیکن دراصل ہم چڑھائی چڑھ رہے ہیں ——— اکبر خاں پھر ہاتھ اُٹھا کر بیٹھ گیا کہ دیکھیں کدھر کو جاتی ہے ——— پیچھے یا آگے۔ تب میں نے اِس طویل سفر کے دوران پہلی مرتبہ اپنے غصے کو بے قابو ہونے دیا اور اکبر خان کان لپیٹ کر خاموشی سے ویگن چلانے لگا۔

سڑک کے دونوں طرف سے پہاڑ اور کھائیاں الگ ہو کر پیچھے ہونے لگے اور اُن کی جگہ پاپلر کے درختوں اور باغوں نے لے لی ——— ایک ویران سڑک جو یہ بتاتی تھی کہ دن کی روشنی میں یہ آباد ہوتی ہے ——— ویرانے ختم ہو چکے تھے۔

پھر ایک پتھر پر "گلگت پُل۔ دو کلومیٹر" لکھا دکھائی دیا اور نیم مردہ مسافر زندہ ہو گئے، انہیں اپنے سامان کا خیال آیا، ہوٹلوں اور گھروں کے بارے میں سوچنے لگے اور وہ جو ایک خاندان تھے واپس اپنے اصلی خاندانوں میں جانے لگے، الگ ہونے لگے ———



بالآخر... گلگت - چنار اِن اور چٹانیں

رات کو سوئے ہوئے سارے شہر ایک جیسے ہوتے ہیں اور اُن میں داخل ہونے والے اجنبی مسافر بھی ایک جیسے ہوتے ہیں۔

گلگت کے ٹورسٹ ہوٹل "چنار اِن" میں جب ہماری ویگن داخل ہوئی تو دو بج چکے تھے۔ ہارن کی تیز آواز سے کہیں ایک آدھ روشنی جلی اور گل ہو گئی۔ پھر پتہ نہیں کہاں سے ایک چوکیدار بابا نمودار ہوا اور لاٹھی گھما کر کہنے لگا "ایک تو دیر سے پہنچا ہے اور پھر ہارن بجاتا ہے"

اکبر خاں نیچے اُترا اور بابے کا گریبان پکڑ کر کہنے لگا "ہم کوئی شوق سے دیر سے آیا ہے ۔۔۔ بارش تھی، سیلاب تھا، لینڈ سلائیڈ تھا"

"وہ تو ہوتا ہی ہے" بابے نے گریباں چھڑا کر غصّے سے کہا "کوئی مسافر ہے؟"

"ہاں یہ ہے" اکبر خان نے ہماری جانب اشارہ کیا۔

میں نے آگے بڑھ کر باباجی کی خدمت میں راولپنڈی کے ٹورسٹ آفس سے حاصل کردہ کمرے کی پیشگی بکنگ کی رسید پیش کی اور کہا "بابا ہمارا کمرہ کھول دو"

"کونسا کمرہ؟ ۔۔۔ اس وقت کوئی کمرہ نہیں۔ جاؤ جاؤ" اور وہ لاٹھی ٹیکتا جانے لگا۔

"اکبر خاں" میں نے سلجوق کے ہاتھ میں سے چھڑی لے کر اُسے زمین پر مارتے ہوئے بے حد متانت سے کہا "اِس بابے کو بولو کہ اگر اس نے ابھی، اسی وقت ہمارے لئے کوئی کمرہ نہ کھولا تو مجھے قسم ہے پیدا کرنے والے کی، میں اس ٹورسٹ ہوٹل کے تمام شیشے اس چھڑی کے ساتھ توڑ دوں گا اور بابے کا سر بھی"

اکبر خاں نے میرا پیغام تفصیل کے ساتھ اُس بابے کو جا سنایا جس پر وہ مردِ بزرگ واپس آیا، باقاعدہ کورنش بجا لایا اور ہمارا سامان اُٹھا کر ہمیں ایک ایسے کمرے میں لے گیا جو اس وقت دنیا کا سب سے آرامدہ اور محفوظ ترین کمرہ تھا۔ کیونکہ اُس کے آس پاس نہ کوہ قراقرم تھے اور نہ دریائے سندھ ——— نرم بستر اور کھڑکیوں پر پردے تھے۔ فرش پر قالین تھے جو گندے تھے لیکن پتھروں سے بہتر تھے اور خاموشی تھی ——— سکون تھا ——— بابے کے جاتے ہی میں نے دروازہ مقفل کیا اور صوفے پر گر گیا۔ "ہاں بھئی سلجوق ——— ہم پہنچ گئے ——— ڈر تو نہیں لگا؟"

اس نے اپنی عینک اُتار کر اُس کے شیشے چمکائے اور ناک پر جما کر بولا۔

"او نہیں ابو ——— میں تو آپ کے لئے فکر مند تھا۔ اس عمر میں اتنا طویل اور خطرناک سفر ———"

میں بے اختیار ہنسنے لگا۔ میں خوش تھا کہ میں بالآخر گلگت میں تھا اور سلجوق میرے ساتھ تھا جس کے چہرے پر ایک نظر ڈالنے سے میں تازہ دم اور زندگی سے بھرپور ہوا جاتا تھا ——— میں نے اُسے اپنے ساتھ لپٹا کر خوب پیار کیا "جیتے رہو بیٹے"

"لیکن کھانے کو کیا ہے؟"

"اس وقت کچھ بھی نہیں ——— سو جاؤ"

"اُس نے بیگ کھول کر اُس میں سے ایک لفافہ نکالا" کیا آپ اس وقت مزیدار پنیر اور ڈبل روٹی کھانا پسند کریں گے؟"

"ضرور ــــــ لیکن سفر کے دوران تم نے ــــــ"

"ابّو سفر کے دوران نکالتا تو ہمارے حصّے میں کچھ بھی نہ آتا ــــــ بقیہ مسافروں کو صلح مارے بغیر تو نہیں کھا سکتے تھے؟"

اس شاندار ڈنر کے بعد ہم نے کپڑے بدلے اور میں بستر پر لیٹ گیا لیکن سلجوق اِدھر اُدھر تانک جھانک کرتا رہا۔

"اب سو جاؤ"

"ابّو سونے کو جی نہیں چاہتا"

"نیند تو مجھے بھی نہیں آرہی لیکن ــــــ"

"میرا خیال ہے میں ذرا نہا لوں"

"نہاؤ گے؟" میں نے چونک کر کہا۔

"فکر نہ کریں ابّو باتھ روم میں انڈس کا پانی نہیں ہوگا" اور وہ بیگ میں سے تولیہ نکال کر مسکراتا ہوا غسل خانے میں چلا گیا۔

گلگت سے ترابزان کتنی دُور ہے؟

ترابزان بحیرہ اسود کے کنارے ایک قدیم ترک قصبہ۔

جہاں روایت کے مطابق یونانی دیومالا کا ہیرو جیسن اپنے ساتھیوں سمیت بادبانی کشتی "آرگو" میں سوار آیا تھا اور اُسے "سنہری کھال" کی تلاش تھی۔

ترابزان، جو قدیم شاہراہِ ریشم کا پہلا پڑاؤ تھا۔

اطالوی سیاح مارکو پولو نے بھی چین جانے کے لئے اپنے سفر کا آغاز یہیں

سے کیا تھا۔

اور ترابزان میں اب بھی ایک ایسی سرائے کے کھنڈر موجود ہیں جس میں مارکوپولو نے قیام کیا تھا۔ یورپ سے واپسی پر ایک مرتبہ ترابزان میں مجھے بھی شام ہوئی تھی لیکن میرا قیام قدرے کم رومانوی تھا کیونکہ رات سمندر کے کنارے مچھیروں کے ایک جھونپڑے میں بسر ہوئی۔

لیکن یہاں گلگت میں جو جدید شاہراہ ریشم پر واقع تھا میں مارکوپولو کی نسبت بہت بہتر حالات میں تھا۔ اُس اطالوی نے تو قراقرم عبور کرتے ہوئے یہیں کہیں آس پاس کھلے آسمان تلے قزاقوں اور جنگلی درندوں کے خوف کی موجودگی میں راتیں گذاری ہوں گی لیکن میں ——— میں اس وقت چنار ان کے شاہانہ ڈائننگ روم میں اپنے بیٹے کے ہمراہ ایک ایسا ناشتہ کر رہا تھا جس میں تقریباً آدھی ڈبل روٹی کے ٹوسٹ، نصف درجن انڈے، جیم، شہد اور کافی وغیرہ شامل تھے۔ ڈائننگ روم کا وسیع اور صبح کی روشنی سے منور ہال، اس کی بلند دیواروں اور ستونوں پر لٹکتی چینی سُوتی تصاویر، مارکوپولو بھیڑ کے سینگ، مارخور بکرے کے سر ——
راولپنڈی سے گلگت تک کا طویل اور لرزہ خیز سفر جانے ہم نے کب کیا تھا، کیا تھا بھی یا نہیں ——— اس وقت تو ہم اپنے آرام دہ بستروں میں ایک گہری اور تازہ کرنے والی نیند کے بعد ناشتہ کر رہے تھے۔ ہمارے حواس نارمل تھے۔ ہم جن کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے وہ جامد و ساکت تھیں، پاؤں کے نیچے قالین دھنستا تھا۔ اگر ہم دائیں دیکھتے تھے تو چنار ان کا ایک طویل برآمدہ نظر آتا تھا اور بائیں دیکھتے تھے تو شیشے کی ایک بڑی کھڑکی سے پرے ایک باغ دکھائی دیتا تھا جس میں انار سُرخ ہو رہے تھے، دائیں جانب سندھ نہیں تھا اور بائیں جانب قراقرم نہیں تھے ——— میرا خیال ہے کہ ترابزان سے چین تک کے پُرخطر سفر کے

بعد جب چینی شہنشاہ نے مارکوپولو کے اعزاز میں شاہی محل کے اندر جو دعوت دی ہوگی اس میں شرکت کرتے ہوئے یہ اطالوی سیّاح بھی کچھ کچھ ہماری طرح محسوس کر رہا ہوگا ـــــ محفوظ اور اطمینان کے گہرے سانس لیتا ہوا ـــــ اسی لمحے "چنار ان" کے مینجر ریاض صاحب اور اُن کے ساتھی غازی صاحب ڈرائینگ روم میں داخل ہوئے۔

"تارڑ صاحب آپ رات بہت دیر سے پہنچے" ریاض صاحب نے ہاتھ ملاتے ہوئے ایک خوشگوار مسکراہٹ سے پوچھا۔ میں نے سفر کی ہولناکیاں اور خوفناکیاں بیان کرنے کی کوشش کی جنہیں وہ ایک ایسے تھانیدار کی طرح سپاٹ چہرے سے سنتے رہے جس کے سامنے لوگ روزانہ قتل اور ڈاکے کی وارداتیں رپورٹ کرنے کے لئے آتے رہتے ہیں اور وہ سنتا رہتا ہے۔

"بہر حال آپ پھر بھی خوش قسمت ہیں کہ پہنچ تو گئے ـــــ اکثر اوقات تو لینڈ سلائڈ کی وجہ سے جب راستہ بلاک ہو جاتا ہے تو مسافروں کو رات شاہراہِ ریشم پر ہی بسر کرنا پڑتی ہے ـــــ اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟"

"اب ـــــ" میں نے گرم کافی کا ایک گھونٹ حلق میں اُتار کر اس کی گرمی کو جسم میں بہتے ہوئے محسوس کیا "اب میں کافی کا ایک اور کپ پیوں گا"

"اور اس کے بعد؟" غازی نے دریافت کیا۔

"اس کے بعد؟ ـــــ" میں اٹک گیا کیونکہ میں تو ابھی تک گلگت پہنچ جانے کے چاؤ میں ڈوبا ہوا تھا اور بالکل خالی ذہن کے ساتھ صرف کافی پی رہا تھا "کیوں بھئی سلجوق اس کے بعد کیا پروگرام ہے؟"

سلجوق نے منہ پر ہاتھ رکھ کر ایک "آہم" کیا اور پھر جیب میں سے ایک چیٹ نکالی "دادی جان کے لئے چینی سلک سے بنی ہوئی ایک چادر

خریدنی ہے، وہ کہتی تھیں گلگت میں ملتی ہیں اور ـــــ امی کے لئے مارخور بکرے کی دُم تلاش کرنی ہے۔"

"مارخور بکرے کی ـــــ دُم؟"

"جی ابو ـــــ امی کہتی تھیں کہ گھر کی جھاڑ پونچھ کے لئے نہایت کارآمد چیز ہے، کئی سو برس تک چلتی ہے، انہوں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا ـــــ اور پولو دیکھنی ہے۔"

ریاض صاحب بڑے تحمل سے کھڑے سنتے رہے۔" بیٹا چادر تو مل جائے گی لیکن مارخور کی دُم ـــــ کیوں بھئی غازی! ادھر مارخور کی دم کہاں سے ملتی ہے؟"

"پتہ نہیں جناب۔" غازی قدرے جھینپ کر بولا۔" میرا خیال ہے تارڑ صاحب کہ آپ کی بیگم کو غلط اطلاع ملی ہے کہ گلگت میں دُمیں وغیرہ ملتی ہیں۔"

"آج تک تو میری بیگم کو کوئی غلط اطلاع نہیں ملی" میں نے ہنس کر کہا۔ "سوائے میرے بارے میں۔"

"اور جناب پولو تو صرف سردیوں میں کھیلی جاتی ہے اس لئے وہ بھی مشکل ہے ـــــ آپ یوں کیجئے کہ دو روز کے لئے پھنڈر ہو آئیے۔"

"پھنڈر؟"

"انتہائی خوبصورت وادی ہے، راستہ بھی محفوظ ہے تقریباً ـــــ اسے ہمارے ہاں چھوٹا کشمیر کہا جاتا ہے ـــــ پھر آپ ریاست یاسین کا ٹرپ بھی لگا سکتے ہیں یا گوپس چلے جائیے ـــــ گلگت سے چند میل دور کرگاہ ندی میں ٹراؤٹ مچھلی بھی ملتی ہے ـــــ سنہری ٹراؤٹ ـــــ اگر دلچسپی ہو تو کنڈیوں اور ڈور وغیرہ کا انتظام ہم کر دیں گے ـــــ"

"کمال ہے آپ ہنزہ کا نام ہی نہیں لے رہے"

"ہنزہ ؟" ریاض صاحب نے سر ہلایا "سبھی لوگ اُدھر ہی جاتے ہیں۔ میرا خیال تھا آپ اُن سے قدرے مختلف سیاح ہوں گے ـــــ ویسے تو میں خود ہنزہ کا رہنے والا ہوں"

"جی ہاں آپ کا سُرخ و سپید چہرہ اس بات کی گواہی دیتا ہے"

ریاض صاحب قدرے شرما گئے۔

اب کیا دیکھتے ہیں کہ فیودورو اور اُس کی بیوی آنکھیں ملتے ہوئے ڈائننگ ہال میں داخل ہو رہے ہیں۔

"ہیلو" سلجوق نے ہاتھ ہلایا۔

"ہا" فیودورو قریب آ گیا۔

"سنیور آپ کونسے ہوٹل میں ٹھہرے ہیں ؟"

"اسی ہوٹل میں ـــــ"

"لیکن یہاں تو کمرہ نہیں تھا ـــــ"

"ہاں نہیں تھا" فیودورو عینک کے پیچھے مسکرایا "جب اُس اولڈ مین نے تم لوگوں کو کمرہ کھول دیا تو پھر ہم نے اُسے ڈرانے دھمکانے کی بجائے تھوڑی سی منت سماجت کی ـــــ خاص طور پر میری بیوی نے ـــــ اور ہمیں بھی کمرہ مل گیا"

"ناشتہ ؟" میں نے پوچھا۔

"صرف ناشتہ ؟" فیودورو نے کندھے اچکائے "ہم ناشتہ، لنچ اور ڈنر کھائیں گے، اوہ گاڈ ہم بھوکے ہیں" اُس نے بیگم کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور مسکراتا ہوا ایک قریبی میز پر چلا گیا۔

"دراصل ہوا یہ کہ کوچ کا مقررہ وقت تو دس بجے تھے۔ ہم نے آپ

کا انتظار کیا اور پھر ہوٹل بند کر کے سو گئے اور چوکیدار کو اجازت نہ تھی ——
بہر حال آپ اگر ہنزہ جانا چاہتے ہیں تو صبح نو بجے تک آپ کو ویگن ملتی ہے بازار سے اور اگر اس وقت جانا پسند کریں تو جیپ کا بندوبست بھی ہو سکتا ہے۔"

"ہم اس وقت کہیں بھی نہیں جانا چاہتے ریاض صاحب —— صرف آرام سے مزید ناشتہ کرنا چاہتے ہیں۔"

اتنی دیر میں چمڑے کی نیکر اور جیکٹ پہنے ایک بھاری بھرکم جرمن سیاح ڈائننگ ہال میں داخل ہوا۔ اُس کے ہاتھ میں مچھلی پکڑنے کا راڈ تھا اور کندھے سے ایک براؤن تھیلا لٹک رہا تھا۔

"ہیلو مسٹر کروگر آج کدھر کا ارادہ ہے" ریاض صاحب نے پکارا۔

"ہیلو" اس نے قریب آ کر سب سے ہاتھ ملایا" میں آج پھر کارگاہ ندی میں سے ٹراؤٹ پکڑنے جا رہا ہوں" اس نے اپنے پیلے دانتوں کی مسکراہٹ نچھاور کرتے ہوئے کہا۔

"آپ روزانہ جاتے ہیں؟"

"ہاں —— روزانہ —— کیا ونڈر فُل جگہ ہے۔"

"اور روزانہ کتنی مچھلیاں پکڑتے ہیں؟"

"مچھلیاں؟" وہ ریاض صاحب کے کندھے پر دھپ لگاتے ہوئے ہنسنے لگا۔" ایک بھی نہیں —— یہ کہتے ہیں کہ وہاں مچھلیاں ہیں اس لئے میں انہیں مایوس نہیں کرنا چاہتا اور روزانہ چلا جاتا ہوں —— کیوں مسٹر ریاض؟"

مسٹر ریاض کچھ بولے نہیں، نادم سے ہوئے اور کروگر صاحب ہنسی خوشی مچھلی کے شکار کے لئے چلے گئے۔

"بڑا ہنس مکھ جرمن ہے" ریاض صاحب کے لہجے میں خفت تھی۔

مچھلیاں تو وہاں ہیں ——— ٹورازم والوں کے کتابچے میں جو لکھا ہے ——— بہرحال آپ کو یہاں اگر کوئی پرابلم ہو تو فرمائیے گا"

"صرف ایک پرابلم ہے"

"فرمائیے"

"جب یہ خیال آتا ہے کہ ہنزہ سے واپسی پر ایک مرتبہ پھر ہمیں شاہراہِ ریشم پر انڈس کی رفاقت میں راولپنڈی واپس جانا ہو گا تو ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جاتے ہیں"

"آپ فکر نہ کریں ہم آپ کو ہوائی جہاز کے ذریعے واپس پہنچا دیں گے"

"اگر موسم ٹھیک ہوا تو ——— اور جہاز میں جگہ ہوئی تو ———" غازی نے کھانس کر اطلاع کی۔

ڈائننگ ہال میں پہلے ایک ہلکی سی مہک آئی اور پھر فرانسیسی سیاحوں کا ایک غول اندر داخل ہوا اور چونکہ اُن میں وہ خوش لباس خواتین بھی شامل تھیں جن کا سندیسہ مہک ہم تک پہنچا تھا اس لئے ریاض صاحب قابلِ فہم طور پر اُن کی جانب کُوچ کر گئے۔

گلگت ایک جزیرہ ہے۔

ہزاروں فٹ بلند ننگی چٹیل چٹانوں کے درمیان میں۔

اور یہ چٹانیں ہمہ وقت آپ کے سامنے رہتی ہیں۔ گلگت کے کھیت گھر، دریا، بازار ان کے درمیان قید ہیں اور اتنی قریب ہیں کہ سر اُٹھاتے ہوئے خیال آتا ہے کہ کہیں آپ کی ناک اِن سے رگڑ نہ کھا جائے۔ دائیں بائیں آگے پیچھے تمام پس منظر بے آب و گیاہ چٹانیں ہیں اور گلگت میں گھومتے ہوئے بار بار آپ کو احساس ہوتا ہے کہ یہ مزید قریب آ رہی ہیں۔ جہاں

کل تھیں وہاں سے کچھ آگے سرک آئی ہیں، آپ کے چہرے کے نزدیک ہو گئی ہیں اور ان پر کوئی نقش کوئی راستہ کوئی پگڈنڈی کوئی گھر نہیں، سنگلاخ ڈھلوانیں آسمان سے نیچے اُترتی آتی ہیں۔ گرمیوں میں تپتی ہیں تو گلگت اُن کے بیچ روسٹ ہوتا رہتا ہے۔ موسمِ سرما میں پورے قراقرم اور ہمالیہ کی یخ ہواؤں کو جذب کر کے برفیلے پتھروں میں بدل جاتی ہیں اور گلگت والے جیسے ایک مردہ خانے میں ٹھٹھرنے لگتے ہیں۔

گلگت ایک جزیرہ اس لئے بھی ہے کہ یہاں پہنچنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور اگر وہ چٹانیں گرنے سے بند ہو جائے تو یہ بندی خانہ ہے جس کے مکینوں کو صرف ہوائی جہاز سے ہی باہر لایا جا سکتا ہے اور وہ بھی اگر موسم ٹھیک ہو تو —— اور وہ اکثر ٹھیک نہیں ہوتا۔ نانگا پربت پر ہمیشہ بادل چھائے رہتے ہیں اور جہاز کو اُس کے قریب سے گذر کر جانا ہوتا ہے۔ شاید اسی لئے ایک انگریز سیاح نے کہا تھا کہ گلگت کا آس پاس اتنا ہی غمزدہ کر دینے والا ہے جتنی کہ اس کی آبادیوں سے الگ تھلگ مکمل تنہائی، جس طرح انسان ایک پنجرے میں بند ہو، چٹانوں کی قربت اور اُن کے برہنہ پن میں پھنس گیا ہو۔ ہر روز خبر آتی ہے کہ راستے پر تودے گر چکے ہیں اور یہاں سے نکلنے کا کوئی طریقہ نہیں —— باغوں میں ہوا چلتی ہے تو خوف سے کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔

ان تمام دل گرفتہ عوامل کے باوجود گلگت ایک سحر انگیز نام رہا ہے۔ دُور افتادہ، نامعلوم، قدرے وحشی اور ان قافلوں کا شہرِ آغاز جو یارقند اور کاشغر کو جاتے تھے اور پھر کاشغر سے شمال مغرب میں فرغانہ، خوقند، سمرقند اور بخارا کا رُخ کرتے تھے۔ برطانوی ہندوستان کے ہر انگریز فوجی افسر کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح گلگت، گیری سَن میں تعینات ہو جائے کیونکہ ایک تو

پروموشن کو پَر لگ جاتے تھے اور پھر انگلستان واپس پہنچ کر آپ اپنی فرضی شجاعت اور "وحشیوں" کے ساتھ جنگ وجدل کے قصّے سنا سنا کر اپنے ہم وطنوں اور خاص طور پر وکٹورین دوشیزاؤں کی آنکھوں کو حیرت اور محبت سے پھیلتا دیکھ سکتے تھے کیونکہ وہاں اردگرد ایسا کون ہوگا جو یہ کہہ سکے کہ نہیں گلگت میں ایسا نہیں ہوتا۔

گلگت کے آس پاس اور ہُنزہ سے درّہ خنجراب جاتی ہوئی شاہراہ کے نواح میں بدھ عہد کے آثار باقی ہیں۔ بہت کچھ شاہراہ کی تعمیر کے دوران ڈائنامائٹ اور بارود کی نذر ہوا، قدیم خانقاہیں اور مجسّمے معدوم ہوئے لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ باقی رہ گیا نامعلوم رسم الخط سے کندہ چٹانیں اور مہاتما بدھ کے چپ مجسّمے ان وسیع ویرانوں میں کہیں نہ کہیں موجود رہے۔ ڈھائی سو قبل از مسیح میں بدھ مت اِن خطّوں میں پھیلا اور قبول کیا گیا۔ اگلے بارہ سو برس تک یہ سرزمین بدُھ کی تعلیمات پر عمل پیرا رہی۔ بارہ سو برس ایک بہت ہی طویل عرصہ ہوتا ہے۔ اتنا طویل کہ ہماری مختصر سوچ اُسے اپنی گرفت میں نہیں لے سکتی۔ اِن صدیوں میں اس خطّے میں کیا ہوا، ہمیں کچھ معلوم نہیں لیکن یقیناً یہاں بھی وطن پرستی کے نعرے لگے ہوں گے، تنگ نظر بدُھ بھکشوؤں نے لوگوں کا جینا حرام کیا ہوگا۔ دولت والوں نے تکبّر کیا ہوگا، پتہ نہیں کتنی محبتیں ہوں گی، کتنی نفرتیں ہوں گی اور کتنے ظلم ہوں گے جو اُن لوگوں نے کئے جو زمین کو اپنی ملکیت سمجھتے تھے، اُس پر تکبّر سے چلتے تھے اور اب وہ بارہ سو برس نامعلوم رسم الخط سے کندہ چٹانیں ہیں، بدھ کے چپ مجسمے ہیں —— اور اسی طرح آج سے بارہ سو برس بعد ہماری تہذیب کے بھی آثار ہوں گے —— باقی رہے نام اللہ کا —— اور پھر آٹھویں صدی کے بعد شاید چین کے راستے اسلام ان خطوں میں پھیلا۔ پہلے یہ مُغلوں کے زیرِ نگیں

رہے، کچھ عرصہ یہاں سکھ قابض رہے اور پھر ۱۸۷۸ء میں انگریز صاحب بہادر نے ہندوستان کی اس "آخری چوٹی" پر بھی قبضہ کر لیا ــــ معدودے چند غیر ملکی سیّاح جو اِدھر کو آتے بس گلگت میں بیٹھے رہتے یا اسلحہ سے لیس ہو کر اِدھر اُدھر کی "سیاحت" کر کے یہیں واپس آجاتے۔ یہ فوجی یا سیاسی سیاحت ہوتی تھی ــــ گلگت سے نکلنا اس لئے بھی خطرناک تھا کہ کاشغر روڈ پر ہنزہ اور نگر کی خود مختار ریاستیں تھیں جو اتنی "وحشی" تھیں کہ کسی غیر ملکی کو قریب نہ پھٹکنے دیتیں چنانچہ انگریز بہادر گلگت گیریسن کی عافیت میں بیٹھ کر سکاچ وھسکی پیتے، گولف کھیلتے اور اُن کی "درندگی" کو کوستے ــــ

لارڈ کرزن بھی ایک مرتبہ گلگت آیا اور اس کا کہنا تھا کہ یہاں ایک ایسا عہد ہے جو انسانی سوچ کی سرحدوں سے پَرے ہے اور ایک خاموشی ہے جو شائد کائنات کے وجود میں آنے کے بعد پہلے دن کی خاموشی ہے۔

شاہراہِ قراقرم کا معجزہ ظہور پذیر ہونے کے بعد بھی گلگت کی تنہائی اور دُور افتادگی کا یہ حال ہے تو اُن زمانوں میں یہ نام کتنی دہشت اور تجسس کا حامل ہو گا جب قراقرم کی بلندیوں میں بل کھاتا ایک کچّا راستہ تھا جس پر انسان صرف جُھک کر اور رینگ کر آگے بڑھ سکتا تھا۔ خچّر پر سامان لادتے وقت اس امر کا خیال رکھا جاتا تھا کہ اُس کے بورے میں دائیں جانب سامان نسبتاً کم ہو تاکہ بوجھ کی وجہ سے وہ اُلٹا ہو کر دریائے سندھ میں نہ جا گرے ــــ گلگت کے ریسٹ ہاؤس کے ایک بوڑھے چوکیدار کا کہنا ہے کہ بہت عرصہ پہلے ایک چینی تاجر نے گلگت میں آکر دہائی دی کہ میں چین سے چاندی لا رہا تھا اور میرے دو خچّر دریائے سندھ میں گر گئے ہیں۔ خچّر تو بہہ گئے ہوں گے۔ لیکن چاندی اپنے وزن کی وجہ سے ابھی تک

دریا کی تہ میں پڑی ہوگی اور جو شخص میری چاندی وہاں سے نکالنے میں کامیاب ہوگا وہ آدھی چاندی کا حقدار ٹھہرے گا — بے شمار لوگ اِس مہم پر نکلے لیکن کسی کو بھی کامیابی حاصل نہ ہوئی اور کسی کی بھی چاندی نہ ہو سکی۔ ایک یورپی سیاح جو تقریباً اسّی برس پیشتر ان علاقوں میں آیا تھا کہتا ہے کہ جناب اب تو بہت آسانی ہو گئی ہے پہلے تو گلگت کو صرف ایک کچا راستہ جاتا تھا بلکہ اُسے راستہ کہنا زیادتی ہے۔ دراصل پہاڑی بکریوں کے چلنے سے ایک پگڈنڈی بن گئی تھی جس پر سیاح حضرات بھی سفر کر لیتے تھے لیکن اب — اب تو بہت شاندار سڑک ہے جس پر ایک خچر بھی چل سکتا ہے — اور اب ہمارے زمانے میں شاہراہِ ریشم ہے جس پر — بُل ڈوزر، ٹریلر، ٹرک اور بسیں بآسانی چل سکتے ہیں لیکن ہم ایسوں کا پتہ پھر بھی پانی ہو کر سندھ میں گرتا رہتا ہے۔ گلگت اس لحاظ سے دنیا بھر میں منفرد ہے کہ اُس کی قربت میں دنیا کی بلند ترین اور خوبصورت ترین چوٹیاں ہیں جن میں کے ٹو، نانگا پربت، راکاپوشی وغیرہ شامل ہیں اور اس کے آس پاس دنیا کے طویل ترین برفانی دریاؤں یعنی گلیشیرز کا ایک سلسلہ ہے جن میں ہتورہ، بیافو اور حسپر بین الاقوامی طور پر جانے جاتے ہیں۔

گلگت کے باسی اس حقیقت پر بجا طور پر فخر کرتے ہیں کہ وہ گھر بیٹھے پاکستان میں شامل نہیں ہو گئے بلکہ اس منزل کے لئے انہوں نے مسلح جدوجہد کی ہے۔ چونکہ گلگت ایجنسی اور اس کے نواحی علاقے مہاراجہ کشمیر کے باجگزار تھے اس لئے اعلانِ آزادی کے بعد مہاراجہ کے بریگیڈیئر گھانسارا

سنگھ کی کمان میں ڈوگرہ فوج نے گلگت پر اپنی حاکمیت قائم رکھی۔ چار ماہ کے بعد گلگت سکاؤٹس نے ڈوگرہ راج کے خلاف بغاوت کردی اور ڈوگروں کو زبردست شکست دے کر بُنجی کی جانب پیش قدمی شروع کردی۔ بُنجی کے بعد استور اور پھر دوسائی میدان عبور کر کے سکردو میں ہندوستانی فوج کا سامنا کیا۔ جونہی سکاؤٹس لداخ کے صدر مقام لیہہ کے قریب پہنچے یو این او کی طرف سے فائر بندی کا حکم آگیا۔۔۔ایک گلگتی نے مجھے بتایا کہ ڈوگرہ فوج کو شکست دینے کے بعد ہم نے قائداعظم کو بذریعہ تار یہ خبر روانہ کی اور درخواست کی کہ حکومتِ پاکستان کے نمائندے فوراً گلگت پہنچیں اور اسے پاکستان کا حصّہ قرار دے کر نظم ونسق سنبھال لیں۔ لیکن نامعلوم وجوہات کی بنا پر وہ اہم برقی پیغام قائد تک نہ پہنچ سکا۔ تب اہلِ گلگت نے بذریعہ روڈ اپنا ایک پیغامبر روانہ کیا۔۔۔اسی لئے تو گلگتی جب مزاح کے موڈ میں ہوں تو ہمیں کہتے ہیں کہ بھائی تم نے تو ہماری تار کا جواب بھی نہیں دیا تھا۔

گلگت ایک جزیرہ ہے۔ جہاں کشتی بصورت ہوائی جہاز آتی ہے اور اس جزیرے کا محبوب ترین موضوع یہ ہے کہ جہاز کب آئے گا۔ کہتے ہیں کہ اگر آپ کسی دکاندار سے کسی چیز کی قیمت دریافت کریں تو وہ دکان سے باہر آکر آسمان کو دیکھے گا اور پھر قیمت بتائے گا۔ اگر موسم ٹھیک ہے اور جہاز کے آنے کا امکان ہے تو مناسب قیمت ورنہ ۔۔۔ من مرضی کے دام۔۔۔ کیونکہ اشیاءِ ضرورت تمام کی تمام باہر سے آتی ہیں اور آپ سے بھی یہی پوچھا جاتا ہے کہ آپ باہر سے آئے ہیں یعنی گلگت ایک علیٰحدہ دنیا ہے۔

بارش برس رہی تھی اور اُس کی تیزی میں کمی واقع نہیں ہوئی تھی اور ہمارے جسم خوراک کی کمی کے باعث لاغر ہو رہے تھے اور تھکن سے لوہا ہو رہے تھے اور ہمارے ذہن سفر کی دشواریوں اور اذیتوں سے تقریباً ناک آؤٹ ہو چکے تھے اور ہم سولہ گھنٹے کے طویل سفر کے بعد یہاں پہنچے تھے۔ ویگن کے اندر بیٹھے ہوئے ہم اُن خوش نصیبوں کی قسمت پر رشک کر رہے تھے جو اس وقت ہوٹل شینگری لا کے قالین پوش کمروں میں نرم سفید بستروں میں لیٹے ٹیبل لیمپ جلائے "ٹریبلے لوا" قسم کا کوئی رسالہ پڑھ رہے تھے اور وہ ابھی ڈنر کھا کر کافی پی کر لیٹے تھے اور انہیں معلوم نہ تھا کہ باہر بارش ہو رہی ہے، حبس ہے، گرمی ہے اور ایک ویگن کھڑی ہے جس میں بیٹھے ہوئے مسافر بھوکے اور تھکے ہوئے ہیں اور وہ ایک طویل اور پُر خطر سفر کے بعد یہاں پہنچے ہیں۔

"گلگت چلتے ہیں جی۔" نواب صاحب نے بالآخر وہ فقرہ کہہ دیا جو کوئی بھی کہنا نہ چاہتا تھا لیکن اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ "آپ جاؤ جی مینجر صاحب۔" انہوں نے مینجر صاحب اس طرح سے کہا جیسے فضائی صاحب کہہ رہے ہوں۔

"بارش ہو رہی ہے۔ کچھ ہرج مرج ہو گیا تو میں ذمہ دار نہ ہوں گا، آگے تتا پانی بھی ہے۔" اکبر خان نے اپنا سابق بیان بدل کر ہمیں ڈرانا شروع کر دیا۔

"ہرج مرج ہو گیا تو ہم سب ہی ذمہ دار ہو جائیں گے اکبر خان..." میں نے کہا۔ "رب کا نام لو اور چلو۔" چنانچہ اکبر خان نے بسم اللہ پڑھ کر ویگن موڑی اور ہم شینگری لا کے احاطے سے باہر آ کر گلگت کی جانب روانہ ہو گئے جو چلاس سے پورے پچاسی میل کے فاصلے پر تھا اگر وہ وہاں تھا تو! کیونکہ اب ہمیں یقین ہو چلا تھا کہ گلگت کا وجود ہی نہیں ہے اور ہم پہاڑوں میں کھو چکے ہیں اور ایک سفرِ لاحاصل ہمارے نصیب میں ہے۔ ہم ایک نہ ختم ہونے والی تاریکی میں

کر غنیزا ابھی تک فل بوٹ پہن کر گھومتے ہیں اور لداخی تو ایسے بدھ بھکشو لگتے ہیں جو اپنے اپنے چوغے اُتار کر سیر کو نکلے ہوں ۔

چینی سلک خریدنے کے لئے "چائنہ سٹور" میں گئے جو دو تین کچے پکے کوٹھوں اور ایک وسیع صحن پر مشتمل تھا۔ ایک صاحب نے بتایا کہ اُدھر ترکستان سے تجارتی قافلہ آئے ہوئے کئی ماہ گذر چکے ہیں اس لئے خاص خاص اشیاء تو فروخت ہو چکی ہیں۔ البتہ یہ کراکری، لالٹین اور تمام چینی کے برتن وغیرہ حاضر ہیں —— بعد میں معلوم ہوا کہ چینی قافلہ جب بھی آتا ہے اس کے ساتھ ہی مقامی دکاندار بھی آجاتے ہیں، کام کی چیزوں کے دام چکاتے ہیں اور اپنی دکان چمکاتے ہیں۔ کراکری اور تمام چینی وغیرہ کے برتن چونکہ بالکل "پینڈو" تھے اس لئے اُن پر لگی "میڈ اِن چائنہ" کی مہر بھی ہمیں متاثر نہ کر سکی اور ہم سٹور سے باہر آگئے۔

جامع مسجد کے پہلو میں ایک بے حد تنگ بازار ہے جو دریائے گلگت پر معلق اس عظیم الشان پُل پر ختم ہوتا ہے جسے ایشیا میں اپنی طرز کا سب سے بڑا پل کہا جاتا ہے اور اس تنگ بازار میں ایک کچی کوٹھڑی کا ہوٹل تھا جس کی دیواروں اور چھت میں دھواں سرایت کر چکا تھا اور وہ مکمل طور پر سیاہ تھیں —— یہ لنچ کے لئے ہمارا ڈائننگ روم تھا۔ جس میں ہم نے مزیدار لیکن صفائی کے حوالے سے بے حد مخدوش چپل کباب اور تنور کی روٹی کھائی ۔

گلگت کے بیشتر مکان اور دیگر عمارتیں ایک منزلہ ہیں۔ سڑکیں وسیع اور صاف ستھری —— چنانچہ آسمان پورا دکھائی دیتا ہے ۔ نیچے آتا ہے اور آدھے راستے میں چٹانیں اُس کو روک لیتی ہیں —— پہلے روز گلگت کے بازار میں گھومتے ہوئے کوئی شے ایسی تھی جو گم ہو گئی تھی یا کوئی احساس

تھا۔ جس کی تکمیل ہو گئی تھی۔ وہ کونسی بے چینی تھی یا اطمینان تھا جو مجھ پر اثر انداز ہو رہا تھا اور میں مختلف تھا ــــ یہ عقدہ تب کھلا جب ایک دکاندار نے "نارڑ صاحب" کہہ کر مجھے پکارا اور کہنے لگا "میں بھی پنجاب سے ہوں۔ پچھلے دو برس سے گلگت میں کاروبار کر رہا ہوں اس لئے آپ کے تازہ ترین ٹیلیویژن پروگرام نہیں دیکھ پایا ــــ کہئے کیسے آنا ہوا؟" ــــ گلگت میں ٹیلی ویژن نہیں تھا اور اسی لئے میں یہاں "آزادی" سے گھوم سکتا تھا۔ یہاں متجسس نگاہیں اور حقارت آمیز قہقہے میرا پیچھا نہیں کرتے تھے، قریب سے گذرنے پر سرگوشیاں سنائی نہیں دیتی تھیں۔ میں حقیقتاً آزاد تھا، ایک عام انسان تھا اور ایک عرصے کے بعد گمنامی کی لذت سے لطف اندوز ہو رہا تھا ــــ ہر جگہ پہچانے جانے کا ایک سرور تو ہوتا ہے لیکن آپ اپنی شہرت میں قید ہو کر رہ جاتے ہیں ــــ ہر وقت چوکنے ــــ بے آرام ــــ اور یہ شہرت گلگت کی چٹانوں کی طرح باہر کے مناظر کو آپ کی نظروں سے اوجھل کر دیتی ہے۔ آپ اپنی من مرضی سے زندگی نہیں گذارتے بلکہ جس طرح دوسرے لوگ چاہتے ہیں اُس طرح گذارتے ہیں۔ ریڑھی پر سُرخ سُرخ گاجریں سجی ہیں اور ساتھ میں کرارہ مصالحہ بھی ہے۔ آپ ایک گاجر اُٹھا کر کھانے لگتے ہیں کیونکہ آپ کا جی چاہتا ہے اور اُدھر سے آواز آتی ہے "ہا ہائے دیکھو نِیں تارڑ گاجریں کھا رہا ہے" "کیوں بھئی تارڑ کا دل نہیں چاہتا بازار میں کھڑے ہو کر گاجریں کھانے کو ــــ تو گلگت میرے لئے ایک نعمت تھا، میں یہاں صرف ایک سیاح تھا ــــ میں لوگوں کو گھور سکتا تھا، دکانوں کے آگے بے مقصد کھڑا ہو سکتا تھا اور اگر گلگت میں گاجریں ہوتیں تو اطمینان سے وہ بھی کھا سکتا تھا۔

لاہور سے روانگی کے وقت سنگِ میل پبلی کیشنز کے مالک اور میرے

دوست نیاز احمد صاحب نے گلگت کے ایک کتب فروش جی۔ ایم۔ بیگ کے نام اپنا کارڈ دیا تھا اور کہا تھا کہ بیگ صاحب شمالی علاقوں کی انسائیکلو پیڈیا کہلاتے ہیں، کام کے آدمی ہیں، مل لیجیئے گا۔ چنانچہ بیگ صاحب کی تلاش ہوئی۔ کہنا تو نہیں چاہیئے لیکن محاورے کی مجبوری ہے کہ بیگ صاحب گلگت میں ــــ کی طرح مشہور ہیں۔ کسی سے پوچھئے کہ جی وہ یہاں جی ایم بیگ ــــ مجال ہے ذرّہ بھر تأمل کرے "ہاں اپنے بیگ صاحب ــــ آپ اُن کے مہمان ہیں، سیدھے چلے جائیے۔ جماعت خانہ بازار میں دائیں ہاتھ پر"۔

بیگ صاحب کی دکان پر پہنچ کر میں نے اندر جھانکا ــــ کوہ پیمائی کا سامان، رُک سیک، آئس ایکس، سٹوو، چٹانوں پر چڑھنے کے لئے نائلون کے رسّے اور مخصوص میخیں، یاک کے بالوں کے نمدے، گلگتی چوغے اور ٹوپیاں قراقرم میں پوشیدہ بستیوں کے پتھریلے برتن اور دیئے، قیمتی پتھر ہنزہ کی رنگین ٹوپیاں، شمشال کے قالین، شمالی علاقہ جات کے بارے میں لکھے گئے غیر ملکیوں کے سفرنامے، تفصیلی نقشے، پہاڑی بکروں کی اُون کے موٹے سویٹر، لالٹین، کچھ مہاتما بدھ اور اس چھوٹے سے عجائب خانے میں مارخور کے سینگوں کے قریب اپنی گود میں ہاتھ رکھے سر جھکائے اپنے آپ میں گم بیگ صاحب ــــ سرخ و سفید جرمن چہرہ اور ناک پر چمکیلے فریم کی عینک ــــ میں نے نیاز صاحب کا کارڈ پیش کیا۔ وہ خاصی دیر تک اُس کا مطالعہ کرتے رہے اور پھر سر اُٹھا کر بولے اور منہ سے زیادہ ناک کے رستے بولے "غاں غاں ــــ نیاز احمد صاحب ــــ غاں کیسے ہیں وہ؟"

میں نے عرض کیا کہ مزے میں ہیں۔ رام گلی کا گوشت کھاتے ہیں۔ گوالمنڈی کا دہی کھاتے ہیں، دوسروں کو بھی کھلاتے ہیں، روزانہ تین چار کتابیں چھاپتے ہیں اور مزے میں ہیں ــــ اس کے بعد بیگ صاحب اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک صاحب کے ساتھ محوِ گفتگو ہو گئے اور وہ بھی کسی اجنبی زبان میں ــــ سلجوق منہ کھولے بیٹھا رہا۔ میں نے چند سفرناموں کی ورق گردانی کی۔ شمشال کے قالین پر بُنے ہوئے گل بوٹوں پر غور کیا اور جب بہت غور ہو چکا تو میں نے گلا صاف کر کے کہا، "بیگ صاحب اور سنائیں کیا حال چال ہے؟" بیگ صاحب چونکے "اچھا ــــ غاں وہ نیاز صاحب کیسے ہیں وہ؟" میں نے پھر عرض کیا کہ مزے میں ہیں اور رام گلی کا گوشت ــــ اس کے بعد بیگ صاحب پھر گم ہو گئے۔

میں نے اپنی چھڑی اُٹھائی اور اُٹھ کھڑا ہوا ــــ بیگ صاحب نے ناراضگی سے مجھے دیکھا "غاں ــــ آپ کا اسم شریف ــــ" میں نے اسم شریف بتایا لیکن اُن کے کچھ پلّے نہ پڑا۔ میں نے پھر بتایا لیکن انہوں نے جواب میں صرف "غاں" کیا۔ تب میں نے اُن کے شیلف میں رکھی اپنی ایک کتاب اُٹھائی اور اُس پر انگلی رکھ کر کہا "یہ"

"اچھا اچھا ــــ" وہ ایک دم دوست ہو گئے، "غاں ہاں مستنصر صاحب آپ کیسے ہیں؟" میں نے اپنا حال بتایا۔

شاید بیگ صاحب کی بیٹری قدرے ڈاؤن ہو چکی تھی اس لئے تاخیر سے سٹارٹ ہوتے تھے دھچکوں کے ساتھ لیکن ایک دفعہ جب سٹارٹ ہو گئے تو پھر فراٹے بھرنے لگے۔ "اچھا اچھا ــــ آپ پہلی مرتبہ گلگت تشریف لائے ہیں، پسند آیا؟ ــــ یہاں سے کہاں جائیں گے ــــ ہنزہ؟ وہاں

تو ہر کوئی جاتا ہے۔ آپ شمشال جائیں، چپہ پُرساں جائیں"

"کونسے پُرساں؟"

"چپہ پُرساں ـــــ فارسی لفظ ہے چپہ کے معانی ہیں کیا ـــــ پُرساں کس کسمپرسی وغیرہ ـــــ"

"وہاں بہت کسمپرسی ہے؟"

"اچھا اچھا ـــــ نہیں نہیں وادی کا نام ہے ـــــ اور ان سے ملئے یہ ہمایوں بیگ ہیں" قریب بیٹھے صاحب کی طرف اشارہ ہوا۔

"گویا کہ یہ بھی بیگ ہیں؟"

"غاں ـــــ اور شمالی علاقوں کے بارے میں اتھارٹی ہیں"

یہ والے بیگ صاحب ہالی وڈ کے قدیم رومانوی ہیرو روڈولف والنٹینو سے بے حد مشابہت رکھتے تھے۔ انتہائی وجیہہ اور ایک ایسے چہرے کے مالک انسان جس پر تجربے، محبتیں، مشقتیں لکیروں کی صورت میں اپنے نقش کندہ کر جاتی ہیں۔

"تو آپ کو بھی ہُنزہ میں دلچسپی ہے؟" انہوں نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔

میں نے سوچا اس ہمایوں بیگ پر ہنزہ کے بارے میں اپنے وسیع مطالعے کا رعب ڈالا جائے۔

"جی ـــــ دراصل جب میں نے آئن سٹیفن کی کتاب "دی ہانڈ موُن" میں ہنزہ کا تذکرہ پڑھا تو ـــــ"

"اوہو سٹیفن تو بے چارہ پچھلے برس فوت ہو گیا ـــــ اچھا دوست تھا"

"کس کا دوست تھا؟"

"میرا دوست تھا" ہمایوں بیگ نے انتہائی سپاٹ لہجے میں کہا "میں نے اُس کے ہمراہ ان علاقوں کی سیاحت کی تھی۔ اگر آپ نے "دی ہارنڈ مون" پڑھی ہے تو اُس میں میرا ذکر بھی ہے"۔

"اچھا؟" میرا منہ کھُل گیا۔ بہر حال اس کے بعد ایسا ہوا کہ میں نے مشہور تاریخ دان آرنلڈ ٹائن بی کی کتاب "بٹوین جمنا اینڈ آکسس" کا مطالعہ کیا تو ——

"آہ آرنلڈ" ہمایوں بیگ صاحب نے ایک رنجیدہ آہ بھری۔ "بے چارہ آرنلڈ بھی مر گیا —— اچھا دوست تھا۔ سوچتا ہوں کہ اُس نے میرے نام جو خطوط لکھے تھے انہیں تلاش کر کے محفوظ کر لوں"۔

یہ والے بیگ صاحب میرے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کر رہے تھے۔ ایک ایسے شخص کے ساتھ جو آئن سٹیفن اور ٹائن بی کا ذاتی دوست رہا ہو میرا جیسا سی کلاس ادیب بھلا کیا گفتگو کر سکتا تھا۔ بہر حال میں نے ایک آخری اور بڑا مہلک قسم کا وار کیا اور مجھے اُمید تھی کہ بیگ صاحب بالکل چت ہو جائیں گے۔ "تو جناب بیگ صاحب اُن دنوں میں لنڈن میں تھا اور کرسمس کی شام تھی اور میں نے ہنزہ کے بارے میں ایک فلم "سرچ فار پیراڈائز" دیکھی —— اپنی خاتون دوست جینس کے ہمراہ"۔

ہمایوں بیگ صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ اب وہ یہ تو نہیں کہہ سکتے تھے کہ آہ لنڈن بے چارہ بھی فوت ہو گیا ہے یا جینس میری دوست تھی۔ البتہ انہوں نے صرف اتنا کہا کہ "آہ بے چارہ کیمرہ مین"۔

"کونسا کیمرہ مین؟" میں نے جھلا کر کہا۔

"جن دنوں "سرچ فار پیراڈائز"، کی فلمبندی ہو رہی تھی اور میں ایک خصوصی مشیر کی حیثیت میں ڈائرکٹر کو اسسٹ کر رہا تھا تو انڈس کی فلمبندی کے دوران ہمارا ایک کیمرہ مین کشتی میں سے گر کر ڈوب گیا تھا ___ مجھے اس کا بہت افسوس ہے۔" یہ کہہ کر ہمایوں بیگ صاحب نے اجازت چاہی، بڑی خوشی ہوئی تارڑ صاحب اور ہاتھ ملایا اور چلے گئے۔

"یہ ہمایوں بیگ صاحب کیا چیز ہیں"

"یہ ہمارے دوست ہیں،" جی ایم بیگ اپنی بدھا طرز کی مسکراہٹ لبوں پر لا کر بولے "غاں ___ سول سروس کے خاصے اہم عہدے پر فائز تھے۔ ہنزہ کے باشندے ہیں اور ان دنوں گلگت میں ریٹائرڈ زندگی گذار رہے ہیں ___ انگریزی کے بہت بڑے عالم ہیں"

"ہاں" میں نے اقرار کیا "ان کی انگریزی سن کر تو لارڈ کرزن کو بھی اپنی کم مائگی کا احساس ہو جائے۔"

"غاں"، بیگ صاحب بولے "لارڈ کرزن بھی گلگت آیا تھا۔"

"بیگ صاحب ___ میں بھی گلگت آیا ہوں میرے لئے کیا حکم ہے؟"

"اچھا اچھا ___ انہوں نے اپنے ملازم سے مقامی زبان میں یقیناً قہوہ لانے کو کہا کیونکہ وہ فوراً لے آیا۔ انہوں نے قہوے کی پیالی سلجوق کے آگے رکھ دی "آپ برخودار"

"میں نہیں پیتا"، سلجوق نے جمائی لے کر کہا۔

"اچھا اچھا ___ آپ تو پیجئے ___ جی اب فرمائیے"

"میں ہُنزہ جانا چاہتا ہوں"

"تو چلے جائیے ___ اس وقت نہیں۔ صبح نو بجے آجائیے میں آپ

کو ویگن میں بٹھا دوں گا، چار گھنٹے کا سفر ہے"۔

"میرا مطلب ہے بیگ صاحب مجھے کچھ معلومات درکار ہیں"

اچھا؟ انہوں نے حیرت سے کہا۔

"اچھا کیا؟"

"آپ کو معلومات درکار ہیں؟"

"جی"

"اچھا اچھا ــــ کس قسم کی معلومات؟"

"یہی کہ ــــ کہ ہنزہ آخر ہے کیا؟"

"ہنزہ ــــ" انہوں نے قہوے کا ایک پر تکلف گھونٹ بھرا۔" دراصل اس کے تین حصے ہیں ــــ ہنزہ بالائی جو گجال کہلاتا ہے۔ ہنزہ مرکزی جو بروشال ہے اور زیریں حصہ شناکی ــــ گجال جو ہیں زیادہ تر واخان افغانستان کے لوگ ہیں اس لئے واخی زبان بولتے ہیں۔ مرکزی ہنزہ میں مخلوط خون ہے، سفید ہُن، یونانی، تاتار اور مغل وغیرہ ــــ کہا جاتا ہے کہ سکندرِ اعظم کا سپہ سالار درم تیتم اپنے بیمار سپاہ کے ہمراہ اِدھر رہ گیا تھا۔ ان کے چار قبیلے ہیں۔

۱۔ درا میتنگ

۲۔ براتلنگ

۳۔ برونگ

۴۔ خوردکس

ان میں سب سے اہم قبیلہ درا میتنگ ہے اور ہُنزہ میں مکان کی بنیاد رکھنے کے لئے یا نہر کی کھدائی کا آغاز کرنے کے لئے ان کے کسی فرد کو

بلایا جاتا ہے۔ شادی کے گھر میں بھی پہلے داخل ہوتے ہیں اور جب میر باہر نکلتا تھا تو یہ اُس کے آگے آگے چلتے تھے ___ گنیش میں ایرانی اور اپاچے نسل کے لوگ ہیں ___ ۱۸۹۲ء تک ہنزہ والوں کو چین، افغانستان اور روس کے علاوہ بقیہ دنیا کا بالکل علم نہ تھا ___ اسی برس انگریز آگئے۔ چنانچہ میر صفدر علی خان اور دارا بیگ فرار ہو کر سنکیانگ چلے گئے۔ انگریزوں نے ناظم خان کو میر بنا دیا ___ ہُنزہ کے نوجوانوں کا دستور تھا کہ وہ ہر برس گروہ کی شکل میں سنکیانگ جاتے اور لوٹ مار کر کے واپس آجاتے ___ پھر سنکیانگ کے گورنر کی درخواست پر صلح نامہ ہو گیا جس کے تحت اہلِ ہنزہ کو سراقل قصبے کا خراج اور سنکیانگ میں واقع ایک وسیع چراگاہ کے حقوق حاصل ہو گئے ___ اس چراگاہ میں میر کے مویشی چرتے تھے۔ انقلابِ رُوس کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا ___ دراصل اہل ہنزہ بنیادی طور پر بے حد پُرامن اور صلح پسند لوگ ہیں لوٹ مار وغیرہ اُن کی خصلت میں شامل نہیں ہے، صرف حالات اور میر کے دباؤ کی وجہ سے انہیں ایسا کرنا پڑتا تھا ___ اور کچھ تارڑ صاحب؟"

"ابو میں ذرا سیر کر آؤں ___" سلجوق نے انتہائی بدتمیزی سے ایک طویل جمائی لی اور مجھے گھورتا ہوا دکان سے باہر چلا گیا۔

"آپ اپنے بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گے؟" میں نے ایک منجھے ہوئے ٹی وی میزبان کی طرح سوال کیا۔

"میں؟ ___ اچھا اچھا ___ غاں میں بھی ہُنزہ کا رہنے والا ہوں۔

درہ خنجراب پر شاہراہِ ریشم کے آغاز کے موقع پر پاکستان کی جانب سے پہلی تقریر میں نے کی تھی۔ اسماعیلیہ سپریم کونسل فار سنٹرل ایشیا کا سیکرٹری جنرل ہوں ___

بک سیلر ہوں۔ ٹورسٹ گائیڈ ہوں ـــــ تاریخ دان ہوں ـــــ اور کچھ تارڑ صاحب؟"

"ہمایوں بیگ صاحب کی طرح کون کونسے غیر ملکی ادیب آپ کے دوست ہیں؟"

"خاں دوست تو نہیں ـــــ البتہ یہ لوگ آتے رہتے ہیں اور میں جو تھوڑا بہت جانتا ہوں انہیں بتاتا رہتا ہوں ـــــ جرمن خاتون ڈاکٹر ملر سٹرلچپٹ آئی تھیں اور انہوں نے ہنزہ کے رسوم پر "ہنزہ" کتاب لکھی تھی۔ کارل جٹ مارک سے بھی ملاقات ہو چکی ہے جنہوں نے "ہندوستان" تحریر کی ہے۔ ایک ڈاکٹر ہرمن برگر آئے تھے۔ جنہوں نے ہماری زبانوں کی ڈکشنری تیار کی ـــــ کرس بیننگٹن بھی میرے جاننے والوں میں سے ہیں ـــــ"

"ایورسٹ اِن کلائمبڈ" کے مصنف؟"

"جی ہاں۔ اُن کے ہمراہ مشہور ناول نگار مانسرٹ بھی تشریف لائے تھے۔ جارج بی شلر کی کتاب "سٹونز اِن سائیلنس" میں بھی میری شمولیت تھی ـــــ پھر آئرلینڈ سے ڈرولا مارفی آئی تھیں ـــــ"

"اُن کی کتاب "وٹر انڈس اِز ینگ" تو میں نے بھی دیکھی ہے۔"

"جی ہاں ـــــ اور کچھ؟"

"ہنزہ کی روائتی طویل العمری کے بارے میں کچھ فرمائیے!"

"نہیں نہیں"، بیگ صاحب نے پہلی مرتبہ اپنے دانت دکھائے اور وہ چمکے کیونکہ سونے سے سجائے گئے تھے۔ "اب تو دودھ مکھن اور خوبانی کے تیل کی بجائے ڈالڈا۔ چائے اور سگرٹ آ گئے ہیں۔ اب وہ حساب نہیں رہا۔ شاہراہِ ریشم نے جہاں ان علاقوں کو ترقی کی راہ پر ڈالا ہے وہاں اچھی صحت اور خوبصورتی بھی اِسی راستے سے رخصت ہو گئی ہے ـــــ اور کچھ تارڑ صاحب؟"

"میں گلگت میں ہوں اور جانتا ہوں کہ "پولو" کا لفظ آپ کی زبان کا ہے اور اس کے معانی "گیند" کے ہیں —— تو جناب بندہ گلگت آئے اور پولو نہ دیکھے —— میں پولو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"ناممکن —— پولو صرف سردیوں میں کھیل جاتی ہے اور کچھ؟"

"بہت بہت شکریہ جی ایم بیگ صاحب انشاءاللہ کل پھر حاضر ہوں گے تب تک کے لئے خدا حافظ!"

میں دکان سے باہر آیا اور بازار میں سلجوق کو تلاش کرنے لگا لیکن وہ پتہ نہیں کہاں چلا گیا تھا —— بازار کا پورا چکر لگانے پر بھی نہ ملا۔ ٹھیک ہے وہ ماشاءاللہ تیرہ برس کا تھا، فٹ بال کھیلتا تھا۔ لیکن میں تو اُسے لاہور میں بھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا تھا۔ چہ جائیکہ گلگت میں وہ یوں گم ہو جائے۔ مجھے معلوم تھا کہ بیگ صاحب کی گفتگو میرے لئے انتہائی کارآمد اور دلچسپ لیکن اُس کے لئے بے حد بورنگ ثابت ہوئی تھی اور وہ اُکتا کر باہر چلا گیا تھا۔ میں نے گھبراہٹ میں ایک دو سگرٹ پھونکے اور چناران واپس جانے کا فیصلہ کیا، شاید وہاں چلا گیا ہو —— میں مُعلّق پل کے قریب پہنچا تو وہ تنگ بازار میں اونٹوں کی طرح لمبے لمبے ڈگ بھرتا مسکراتا ہوا میری طرف چلا آرہا تھا۔

"جُوتی کے بچے کہاں چلے گئے؟"

"ابّو پولو" اس کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔

"پولو؟"

"ہاں آج شام ہو رہی ہے —— پرانی پولو گراؤنڈ میں۔"

"پولو گرمیوں میں نہیں ہوتی۔"

"آج ہو رہی ہے"

"تمہیں کیسے پتہ ہے؟"

"آپ جب اُس بور بندے کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے ناں تو میں وہاں سے اُٹھ کر بازار میں گھومنے لگا تھا۔ وہاں ایک ویگن رُکی جس میں فیودورووا اور اس کی بیوی سوار تھے اور وہ ہنزہ جا رہے تھے انہوں نے بتایا ہے کہ آج شام کو ——"

"اور انہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"پتہ نہیں"

ہم نے بازار میں گھومتے ہوئے چند معززین سے پولو میچ کے بارے میں دریافت کیا لیکن سبھی نے یہی کہا کہ نہیں صاحب آج کوئی پولو نہیں ہے، گرمیوں میں گھوڑے آرام کرتے ہیں اور سردیوں میں لگتے ہیں —— پولو کیلئے تیار گھوڑے کو گھوڑا لگنا کہا جاتا ہے۔

"بیٹے چناران واپس چلتے ہیں، آج پولو نہیں ہے"

"ہے ابو" سلجوق نے ضد کرتے ہوئے منہ بسورا "مجھے فیودوروو نے خود بتایا ہے"

"جی ہاں ایک اطالوی سیاح کو تو پتہ چل گیا اور گلگت کے باسیوں کو کچھ پتہ نہیں —— دیکھو بیٹے اگر گلگت ایسے چھوٹے شہر میں پولو کا کوئی میچ ہو رہا ہوتا تو یقیناً اہلِ گلگت اس کے بارے میں جانتے اور اس وقت کشاں کشاں پولو گراؤنڈ کی جانب رواں ہوتے ——"

سلجوق کا منہ لٹک گیا اور ہم چناران کی جانب چل دیئے، تھکے ہوئے مگر سیاحوں کی اُس بے نام مسرت کے ساتھ جو انہیں ایک انجانے شہر میں گھومنے

کی تھکاوٹ سے حاصل ہوتی ہے۔

پی آئی اے دفتر کے قریب ایک گھوڑا خود چلا آرہا تھا۔ گھوڑا اس لئے خود چلا آرہا تھا کہ اُس کا سوار پیدل چلا آرہا تھا۔

"ابو یہ پولو کا گھوڑا ہے"۔ سلجوق کی آنکھیں عینک کے شیشوں کے پیچھے چمک اُٹھیں۔

"پولو کے گھوڑے کے سینگ ہوتے ہیں جو اتنے یقین کے ساتھ کہہ رہے ہو؟"

"نہیں ہوتے اس لئے تو کہہ رہا ہوں کہ پولو کا ہے"۔

سلجوق میاں آپ زیادہ باتیں مت بنائیں ——— یہ کوئی عام سا گھوڑا ہے تانگے والا"

"گلگت میں تو تانگے نہیں ہوتے ابو"۔

"بحث مت کرو۔ خاموشی سے چلے آؤ"

تھوڑی دور گئے تو ایک اور گھوڑا اُسی سٹائل میں چلا آرہا تھا۔ چوک میں کھڑے سپاہی نے سیٹی بجا کر اُسے پاس کروایا اور سیلوٹ مارا۔

سلجوق نے میری طرف دیکھا "اب یہ بھی تانگے والا گھوڑا ہے؟"



.. اور ہمارے سامنے خوبصورت ہانپتے ہُوئے گھوڑے تھے

سپت سندھو میں آریائی حملہ آوروں کی دُھول ہے ـــــ اور یہ اُن کے قدموں کی دُھول نہیں بلکہ اس عجیب و غریب، نادیدہ، تیز رفتار جانور کے سُموں سے اُٹھتی دھول ہے جس پر وہ سوار ہیں اور ہماری بستیوں، زمینوں، کھیتوں اور اُن کی ہریاول کو روندتے چلے آرہے ہیں۔ ویرانی اور خشکی کے باشندے سبزے کی سرزمین پر چلے آرہے ہیں اور اُن کی ٹانگیں ایک ایسے جانور کے پیٹ کے گرد کسی ہوتی ہیں جو ہم نے اس سے پیشتر کبھی نہیں دیکھا۔ ہم اپنے خوبصورت بیلوں اور سُست ہاتھیوں کے ساتھ اُن کے مقابلے پر آتو گئے ہیں لیکن اُن بلاؤں کا کیا کریں جن پر سوار وہ اوجھل ہوتے ہیں۔ نظر آتے ہیں اور پھر اوجھل ہو جاتے ہیں ـــــ اس تیز رفتار جانور کا جثہ پسینے سے لشکتا ہے۔ اس لامبے منہ اور بالوں والی گردن کے چوپائے میں ایک وحشی تکبّر ہے جو زمین پر اترا کر چلتا ہے۔

زمین پر ریت ہے۔
گلگت کی پرانی پولو گراؤنڈ کی سطح پر ریت بچھی ہوئی ہے اور گھوڑا اُس پر دوڑ رہا ہے، لشکتے ہوئے جُثے، لامبے منہ اور بالوں والی گردن والا چوپایہ

جس میں ایک وحشی تکبر ہے جو زمین پر اترا کر چلتا ہے۔

سفید، سیاہ اور سرمئی رنگ کے جانوروں کی جلد قراقرم کی سیاہیوں کے اوپر پہلے چمکتے اور اب ماند پڑتے زرد سورج کی کرنوں میں رنگ بدلتی ہے اور اب اُسی رنگ میں ہے جو گلگت سے پرے ننگی چٹانوں کے اُوپر سے جھانکتی ایک برفپوش چوٹی کا ہے —— ہوا میں سرد سندیسے ہیں، شام ہو رہی ہے اور پولو میچ جاری ہے۔

اِن گھوڑوں کو یوں ہانپتے حملہ آور ہوتے دیکھ کر ایک قدیم دفاعی حِس میرے اندر پہلو بدلتی ہے، مجھے اطمینان سے نہیں بیٹھنے دیتی، بے آرام کرتی ہے۔ میں چوکس رہتا ہوں جیسے یہ وہی حملہ آور جانور ہیں جو گئے زمانوں میں آئے تھے اور جنہوں نے میرے کھیتوں کی ہریاول کو روندا تھا چنانچہ میں اب بھی چوکنا ہوں اور اپنے آپ کو ایک انجانے خطرے میں محسوس کرتا ہوں۔ پتھر کی چار دیواری پر گلگتی چوغوں اور اونی ٹوپیوں میں ملبوس مقامی موسیقاروں کا ایک گروہ آلتی پالتی مارے بیٹھا پورے جوش و خروش سے اپنی سانسیں اور اپنے ہاتھ چلا رہا ہے جس کے نتیجے میں سازوں میں سے ایک نامانوس اور تیز دھن وجود میں آ رہی ہے جو میدان میں اُترے ہوئے گھوڑوں کو اُن کے سواروں کو مہمیز دیتی ہے، انہیں بے چین کرتی ہے اور وہ ایک ایسے خوابیدہ جذبے کے تحت جو اُن کے وجود میں جانے کب سے موجود ہے، جسے وہ نہیں جانتے اور یہ موسیقی اُسے جگاتی ہے اور وہ بے قابو ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ جانتے نہیں کہ وہ کیا طاقت ہے جو اُن کے جسموں میں اُتری ہوئی ہے، اُن کی آنکھیں فروزاں ہیں اور وہ اُس کے تابع ہیں، ماتحت ہیں اور اپنی ٹانگیں جانوروں کے جسموں پر بھینچے مقابلے پر آتے ہوتے ہیں۔ اُن کے لئے اس لمحے پتھریلی چار دیواری پر بیٹھے سینکڑوں

تماشائی، ایک بلند چبوترے پر کھڑے غیر ملکی سیاحوں کا ایک گروہ ـــــ موسیقار ـــــ اُن پر جھکتی گلگت کی چٹانیں، زرد پڑتی برفیلی چوٹی اور ہوا ـــــ غائب ہیں ـــــ وہ اِن سب کو نہیں دیکھ رہے ۔ وہ صرف لکڑی کے ایک گیند کو دیکھ رہے ہیں جسے پولوسٹک کی وحشی ضرب سے انہیں گول تک پہنچانا ہے ۔ اُن کے لئے بقیہ تمام وجود اور محسوسات ختم ہو چکے ہیں، وہ دنیا کی چھت پر، آسمان کی قربت میں تنہا برسرپیکار ہیں اور یہاں کوئی قانون نہیں ۔ وہ وحشیوں کی طرح گھوڑوں کو اس طرح سرپٹ بھگاتے ہیں جیسے چنگیز خان کے لشکر کے آگے آگے دنیا کو روند رہے ہوں اور اُن کے نین نقش بھی تاتاریوں سے ملتے ہیں ـــــ اُن کے گھوڑے سرپٹ اور بے قابو بھاگتے ہوئے آتے ہیں، رُک نہیں سکتے اور پتھر کی چاردیواری کے ساتھ اُن کے پسینے سے بھیگے ہوئے جسم آٹکراتے ہیں ـــــ تماشائی ہڑبڑا کر بھاگتے ہیں، موسیقاروں کے سانس رک جاتے ہیں میں تصویریں بنا رہا ہوں اور ویو فائنڈر میں دیکھتے ہوئے اُن کے مضبوط مگر ہانپتے ہوئے بدن اتنی تیزی سے میری جانب آتے ہیں جیسے میں نے ٹیلی لینز کی مدد سے انہیں اپنے قریب کر لیا ہو میں کیمرہ چھوڑ کر سلجوق کا ہاتھ پکڑتا ہوں اور دیوار سے چھلانگ لگا دیتا ہوں ۔ سوار اور گھوڑے اُسی لمحے ایک لڑھکتی ہوئی چٹان کی طرح دیوار میں آکر ٹکراتے ہیں ۔ جب وہ لگامیں کھینچ کر اپنا رُخ بدلتے ہیں تو سب لوگ دوبارہ دیوار پر چڑھ کر بیٹھ جاتے ہیں اور مقابلے کو دیکھنے لگتے ہیں ۔

ایک سوار اپنا گھوڑا سرپٹ بھگاتا ہوا آتا ہے ایک ہاتھ سے باگ تھامے اور دوسرے میں پولوسٹک اور لکڑی کا گیند پکڑے جسے وہ ہوا میں اچھالتا

ہے اور پھر اسی ہاتھ میں پکڑی سٹک سے اُس پر اتنی شدید ضرب لگاتا ہے کہ گیند گراؤنڈ کے دوسرے کنارے پر ہوا میں اُڑتی ہوئی گول کے قریب جا گرتی ہے۔

کُل شاید پندرہ سولہ گھوڑے ہیں لیکن اُن کے سُم سینکڑوں کی تعداد میں ہیں جن کی دھمک ریت میں جذب ہو کر پتھریلی دیواروں تک پہنچتی ہے اور ہمارے جسموں کو لرزا دیتی ہے ——گیند پر وار کرتے ہوئے کئی مرتبہ پولو سٹک اُن کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے اور تماشائیوں میں سے کسی کو آ لگتی ہے اور نڈھال کر دیتی ہے—— اور کبھی ٹوٹ جاتی ہے —— گلگت کی اس پولو میں کوئی وقفہ نہیں، مقابلہ ہار جیت کے فیصلے تک جاری رہتا ہے۔

گھوڑے اور اُن کے سوار پسینے سے بھیگ جاتے ہیں—— اُن کے بال نچڑنے لگتے ہیں—— دونوں کے منہ کھل جاتے ہیں اور اُن میں سے بھاپ نکلتی ہے —— پولو گراؤنڈ میں سائے طویل ہو کر ختم ہو جاتے ہیں، سورج چٹانوں کے پیچھے جا چکا ہے اور ہوا میں خنکی کی آمیزش تیز ہو رہی ہے۔

موسیقاروں کے ڈھول کی تھاپ اب پہاڑوں میں گونجتی ہے۔

ان کی شہنائیوں کی لے میں بھی تیزی ہے۔

پتھروں سے بنی ہوئی چار دیواری کے اوپر ہم دونوں باپ بیٹا ایک نامانوس سرزمین پر چٹانوں میں گھرے ہوئے پولو میچ دیکھ رہے ہیں اور ہم بے قابو ہوتے گھوڑوں سے بچنے کے لئے متعدد بار چھلانگیں لگا کر چار دیواری سے نیچے اُترتے ہیں اور پھر بمشکل اُوپر چڑھتے ہیں۔

سیاحوں کے گروہ میں ایک وجیہہ بوڑھا ہے۔ جس کے لمبے سفید بال گردن کو ڈھانپے ہوتے ہیں۔ وہ گھوڑوں پر نظر جمائے اُن کا پیچھا کر رہا ہے۔

اس کے ہمراہ ایک خاتون ہے جو سیدھی کمر کے ساتھ دونوں ہاتھ رانوں پر جمائے بیٹھی ہے اور اُس کا سورج زدہ بھورا چہرہ پُرشوق سُرخی سے دمک رہا ہے ــــ جانے وہ کون تھے اور کہاں سے آئے تھے۔ کن سرد خطوں اور مکانکی روٹین والے جدید شہروں سے نکل کر یہاں آج گلگت میں تھے اور اُن کے سامنے ایک قدیم کھیل اُسی سرزمین پر کھیلا جا رہا تھا جہاں سے اس نے جنم لیا تھا ــــ یہ واپس جائیں گے اُنہی سرد خطوں اور مکانکی روٹین کے شہروں کو اور روزمرہ کی آسائشوں کی دلدل میں پھر سے دھنس جائیں گے اور پھر شائد کسی شام جب اس وجیہہ بوڑھے کے آخری سانس آنے لگیں گے تو یہ اِس خاتون کا ہاتھ پکڑ کر کہے گا "تمہیں یاد ہے ہم گلگت میں تھے اور برفپوش چوٹیاں زرد ہو رہی تھیں اور شام ہو رہی تھی اور ہمارے سامنے خوبصورت ہانپتے ہوئے گھوڑے تھے"

میچ ختم ہو چکا تھا ــــ میدان میں چھوٹے چھوٹے بچے پولو سٹکیں پکڑے گیند کے ساتھ کھیل رہے تھے اور سلجوق سُرخ پولو شرٹ میں ملبوس ایک چٹانی چہرے والے سرخ و سفید نوجوان سے باتیں کر رہا تھا جس کا نام بُلبُل جان تھا اور جو ابھی چند لمحے پیشتر ہمارے سامنے ایک سفید گھوڑے پر سوار زمین کو لرزا رہا تھا۔ اُس کا چہرہ بھیگا ہوا تھا اور آنکھوں میں سُرخی تھی "آپ اپنے بیٹے کو لے کر میرے غریب خانے پر ضرور آئیں"

میں نے سر ہلا دیا۔

پولو گراؤنڈ پر بچھی ریت ہمارے تھکے ہوئے قدموں تلے سے ختم ہو گئی اور ہم باہر آ گئے۔

"سلجوق"

"جی ابو"

"بیٹا تم یاد رکھنا کہ ہم گلگت میں تھے اور برفپوش چوٹیاں زرد ہو رہی تھیں اور شام ہو رہی تھی اور ہمارے سامنے خوبصورت ہانپتے ہوئے گھوڑے تھے"



ہُنزہ روڈ پر ایک کارواں سرائے ... جہاں سیب کے درخت ہیں اور آبشار گرتی ہے۔

ہم غلام محمد بیگ کی "اولڈ کیوراسٹی شاپ" میں بیٹھے گرم گرم قہوہ پی رہے تھے اور بیگ صاحب کسی بدھ بھکشو کی طرح سیدھی کمر کے ساتھ ہاتھ گود میں رکھے ہمیں دیکھ رہے تھے۔

"تو آپ شمشال جائیں گے یا چپورسان؟" بیگ صاحب نے پُرسش کی۔

"بیگ صاحب ہم پہلی مرتبہ ان علاقوں میں آئے ہیں آپ ہمیں شمشال یا چپورسان جیسی دور افتادہ قراقرمی وادیوں کی جانب پلیز مت روانہ کریں، فی الحال ہنزہ جانے والی کسی ویگن پر بٹھا دیجئے"

"اچھا اچھا ہنزہ کے لئے دو تین ویگنیں جاتی ہیں صبح صبح ــــ اور وہ جا چکی ہیں ــــ غالباً آپ خنجراب کیوں نہیں چلے جاتے جیپ کے ذریعے، واپسی پر ہنزہ میں اُتر جائیے گا"

"کیوں بھئی سلجوق ــــ" میں نے سلجوق کی طرف دیکھا جو ناک چڑھائے پتہ نہیں کیا سونگھ رہا تھا "خنجراب جانا ہے؟"

اس نے فی الفور سیاحتی کتابچہ نکالا "درّہ خنجراب چین کی سرحد پر واقع، سطح سمندر سے بلندی پندرہ ہزار فٹ، شدید سرد علاقہ۔ ادھیڑ عمر کے

سیاحوں کے لئے موزوں نہیں کیونکہ بلندی کی وجہ سے آکسیجن کم ہے اور سانس لینے میں دشواری پیدا ہو سکتی ہے ـــــ میں تو جا سکتا ہوں ابو آپ دیکھ لیں۔"

" سلجوق میاں،" میں نے اس کی پیٹھ تھپکی "میں درمیانی عمر کے قریب ہوں اور ادھیڑ عمر تو ہرگز نہیں ہوں سمجھے آپ ـــــ جی بیگ صاحب آپ جیپ کا بندوبست کر دیں"

بیگ صاحب نے سر ہلا کر "اچھا اچھا" کیا اور پھر بازار میں ٹہلتے ایک حضرت کو مقامی زبان میں کچھ کہا اور وہ اندر آ گئے "ان کو خنجراب لے جاؤ اپنی جیپ پر" بیگ صاحب خنجراب کے لفظ کو خن جراب ادا کرتے۔

" چلو صاحب" اُن صاحب نے فوراً کہا۔

"پوچھنا تو نہیں چاہیئے لیکن کرایہ کیا ہو گا؟"

"آج رات گل مِت میں گذاریں گے۔ کل صبح خنجراب اور شام کو ہم آپ کو واپس کریم آباد میں اُتار دیں گے ـــــ"

"اور کرایہ؟"

" دو ہزار روپے"

" میرا خیال ہے کہ میں ایک ادھیڑ عمر سیاح ہوں اور خنجراب پہنچ کر میرا دم نکل جائے گا اس لئے شکریہ!" وہ حضرت مسکراتے ہوئے باہر چلے گئے۔

"خن جراب کے لئے یہ کرایہ بہت مناسب ہے!" بیگ صاحب اپنے سنہری چشمے کو سنبھالتے ہوئے بولے۔

"یہ کرایہ تو پیکنگ تک کے لئے بھی مناسب نہیں ہے بہر حال آپ ہمیں فی الحال ہنزہ بھجوا دیجئے"

"تو پھر انتظار کیجئے شاید کوئی آ جائے ـــــ" انہوں نے اپنے ملازم کو

کچھ ہدایات دیں اور وہ دکان سے باہر نکل گیا۔

ہم انتظار کرنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد سلجوق نے پھر ناک اُٹھا کر اِدھر اُدھر سونگھا اور اپنے تئیں بے حد آہستہ مگر فی الحقیقت خاصی بلند آواز میں کہنے لگا "ابو مجھے بکرے کی بُو آ رہی ہے"

بیگ صاحب جو ایک غیر ملکی گاہک کو شمالی علاقوں کا تفصیلی نقشہ دکھا رہے تھے۔ پلٹ کر بولے "سلجوق صاحب یہ بکرے کی بُو نہیں یاک کی ہے اُس نمدے میں سے آ رہی ہے جس پر آپ بیٹھے ہوئے ہیں اور یہ یاک کے بالوں کا بنا ہوا ہے"

سلجوق اُچھل پڑا "یاک؟ —— ابو ان سے پوچھیں کہ ان کے پاس یاک کی دُم ہے"

"کیوں بیگ صاحب آپ کے پاس یاک کی دُم ہے؟"

"غاں —— یاک کی دُم؟"

"جی ہاں ان کی امی نے کہا تھا کہ گلگت میں ملتی ہے"

"اچھا اچھا ——" بیگ صاحب مسکرائے "یاک تو ان دنوں یہاں نہیں ہوتے۔ وہ گرمی برداشت نہیں کر سکتے اس لئے انہیں پندرہ ہزار فٹ کی بلندی سے اُوپر آرام کرنے کے لئے بھیج دیا جاتا ہے کسی رکھوالے کے ساتھ —— سردیوں میں ہوتے ہیں"

"بیگ صاحب" میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا "پورا یاک نہیں چاہیئے صرف اُس کی دم درکار ہے"

"ابو" سلجوق ایک دم ہڑبڑا کر بولا "نہیں نہیں میرا خیال ہے امی نے

یاک کی دم کے بارے میں نہیں کہا تھا، مارخور کی دُم کی فرمائش کی تھی،،

"مارخور بھی صرف بلند اور برفیلی چٹانوں کے درمیان رہتے ہیں،، بیگ صاحب چونکہ شمالی علاقوں کے جانوروں کے ایکسپرٹ بھی مانے جاتے تھے اور "سٹونز اِن سائلنس،، کے مصنف کے ہمراہ درندوں پرندوں اور بکروں وغیرہ کی تلاش میں پورا علاقہ چھان چکے تھے اس لئے مارخور اور یاک وغیرہ کے ذکر سے بے حد خوش ہوئے۔

"اچھا تو دُم نہیں مل سکتی؟"

"مل سکتی ہے ــــ،، بیگ صاحب ذرا شریر ہو گئے،، اگر آپ خنجراب چلے جائیں تو ہو سکتا ہے وہاں کوئی یاک یا مارخور وغیرہ چہل قدمی کرتا ہوا مل جائے اور پھر سلجوق صاحب اس کی دم کاٹ لیں ــــ قینچی کے ساتھ"

"دو ہزار روپے میں ایک دُم قدرے مہنگا سودا ہے۔ آپ ہمیں ہُنزہ بھجوا دیں"

"اور میرے پاس قینچی بھی نہیں ہے،، سلجوق مسکرایا۔

"تو پھر آپ انتظار کیجئے شاید کوئی ویگن آجائے"

ہم انتظار کرنے لگے۔

پچھلی شام پولو گراونڈ سے واپسی پر جب ہم "چنار اِن،، کے ڈائننگ روم میں داخل ہوئے تو وہاں ہُو کا عالم تھا۔ تمام غیر ملکی سیّاح جا چکے تھے۔ ہم دونوں ہال کی وسعتوں میں گُم چپ چاپ کھانا کھاتے رہے۔ سلجوق کی چُھری گوشت پر سے پھسل کر پلیٹ پر جا لگتی تو قریب کھڑا بوڑھا ویٹر بھی چونک جاتا۔ بجلی جا چکی تھی اور صرف ہماری خاطر میز پر ایک موم بتی جلائی گئی تھی جو اب اپنے پھڑ پھڑاتے انجام تک پہنچ رہی تھی ــــ ویٹر ایک

بے دانت مسکراہٹ سے اپنی بوریت چھپانے کی کوشش کرتا۔
"صاحب آپ جلدی جلدی کھانا کھالو ـــــ موم بتی بس یہی ہے۔"
"چنار اِن" کسی آسیب زدہ مینشن کی طرح ویران پڑا تھا۔
ہم کمرے میں آکر لیٹ گئے۔
رات کے کسی پہر سلجوق نے مجھے جھنجھوڑا۔ "ابو یہ کیا آواز ہے؟"
میں نے خوابیدہ حسیات کو جھنجھوڑ کر سننے کی کوشش کی "شاید کتے رو رہے ہیں"
"بھیڑیے تو نہیں ہیں؟" اُس کی آنکھیں خوف سے پھیل رہی تھیں۔
"نہیں ـــــ میرا خیال ہے کہ نہیں ـــــ تم میرے پاس آجاؤ"
"شکریہ ابو" اور وہ غڑاپ سے میرے بستر میں گھس کر مزے سے خراٹے لینے لگا۔

درمیانی عمر کے کھلاڑیوں ایسے چاق و چوبند جسم کے حامل ایک صاحب دکان کے اندر داخل ہوئے اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ بھی سرخ و سفید تھے اور بیگ صاحب سے لپٹ گئے۔ کچھ گفتگو مقامی زبان میں ہوئی اور پھر بیگ صاحب مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے "یہ حسنات ہیں۔ سُوست جا رہے ہیں آپ کو بھی لے جائیں گے"

"سُوست؟ ـــــ یہ سُوست کہاں ہے؟"
"پھسو سے آگے، خنجراب کے قریب"
"لیکن ہم تو ہنزہ جانا چاہتے ہیں"
"اچھا اچھا لیکن تارڑ صاحب آپ صرف ہنزہ بولتے ہو۔ ہنزہ تو پورے علاقے کا نام ہے۔ ہنزہ میں کہاں جانا ہے ـــــ علی آباد، کریم آباد

گنیش، علتت، گل مت ــــ کہاں؟"

"اِن میں سے سب سے زیادہ ہنزہ کہاں ہوتا ہے؟"

"حسنات اور بیگ صاحب میرے اس احمقانہ سوال پر مُسکرانے لگے۔
تب میں نے اپنے سیکرٹری یعنی سلجوق سے مدد چاہی "کیوں بھئی کہاں جانا ہے؟"
اس نے سیاحتی کتابچہ کھول کر چیک کیا "کریم آباد جس کا پرانا نام بلتت ہے
اور ہنزہ کا صدر مقام ہے"

"تو ٹھیک ہو گیا" حسنات پہلی مرتبہ مجھ سے مخاطب ہوا "میں آپ
کو گنیش میں اُتار دوں گا"

"اور وہاں سے ہم کریم آباد کیسے پہنچیں گے؟" میں کچھ اُلجھ گیا۔

"وہ گنیش سے ایک سڑک جاتی ہے اُوپر تک ــــ صرف دو کلو میٹر کا فاصلہ
ہے، پیدل چلے جائیے گا ــــ آئیے"

ہم نے اپنا رک سیک اُٹھایا اور بیگ صاحب سے واپسی پر ملاقات کا وعدہ
کر کے حسنات کے ہمراہ بازار میں آ گئے۔ ہمارا خیال تھا کہ وہاں کوئی مخدوش قسم کی
چھوٹی موٹی جیپ یا کھڑکھڑاتی ویگن نما کوئی شے ہوگی لیکن جس سواری پر ہمارا
سامان رکھا گیا وہ ایک نئی نکور اپلائڈ فار ٹیوٹا کوسٹر تھی اور حسنات جسے ہم اب تک
ڈرائیور سمجھ رہے تھے اس کوسٹر کا مالک تھا۔ شمالی علاقوں میں ایک بہت
بڑی قباحت یہ ہے کہ وہاں لباس کو دیکھ کر انسان کی سماجی یا معاشی حالت کا کچھ
اندازہ نہیں ہوتا، سبھی انسان لگتے ہیں اور ادھر ہماری طرف بے حد آسانی ہے، مزدور،
کلرک، افسر، ادیب، سرمایہ دار دور سے ہی اپنے لباس سے پہچانے جاتے ہیں اور
آپ اُن کی "حیثیت" کے مطابق ان سے برتاؤ کرتے ہیں ــــ

حسنات نے سٹیئرنگ سنبھالا اور گلگت کے بازار کا ایک چکر لگایا۔ وہ

مختلف دکانداروں اور راہگیروں کے ساتھ بڑی بے تکلفی اور اپنائیت سے گفتگو کرتا، کبھی کسی کی پوٹلی اُٹھا کر ویگن میں رکھ لیتا، کبھی کسی دکاندار کے گھی کے ڈبے چھت پر رکھوانے لگتا، بچوں کے کھلونے، نمک کے ڈھیلے، اخبار، موسیقی کی کیسٹیں اور بے شمار چھوٹی چھوٹی چیزیں جو راستے میں لوگوں کے گھروں تک پہنچانی تھیں۔

بازار کے تین چار پھیروں کے بعد میں نے پوچھا میں نے پوچھا حسنات بھائی روانگی کب ہو گی؟"

"ہو جائے گی" اُس نے اطمینان سے کہا۔

" مال بنا رہے ہو؟"

" مال؟"

"ظاہر ہے یہ اشیا لوگوں کے گھروں تک پہنچاؤ گے تو اُن سے کرائے کی رقم وصول کرو گے"

"نہیں" اس نے سر ہلایا "اِدھر گلگت میں وادی ہنزہ کے بہت لوگ رہتے ہیں کام کاج کے سلسلے میں، انہوں نے اپنے گھروں کو چھوٹی چھوٹی چیزیں بھیجنا ہوتی ہیں۔۔۔۔۔ ویگن خالی جا رہی ہے میں لے جاؤں گا۔۔۔ کرائے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور پھر یہ میرے رشتے دار ہیں جناب"

"سارے کے سارے؟"

"ہاں سارے کے سارے۔۔۔۔۔ اپنے وطن کے ہیں تو رشتے دار ہی ہوئے"

گلگت کے بازار میں ایک گھنٹے کے سیر سپاٹے کے بعد ہماری روانگی ہو ہی گئی۔

شہر سے باہر آئے، ایئرپورٹ کے قریب سے گذرے اور پھر دریائے

گلگت کا پُل عبور کرنے کے بعد ہم وادیٔ گلگت کے عین سامنے آگئے اور اِس کے متوازی چلنے لگے۔ اب ہمارے اور گلگت کے درمیان دریا کا چوڑا پاٹ تھا اور سڑک ٹیلا نما چٹانوں میں اُٹھتی بیٹھتی سیدھی چلی جا رہی تھی۔ ویگن میں ہمارے علاوہ صرف تین چار مسافر تھے اس لئے ہم پاؤں پھیلائے جاپانیوں کی بنائی ہوئی راحت کے مزے لیتے اس کے نئے انجن کی ہلکی سی گونج میں گم باہر دیکھے چلے جا رہے تھے۔

"آگے دَنیور ہے" حسنات نے سلجوق سے مخاطب ہو کر کہا جو اگلی نشست پر بیٹھا ایک لداخی خدوخال والے شخص کے ساتھ باتیں کر رہا تھا" اور اس موڑ کے بعد ہمیں نانگا پربت دکھائی دے گی"

میں بھی ہوشیار ہو کر بیٹھ گیا اور کیمرے کا اپرچر سیٹ کرنے لگا۔

اُس موڑ کے بعد صرف بادل دکھائی دیئے جو نانگا پربت کے گرد ایک سفید حصار بنائے جیسے سدا سے معلق تھے۔

"یہ کیسی "ننگی چوٹی" ہے جو ہر وقت پوشیدہ رہتی ہے، شائد نام کی وجہ سے شرمیلی ہے اس لئے —" میں نے پتہ نہیں کس سے مخاطب ہو کر کہا۔

"نانگا پربت کی بلندی کتنی ہے ابو؟"

"پتہ نہیں"

لداخی خدوخال والے شخص نے پیچھے مڑ کر دیکھا" صاحب نانگا پربت ۲۶،۶۶۰ فٹ بلند ہے" اور پھر سیدھا ہو کر سامنے دیکھنے لگا۔

ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم سڑک کے کنارے جھانکتے ہوئے ایک پُر فضا باغ میں رُکے، جہاں سیب کے درختوں تلے ایک چھوٹی سی آبشار تھی جس کا پانی شور مچاتا ہوا چھوٹی چھوٹی نالیوں میں تقسیم ہو کر کھیتوں میں

اُتر رہا تھا۔ تنور گرم تھا اور تازہ روٹیوں کی باس سُرخ سیبوں کی مہک لئے ہوئے ہم تک آتی تھی۔ آبشار کے عین نیچے چٹان میں تراشے ہوئے ایک کمرے میں کوئی شخص کسی جانور کی ران کا گوشت کلہاڑے کی مدد سے کاٹ کاٹ کر ڈھیر کر رہا تھا۔ قریب ہی ایک میز پر سفید ترش انگوروں کے گچھے پلاسٹک کے تھیلوں میں لپٹے رکھے تھے۔ چند مسافروں نے انگوروں کی خریداری کی۔ ہم سیبوں سے لدے ہوئے درختوں تلے رکھے لکڑی کے بینچوں پر بیٹھ گئے اور کھانا کھانے لگے، شوربہ گوشت اور تنور سے نکلتی ہوئی نشہ آور گرم گندم —— آبشار کی وجہ سے شور بہت تھا۔ تنور پر کام کرنے والے لڑکے میز پر سے تام چینی کا جگ اُٹھاتے اور آبشار کے پانی سے بھر کر ہمارے سامنے رکھ دیتے۔ گلگت کی نسبت یہاں کی ہوا مختلف تھی، سیبوں کی خوشبو میں رچی ہوئی، چٹان میں سے گرتے پانی سے نم آلود اور درختوں کی چھاؤں کی وجہ سے قدرے خنک مگر خوشگوار۔

آبشار کا پانی میرے گلے میں ایک آبشار کی صورت گرتا تھا اور اُسے ٹھنڈا کرتا تھا، ہوا کی خُنک سرسراہٹ تھی اور سیب کے درختوں کے سائے میں بیٹھے چند مسافر تھے جو اس عارضی کارواں سرائے میں اگرچہ چند لمحوں کے لئے رُکے تھے لیکن دل میں حسرت قیام رکھتے تھے اور یہ حسرت نہ دنیا کے لئے پوری ہوتی ہے اور نہ ایسے مقامات کے لئے جو مسافروں کے راستے میں آکر انہیں ترک مسافت کی ترغیب دیتے ہیں —— تہران سے کیسپئن سمندر کے راستے میں مازندران کے جنگلوں کے آس پاس میں نے اور سُکھدیپ نے بھی اسی قسم کی ایک دنیا میں عارضی قیام کیا تھا۔ وہاں دریا کے پانیوں کا شور قریب تھا، سیب کے درخت تھے اور اُن کے نیچے ایک تالاب میں مچھلیاں تیر

رہی تھیں اور ہوا میں خنکی تھی اور ہم مسافر تھے اور حسرتِ قیام رکھتے تھے —— وہ مقام گم ہوا اور اس کی یاد بھی دھندلائی اور اسی طور یہ مقام بھی گم ہو گا اور اِس کی یاد گوالمنڈی کی تپتی دوپہروں میں دھندلائے گی —— ہسپانیہ کے ساحلی قصبے سان سباستیان کی گرم شام گمشدہ —— ہرات کا طلوعِ آفتاب گمشدہ —— ایجیئن سمندروں میں تیرتی تتلی کشتی گمشدہ —— ثوریا گمشدہ —— لیکن گُم وہی چیزیں ہوتی ہیں جو چاہے عارضی طور پر ہی سہی انسان کی گرفت میں ایک مرتبہ تو آتی ہیں —— بے شمار لوگ ہوں گے جن کے پاس تو گُم کرنے کے لئے بھی کچھ نہیں ہوتا ——

شاخوں سے لٹکتے سیب جیسے آبشار کے شور سے جھُول رہے تھے۔

مسافر کھانے سے فارغ ہو کر چائے پینے لگے۔

"آپ بھی انگور خرید لو صاحب، آگے نہیں ملیں گے" لداخی خدوخال والا شخص ویگن میں بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔

"اُدھر آپ کے ہنزہ میں انگور نہیں ہوتے؟"

"میں پھسّو، گوجال کا رہنے والا ہوں" اُس نے قدرے ناراضگی سے جواب دیا۔

"ابو دیکھیں وہ آدمی آبشار کے نیچے چٹان کے اندر گوشت سٹور کر رہا ہے" سلجوق کہنے لگا۔

"بیٹے آپ کے ہاں فرج ہوتے ہیں اور ہم اپنی خود اک آبشاروں اور ندیوں کے قریب سٹور کرتے ہیں" حسنات نے ویگن سٹارٹ کرتے ہوئے اسے بتایا۔ "اور ویسے بھی یہ آدمی ہنزہ کا واحد قصائی ہے"

"ہنزہ کا؟ تو کیا ہم ہنزہ میں ہیں؟"

"نہیں" اس نے گیئر بدلا "جب ہم ہنزہ میں ہوں گے تو اُدھر کی ہوا بتائے گی کہ آپ وہاں ہو"

اُس پر فضا مقام سے چند کوس کے فاصلے پر راستے نے یکدم اپنے تیور بدلنے شروع کر دیئے۔ سڑک کی سیدھی اور پُرسکون کیفیت بے سکون اور بلند ہونے لگی۔ دریا کا شور ہم سے بہت نیچے چلا گیا اور دوسری جانب چٹانیں اونچی ہوتی چلی گئیں اور ہم نے گلگت سے روانگی کے بعد پہلی مرتبہ اپنی نشستوں کو مضبوطی سے پکڑنے کے لئے ٹٹولا۔ ویگن جیسے بے وزن ہو کر اُوپر ہی اُوپر اٹھتی چلی گئی اور سارے منظر ڈوبنے لگے۔ جہاں کہیں سڑک کا کوئی بہت ہی پُرخطر حصّہ شروع ہوتا وہاں "ہوشیار، حادثے کی جگہ" کا بورڈ نظر آتا اور جب ہم اس حصّے کو عبور کر جاتے تو اختتام پر "اب گاڑی آرام سے چلائیے" کی خوشخبری لکھی دکھائی دیتی —— یہ ہنزہ روڈ کا آغاز تھا جس کے بارے میں ایک سو برس پیشتر بڈلف نے لکھا تھا کہ ——

"یہاں پر دریا بالکل سیدھی چٹانوں کے درمیان میں بہتا ہے۔ ان چٹانوں پر صرف وہی مسافر ہنزہ کی جانب سفر کر سکتا ہے جو ایک بکرے کی طرح ان کے ساتھ چمٹ کر قدم اٹھا سکے۔ میں نے ۱۸۷۶ء میں پورے ہمالیہ میں اس سے مشکل اور خطرناک راستہ نہیں دیکھا"

قابلِ فہم طور پر شاہراہِ ریشم کی غیر موجودگی میں ہنزہ روڈ ایک چھوٹا سا پہاڑی راستہ تھا جو دریا کے عین اوپر چٹانوں میں پچک کر چلتا تھا اور اُس پر مسافر چلتے نہیں تھے بلکہ چمٹ کر دھیرے دھیرے رینگتے تھے۔ ہنزہ تک کا یہ راستہ اتنا دشوار اور خوفناک تھا کہ اس پر صرف مقامی لوگ ہی توازن برقرار رکھ کر چل سکتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ یہاں پر بڑی آسانی سے دشمن

کو روک دیا جاتا تھا۔ چنانچہ ہنزہ ایک عرصے تک باہر کی دنیا سے بالکل الگ تھلگ رہا اور ایک برفانی تنہائی میں اپنی تہذیب اور معصومیت کو برقرار رکھے رہا۔ دوسری جانب کلک، منتیکا، خنجراب اور شمشال کے تقریباً ناقابلِ عبور درّے تھے اور اُن سے پرے چین تھا اور اُن دنوں گراں خواب اور ویران تھا۔ اہلِ ہنزہ اگر اپنی وادی سے نکلتے تو چین کی طرف جاتے، گلگت کا رُخ بہت کم کرتے۔

اس مقام پر دریائے گلگت، دریائے ہنزہ میں بدل چکا تھا اور اس میں بڑی بڑی چٹانیں گہری گونج تخلیق کرتیں کنکریوں کی طرح بہہ رہی تھیں۔ رنگ بھی مٹیالا ہو چکا تھا —— یہ بتورا، پھسو اور حسن آباد کے گلیشیئر تھے جو چلے آتے تھے اور شمشال اور راکاپوشی کے پانی تھے جو ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ بہتے چلے آ رہے تھے۔ دریا کے پار چٹانوں میں اُس قدیم اور خوفناک راستے کے آثار ایک لکیر کی صورت نظر آ رہے تھے جو کسی زمانے میں ہنزہ روڈ کہلاتا تھا۔ حسنات نے بتایا کہ یہ راستہ اب بھی استعمال کیا جاتا ہے اور دور افتادہ پہاڑی بستیوں کے باشندے اس پر سفر کرتے رہتے ہیں اور اُسی لمحے ہم نے دیکھا کہ چیونٹی کے حجم کے دو سائے دریا کی سطح سے تقریباً ایک کلومیٹر کی بلندی پر جھکی ہوئی چٹانوں میں رینگ رہے ہیں۔

حسنات بل کھاتی ہوئی سیاہ سڑک کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے کسی سیاہ ناگ کو خوفزدہ جانور ایک ہپنوٹائزڈ ٹرانس میں پلکیں جھپکے بغیر دم سادھے دیکھتا جاتا ہے۔ اُس کے بدن کی تمام تر احتیاط اس کی اُنگلیوں میں منتقل ہو کر سٹیئرنگ کو سنبھال رہی تھی۔ اگرچہ ہمارے گرد کھڑی چٹانیں اب بُلند ہو کر آسمان ہو رہی تھیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اُن میں دہشت نہیں

تھی بلکہ رفاقت تھی جیسے ہم اُن کا ایک حصہ ہوں اور وہ ہمیں اپنے ہمراہ لے کر بلند ہو رہی ہوں۔



سفید معبد، سفید پوشی راکاپوشی

"صاحب راکاپوشی" لداخی خدوخال والے شخص نے مڑ کر کہا۔

میں نے کھڑکی کے ساتھ لگ کر باہر دیکھا۔

وہاں نیم سُرخ چٹانوں کی دیواریں تیزی سے گذر رہی تھیں اور گذرتی گئیں۔ پھر یکدم اُن میں ایک بڑی دراڑ نمودار ہوئی اور اس وسیع دراڑ کے عین اُوپر جیسے اُسی لمحے سفید دودھ سفید برف سے بنا ہوا ایک شہر نظر آیا۔ وہ بے یقینی تھی جس نے میرا سر جھٹکا اور فریب کا خدشہ تھا جس نے میری آنکھیں جھپکیں ــــ برف کی یہ بستی جو عین میرے سر کے اُوپر جھانک رہی ہے پہلے تو یہاں نہیں تھی، ابھی وجود میں آئی ہے۔ اگر اس کا وجود شروع سے ہے تو میں نے اس کو دیکھ لیا ہوتا۔ ایک بڑی چٹان تیزی سے سامنے آئی اور شہر سفید کو گم کر دیا۔

"ابو" سلجوق کے معصوم چہرے پر میں نے راکاپوشی کے حسن کو منکشف ہوتے دیکھا اور اس کے مسرت سے دمکتے ہوئے نقوش نے کہا "ابو ــــ آپ نے دیکھا؟" اُسی لمحے چٹانیں پھر سے پیچھے رہ گئیں اور راکاپوشی آگے آنے لگی۔ بڑی آہستگی سے، خاموشی سے جیسے وہ آپ کو مرعوب کرنے کے لئے

مسلط ہونے کے لئے آگے نہیں آ رہی بلکہ آپ پر آہستہ آہستہ وارد ہونا چاہتی ہے، اُترنا چاہتی ہے۔ حیرت، بے یقینی اور گہری مسرت کی وہ سطح جس پر آج تک میرے سانس نہیں پھیلے تھے میرے بدن میں سنسناہٹ پھیلا رہی تھی۔ راولپنڈی سے یہاں تک میں نے سفر کیا تھا اور اذیت اور دہشت نے مجھ میں گھر بنایا تھا لیکن راکاپوشی کی سفید جھلمل جھلمل کرتی برفوں پر ایک نظر اور میں آزاد ہو چکا تھا اُن سب دہشتوں اور اذیتوں سے ہلکا، نوجوان اور معصوم ہو چکا تھا۔ شائد زندگی میں پہلی مرتبہ میرے جسم کی حسیات مجھ سے مکمل طور پر الگ ہوئیں اور وہ سانس جسے رُوح کہتے ہیں راکاپوشی کو دیکھتے ہوئے اُسی کی بلندی پر پہنچ کر اُسی کی برفوں پر اپنے لب رکھ کر پُرسکون ہوئی۔ میں یہاں نہیں وہاں تھا۔ مجھ میں جدائی ختم تھی اور وصال کی ٹھنڈک پھیلتی تھی ـــــ طویل مسافتوں کی تھکاوٹ چند روز میں زائل ہو جاتی ہے۔ لیکن مہہ و سال کے گذرنے سے جو مسافت وجود میں آتی ہے اُس کی تھکاوٹ صرف مٹی میں پنہاں ہو کر ہی ختم ہوتی ہے لیکن نہیں صرف مٹی میں پنہاں ہو کر ہی نہیں۔ راکاپوشی کو دیکھ کر میری وہ تھکاوٹ بھی تمام ہوئی جو عمر عزیز کے پینتالیس برس کی مسافت کے نتیجے میں مجھے آہستہ اور کمزور کر رہی تھی ـــــ راکاپوشی کا برفانی شہر اور میں اس پہاڑ کو شہر اس لئے کہتا ہوں کہ اس پر گمان ہوتا ہے ایک سفید شہر کا ـــــ یہ سدا سے آباد تھا اور قدرت کی طرف سے انسان کے دُکھ اور تھکاوٹیں یکسر معدوم کر دینے پر قادر تھا۔

کہتے ہیں کہ جو پہاڑوں سے پیار کرتا ہے اور اُن کی کشش کو اپنے اندر سمو لیتا ہے وہ ہمیشہ کے لئے ایک متلاشی رُوح بن جاتا ہے ـــــ ہمالیہ کی بلندیوں پر دیوتاؤں کو دیکھتا ہے۔ ملونٹ اولپس پر جاتا ہے۔ ہندوکش کی ازلی برفوں میں

اپنے خدا تلاش کرتا ہے ــــــ نوح کی کشتی بھی بالآخر کوہِ ارارات پر جا ٹھہرتی ہے ۔ حضور صلعم بھی غارِ حرا میں روشنی پاتے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کوہِ طور پر جاتے ہیں اور ہم کلام ہوتے ہیں ــــــ اور اس تلاش کا سلسلہ ہر انسان کے اندر چلتا رہتا ہے ۔ فرق صرف یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کوہِ طور پر چڑھنے کی جرأت کر لیتے ہیں اور ہم ایسے حقیر راکاپوشی کو صرف دیکھتے رہتے ہیں۔ ہاں یہ ہے اور میں قطعی طور پر مبالغہ نہیں کر رہا کہ میں نے جس لمحے راکاپوشی کو دیکھا اُس سے پیشتر میں جتنا بھی تھا اُسے دیکھنے کے بعد بلند ہو گیا، بڑا ہو گیا اور اب کبھی اتنا نہیں ہو سکتا جتنا کہ پہلے تھا۔

"کیوں بھئی سلجوق راکاپوشی پسند آئی ؟"

"اوہ ابّو" وہ سر ہلا کر بولا "یہ کتنی قریب لگ رہی ہے۔ بس پیسے پورے ہو گئے"

اب راکاپوشی کے سفید معبد کے آگے سر سبز کھیت زینہ بہ زینہ دریا تک اُتر رہے تھے ۔

"اِس کی بلندی کیا ہے ابّو ؟"

" ۲۵۵۵۱ فٹ"۔ لدّاخی خدوخال والا شخص یکدم بولا۔

ایک چٹانی سلسلہ ویگن کے ساتھ ساتھ حرکت کرنے لگا اور راکاپوشی اُس کے پیچھے گم ہو گئی ۔

میں خاموش بیٹھا انتظار کرتا رہا ۔ تیرا آنا خواب میں آنا اور میں عبث انتظار میں بیٹھا ــــــ راکاپوشی فی الحال روپوش ہو چکی تھی ۔

آہستہ آہستہ چٹانیں ہٹنے لگیں اور دریا کا پاٹ چوڑا ہونے لگا ۔ ہم نیچے اُترتے گئے اور دریا کے شور کے قریب آ گئے ۔ پھر ایک پُل کے پار جا

کر دوسری جانب سفر کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد چٹانوں کے بنجر پن میں سبزے کے دھبے دکھائی دینے لگے اور پھر یہ دھبے پھیلتے گئے اور تب یہ دریائے ہنزہ کے آس پاس کھڑے پاپلر کے درخت تھے، سیبوں کے باغ تھے اور ہرے بھرے کھیت تھے اور تہ در تہ تھے۔ اسی لمحے ہوا میں ایک خنک اور اداس مہک آئی اور حسنات نے مسکرا کر میری جانب دیکھا۔

ہُنزہ کی وادی قراقرم کی ویران بلندیوں پر ایک ہرے بھرے بادل کی طرح پھیلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ دریا کے چوڑے پاٹ کے دونوں جانب چٹانوں کی بلند دیواریں تھیں اور ان پر ہنزہ کی ہریاول پھیلتی تھی اور بلندیوں تک جاتی تھی۔ درخت اور سبزہ زار ہماری طرف کھنچے چلے آتے تھے اور آنکھوں میں اُترتے تھے۔ سکندر آباد، جعفر آباد اور حسن آباد کے بعد ہندی کا پُل آیا۔ ہندی کے گاؤں میں سے گذرتی شاہراہ ریشم پر سیب کے درختوں کی ٹہنیاں جھکی ہوئی تھیں اور چند سیب سڑک پر پڑے ہوئے تھے۔

"حسنات بھائی ادھر گلگت میں بیگ صاحب نے بتایا تھا کہ اِدھر ہندی سکول کے نیچے دریائے ہنزہ کے کنارے گارنیٹ کے قیمتی پتھر بکھرے ہوئے ملتے ہیں ——— کیا خیال ہے تھوڑی دیر کے لئے رُک جائیں؟"

"حسنات نے گھڑی پر نگاہ ڈالی "ہمیں شام سے پہلے سوست پہنچنا ہے اور اِدھر کا گارنیٹ اتنی اچھی کوالٹی کا نہیں ہوتا"

"ابو" سلجوق کی آنکھیں چمک اُٹھیں "دریا کے کنارے قیمتی پتھر ——— یعنی ہیرے، جواہرات وغیرہ بکھرے ہوتے ہیں" اس کے اندر "خزانے کی تلاش" والا ہر بچہ بولا "ابو یہیں اُتر جاتے ہیں"

"بیٹے گارنیٹ سُرخ رنگ کا پتھر ہوتا ہے جسے یاقوت بھی کہتے ہیں۔ واپسی پر اُتریں گے اور جھولیاں بھر کے لے جائیں گے"

"سچ ابو؟ اور پھر ہم انہیں بیچ کر ایک بڑا موٹر سائیکل خرید لیں گے اور اگلے برس اُس پر بیٹھ کر ہنزہ آئیں گے"

"وعدہ رہا" میں ہنسنے لگا۔

رہندی کے بعد آبادی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ انسان کا مختصر وجود قراقرم کی بلندیوں میں ہیلچہ تھامے رزق کو تلاش کر رہا تھا جو اُسے ملتا تھا کیڑے کو پتھر میں رزق ملتا ہے اور انسان پتھر میں سے رزق نکالتا تھا۔

راکاپوشی اب پوشیدہ نہیں تھی لیکن قدرے دور جا چکی تھی اور اب اُس کے پہلو میں سے ایک اور برفپوش چوٹی نے سر اُٹھا لیا تھا اور یہ دومانے تھی جو راکاپوشی کی بہن کہلاتی ہے۔ پھر ماربل پیک بھی نظر آنے لگی۔

راکاپوشی۔ دومانے اور ماربل پیک پہلو بہ پہلو چلنے لگیں۔

اس سے پیشتر میں نے بہت سے پہاڑی سلسلے دیکھے تھے۔ برفپوش پہاڑ دیکھے تھے۔ لیکن یہ پہاڑ جو ہمارے اِردگرد سر اُٹھائے کھڑے تھے ایک مختلف مزاج رکھتے تھے، بلند مزاج اور جیسے آپ کے بس سے باہر ہوتے ہوئے، انسان سے اوپر، خدا کے نزدیک اور دونوں کے درمیان پُل کا کام دیتے ہوئے۔ انسان سے الگ اور بلند بھی اور اُس کے ساتھ آسمانوں کا رابطہ ملانے ہوئے بھی۔

دریائے ہنزہ کی تندی اب آرام سے تھی۔ ہموار سطح پر سورج کی روشنی تھی۔ بائیں جانب جس سڑک پر ہم سفر کر رہے تھے وادیٔ ہنزہ کا سرِ فلک علاقہ اور دائیں طرف دریا کے پار نگر کی ریاست جو ابھی سے نیم تاریک ہو

رہی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک ہی آب و ہوا میں رہنے اور ایک ہی نسل سے منتعلق ہونے کے باوجود اہلِ ہنزہ کو اہلِ نگر پر جو برتری حاصل ہے وہ صرف اس وجہ سے ہے کہ ہنزہ کی جانب سورج سارا دن چمکتا ہے۔ جب کہ نگر پہاڑوں کی اوٹ میں واقع ہونے کی وجہ سے نیم تاریک رہتا ہے اور یہ نیم تاریکی نگروالوں کے مزاج میں شامل ہو چکی ہے۔ ہنزہ اور نگر کی ریاستوں کی دشمنی روائتی ہے اور ہمیشہ سے ہے۔ کسی زمانے میں ہنزہ کے میر کے ہاں اگر کوئی خاص مہمان آتا تھا تو میر صاحب اپنے کارندوں کو دریا کے پار بھجواتے تھے کہ جاؤ ایک دو نگری تو لے آؤ اور وہ تیرتے ہوئے دوسرے کنارے پر جاتے اور کسی غریب چرواہے کو اُٹھا لاتے۔ یہ نگری باشندہ مہمان خصوصی کی خدمت میں پیش کر دیا جاتا۔ اکثر اوقات مہمان اس تحفے کو یارقند کی غلاموں کی منڈی میں فروخت کر دیتا اور اُس کے بدلے میں ایک بندوق یا ایک عدد یاک حاصل کر لیتا۔

علی آباد کا قصبہ آیا تو حسنات نے ویگن روک دی "صاحب آپ یہاں اُتریں گے؟"

"میں؟" میں چونک گیا۔ میں اس ویگن کو گھر سمجھ بیٹھا تھا اور اطمینان سے بال بچوں سمیت اس میں آباد ہو چکا تھا۔ مجھے عادت سی ہو گئی تھی کہ یہ چل رہی ہے اور اس کے سامنے منظر بدل رہے ہیں، راکاپوشی، دومانی اور ماربل پیک دکھائی دے رہی ہیں۔ وادیٔ ہنزہ کے کھیت اور اُلتر گلیشیئر قریب آرہے ہیں، دریائے ہنزہ ساتھ ساتھ چل رہا ہے —— اور یہ سب کچھ یکدم ساکت ہو گیا تھا۔

"یہی ہُنزہ ہے ناں؟"

"یہ تو علی آباد ہے صاحب ــــــ یہاں سے اِدھر جو سڑک نکل کر پہاڑ کے اُوپر جا رہی ہے۔ اس کے آخر میں بلتت یا کریم آباد ہے ــــــ آپ چاہتے ہو تو اِدھر اُتر کر اُوپر چلے جاؤ ــــــ"

"نہیں" لدّاخی چہرے والا بولا "حسنات آپ صاحب کو گنیش میں ہی اُتارنا جو بلتت کے عین نیچے ہے وہاں سے اُوپر تک کا فاصلہ نسبتاً کم ہے"

"آپ اُوپر بلتت نہیں جا رہے" میں نے حسنات سے پوچھا۔

"نہیں ہم تو سیدھے جا رہے ہیں شاہراہ ریشم پر"

"تو پھر ٹھیک ہے آپ ہیں ــــــ کیا نام ہے؟"

"گنیش"۔

"ہاں وہیں اُتار دیجئے گا ــــــ وہاں سے کوئی ویگن وغیرہ تو مل جائے گی اُوپر جانے کے لئے؟"

"صاحب آپ دو کلو میٹر تو پیدل چل سکتے ہیں" لدّاخی چہرے والے نے کہا۔

حسنات نے ویگن پھر سٹارٹ کر دی۔

"یہ آپ خاص طور پر سوست کیوں جا رہے ہیں؟" میں نے حسنات سے پوچھا۔

"چینی حاجیوں کو لینے کے لئے"

"چینی حاجی؟" سلجوق نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں صاحب ــــــ ہر سال ہزاروں، چینی، کاشغر، ختن اور یارقند کے راستے درّہ خنجراب تک آتے ہیں اور پاکستان میں داخل ہو جاتے ہیں۔ سوست پہلی کسٹم چوکی ہے"

"ہاں ہاں" سلجوق نے نعرہ لگایا۔ "وہ راجہ صاحب بھی سوست جا رہے تھے۔ انسپکٹری کرنے۔"

"اور پھر آپ انہیں اپنی ویگن میں بٹھا کر گلگت لے جاتے ہیں؟"

"صاحب صرف میری ویگن نہیں ہوتی، بے شمار بسیں بھی ان کو لینے کے لیے پہنچتی ہیں۔ بہرحال ہم انہیں سوست سے اُٹھا کر گلگت لے جاتے ہیں اور وہاں سے شاہراہِ ریشم کے راستے وہ راولپنڈی پہنچتے ہیں۔ پھر اسلام آباد، کراچی اور مکہ مدینہ ——— اور پھر اُسی راستے سے واپسی۔"

"یہ تو بہت ہی طویل پُرخطر اور پُر اذیت راستہ ہے۔"

"نہیں صاحب" حسنات بولا "اُن کے لیے یہ راستہ بالکل طویل نہیں ہے۔ وہ حضور پاکؐ کے بلاوے پر سفر کرتے ہیں اور خوش و خرم سفر کرتے ہیں"

"اور کھانے پینے کا کیا کرتے ہیں؟"

"اُن کے پاس ایک خاص قسم کی چینی روٹی ہوتی ہے جسے وہ گرم قہوے میں بھگو کر کھا لیتے ہیں۔ اس روٹی کی نصف مقدار وہ ساتھ لے جاتے ہیں اور بقیہ گلگت میں چھوڑ جاتے ہیں اور واپسی پر وہیں سے اُٹھا لیتے ہیں تاکہ چین پہنچنے تک خوراک کا بندوبست رہے ——— آپ کھائیں گے، یہ دیکھیے"

اُس نے ڈیش بورڈ میں سے پتھر کی طرح سخت ایک بند نما روٹی کا ٹکڑا نکال کر مجھے دیا ——— میں نے اُسے دانتوں تلے دبا کر بمشکل توڑا لیکن وہ آہستہ آہستہ منہ میں نرم ہو کر گھل گئی۔

"ان چینیوں میں سے کئی واپس نہیں پہنچتے ہوں گے؟"

"ہاں جی ——— لیکن وہ بہت خوش ہوتے ہیں اگر راستے میں کوئی

شخص فوت ہو جاتے ــــــ

وہ کہتے ہیں رسول پاکؐ کے بلاوے پر گیا ہے اس سے بڑی راحت اور کیا ہو سکتی ہے ــــــ"

ہم لوگ ان دنوں یہی کام کرتے ہیں اس وقت سے حاجی بھر کر گلگت لاتے ہیں اور دوسرے روز پھر واپس سُوست ــــــ

"لیکن یہ تو ابھی حج کو جا رہے ہیں ابھی سے حاجی کیسے ہو گئے؟"

"بس نیت باندھ لی تو ہو گئے ــــــ"

"بہر حال حسنات بھائی ثواب کا کام کرتے ہو"

"ثواب کا بھی اور ــــــ منافع کا بھی ــــــ" حسنات ہنسا۔

"یہ سُوست کیسی جگہ ہو گی ابو ــــــ" سلجوق ابھی تک راجہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

"صاحب چھوٹا سا پہاڑی گاؤں ہے۔ جہاں چینی آتے ہیں" لدّاخی پہرے والے نے بڑے پیار سے کہا "لیکن سُوست سے اِدھر میرا گاؤں ہے پھسّو ــــــ دریا کے کنارے اور پھسّو گلیشیئر کے دامن میں، اُرت جھیل کے قریب ــــــ آپ چلو گے؟"

"کیوں ابو؟" سلجوق نے پر اشتیاق لہجے میں پوچھا۔

اُسی لمحے حسنات نے ویگن روک لی "لیجئے صاحب یہ گنیش ہے"

ایک ریتلا راستہ پہاڑ پر بلند ہو رہا تھا اور اس کے آغاز میں "کریم آباد۔ دو کلو میٹر" کا بورڈ آویزاں تھا۔ اُوپر کہیں بلتت اور اُس کا کوہستانی قلعہ تھا۔ متعدد برفپوش چوٹیاں نظروں کو چندھیا رہی تھیں۔ ہوا میں تازگی اور خنکی تھی اور بلندی کے باعث سانس قدرے زور سے کھینچنا پڑتا تھا۔

"تاتارہ کی پہاڑیوں میں میں نے جب ہنزہ کی وادی کو دیکھا تو اِس کو پہاڑوں کی عظمت کی آخری حد دیکھا ـــــ" یہ فقرہ جس کسی یورپی سیّاح نے بھی کہا تھا دُرست کہا تھا ـــ میں اُوپر دیکھتا رہا۔

"صاحب" حسنات نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا "گنیش"ـــ

"ابّو" میں اپنا بیگ اُٹھا کر اُترنے لگا تو سلجوق نے جو لدّاخی چہرے والے ساتھ کھُسر پھُسر کر رہا تھا۔

میرا بازو پکڑ لیا "ابّو پھسو چلتے ہیں۔ یہ کہتے ہیں بڑی زبردست جگہ ہے"۔

"میرا نام ہُنر بیگ ہے صاحب" لدّاخی چہرے نے ملائمت سے کہا۔ "سب لوگ اِدھر کریم آباد آ کر واپس چلے جاتے ہیں، پھسو تک کوئی نہیں جاتا۔ میرا گاؤں ہے صاحب، آپ پسند کریں گے"

"ہم کریم آباد میں چند روز ٹھہرنے کے بعد اُدھر آجائیں گے ہنر بیگ صاحب"۔ میں نے ویگن سے اُترتے ہوئے کہا۔

"صاحب اُدھر کو سواری بہت کم جاتی ہے۔ سبب بنا ہوا ہے اور وہاں سے خنجراب بھی نزدیک ہے"۔

"اُدھر کو سواری بہت کم جاتی ہے تو اُدھر سے سواری آتی بھی کم ہو گی"۔

"اِس کی فکر نہ کریں"۔ حسنات بھی سازش میں ... ہو گیا۔ "میں کل صبح حاجیوں کو لے کر پھسو سے گذروں گا تو آپ کو بٹھا کر یہاں تک لے آؤں گا"

"اُدھر کوئی ہوٹل وغیرہ ہے؟"

"ہے صاحب"۔ ہنر بیگ جلدی سے بولا "اور میرا گھر بھی ہے"

"ابّو ـــ پھسو" سلجوق نے میرے ہاتھ سے بیگ لیا اور ویگن کے

اندر پھینک دیا" دیکھتے ہیں کیسا ہے"

"اچھا ہو گا صاحب ــــ بہت اچھا ــــ چلو حسنات"

گنیش سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر ہم نے دریائے ہنزہ پر معلق ایک دیدہ زیب پل عبور کیا اور ایک مرتبہ پھر دوسرے کنارے پر آ گئے۔ دائیں ہاتھ پر ایک سڑک ریاست نگر اور مشہورِ زمانہ گلیشیئر شیپسر کی جانب جا رہی تھی اور بائیں ہاتھ پر شاہراہِ ریشم کا رُخ چین کی جانب تھا۔ یہیں پر سڑک کے کنارے دریائے ہنزہ کے عین اُوپر بڑی بڑی چٹانوں پر بدھ عہد کی قدیم تحریریں کھُدی ہوئی تھیں۔ دریا کے پار ایک بلند چٹان پر ہُنزہ کے قصبے علتت کا پُرانا قلعہ تھا جو لکڑی، پتھر اور گارے سے بنا ہوا تھا اور پتہ نہیں ابھی تک اتنی بلندی پر کس طرح قائم تھا ــــ ہم وہاں تھوڑی دیر کے لئے رُکے اور اُن چٹانوں کو حیرت سے تکتے رہے جن پر عبارتیں کھودنے والے ہاتھ ہزاروں برسوں سے مٹی ہو چکے ہیں ــــ اور ہم بھی مٹی ہو جائیں گے۔ لیکن یہاں اِس فضا میں ہماری حیرت قائم رہے گی۔

سورج ڈھل رہا تھا اور قراقرم کا سلسلہ کوہ سائے میں آ رہا تھا۔ سڑک بدستور خطرناک اور پیچیدہ تھی لیکن ہم آس پاس کے مناظر میں اس طرح کھوئے ہوئے تھے کہ جیسے سفر ہم نہیں کر رہے بلکہ یہ چٹانیں اور دریا ہمارے سامنے حرکت کر رہے ہیں۔ دریائے ہنزہ پر روشنی بجھنے سے پیشتر بجھی جا رہی تھی اور اُس پر جابجا معلق دیدہ زیب پلوں پر بیٹھے ہوئے چینی شیروں کے سنہری مجسمے مدھم مدھم چمکتے تھے۔ گلگت سے اِدھر کے تمام پُل چینی طرزِ تعمیر کے ہیں اور وہ صرف دریا کو عبور کرنے کے لئے ہی نہیں بنائے گئے بلکہ انسانی ذوق کی تسلی کے لئے بھی بنائے گئے ہیں۔ اُن کی ریلنگ پر بنے ہوئے نقش و نگار اور

چینی مجسمے پوری لینڈ سکیپ میں پتھریلی تصویروں کی طرح آویزاں نظر آتے ہیں۔

"ابو" سلجوق جو بد ستور اگلی نشست پر براجمان تھا یکدم پلٹ کر مجھ سے مخاطب ہوا "یہ ہنر بیگ صاحب نانگا پربت پر گئے تھے!" اور اُس کے چہرے پر وہی خوشی تھی جو راکاپوشی کو دیکھتے ہوئے اس کے گالوں پر دمک رہی تھی۔

"کیا کرنے؟" میں نے بے دھیانی میں پوچھا۔

ہنر بیگ نے پہلو بدل کر رُخ میری جانب کر لیا "صاحب میرا کام ہے پہاڑوں پر جانا ایکسپی ڈیشنز کے ساتھ ــــ میں ہائی پورٹر اور گائڈ ہوں"

"اور ابو یہ کہتے ہیں کہ یہ ہمیں بھی نانگا پربت پر لے جا سکتے ہیں"

"نہیں بیٹے میں نے یہ نہیں کہا کہ میں تمہیں نانگا پربت پر لے جا سکتا ہوں۔ صرف یہ کہا ہے کہ میں آپ کو وہاں تک گائڈ کر سکتا ہوں۔ چوٹی تک تو میں بھی نہیں گیا، صرف بیس کیمپ تک جاتا ہوں ــــ" ہنر بیگ سلجوق کے ساتھ بے حد پُر شفقت تھا۔

"چوٹی پر کیوں نہیں گئے؟"

"صاحب جن لوگوں نے رقم خرچ کی ہوتی ہے وہ اُوپر جاتے ہیں۔ ہم غریب تو اپنے روزگار کے لئے ساتھ ہوتے ہیں، ہمیں تو وہ اُوپر لے کر نہیں جاتے ــــ تین مرتبہ نانگا پربت کو گیا ہوں ــــ دو مرتبہ کے ٹو تک گیا ہوں ــــ"

"کے ٹو؟" سلجوق تو بس اُچھل پڑا "اوہ یو ائے ــــ لاہور واپس جا کر میں اپنے کلاس فیلوز کو بتاؤں گا کہ میں ایک ایسے بندے سے مل کر آیا

ہوں جو نانگا پربت اور کے ٹو پر گیا ہے ــــ"

"اُن پر نہیں سلجوق ــــ وہاں تک" ہنر بیگ نے فوراً کہا لیکن سلجوق کو اس فرق کی پرواہ نہ تھی، وہ صرف ان چوٹیوں کے ناموں سے ہی مسحور ہو رہا تھا۔

"ان کے علاوہ اور کہاں کہاں گئے ہیں آپ؟" میں نے دریافت کیا۔

"ان پہاڑوں میں ــــ اُس نے سر اُٹھا کر قراقرم کو دیکھا" ہر جگہ یہ میرے گھر کی طرح ہیں، راکاپوشی، بتوران، سنگِ مرمر، ہڈن پیک، ملونگدی سر یوکشین گردان اور بہت سی چوٹیوں پر ــــ جہاں روزگار لے جاتا ہے چلا جاتا ہوں ــــ"

شیلش کٹ کے قریب دریائے ہنزہ کا پاٹ پھر پھیل گیا اور اُس کے پس منظر میں ایک عجیب و غریب اور ناقابلِ یقین ساخت کی نوکیلی اور بہت اُونچی چٹانوں کا ایک مجموعہ دکھائی دیا۔

"یہ پھسو کونز ہیں صاحب" ہنر بیگ نے بتایا" ہمارے گاؤں کے عین اُوپر ہیں"

"لیکن ہنر صاحب اُن کی ساخت تو بے حد حیرت انگیز ہے، جیسے بچے ڈرائنگ کرتے ہوئے تکونے پہاڑ بنا دیتے ہیں ویسی ــــ" مجھ میں حیرت بھی تھی اور پریشانی بھی کیونکہ میں نے آج تک اس قسم کی غیر حقیقی فارمیشن نہیں دیکھی تھی۔

"جی صاحب ــــ باہر کے لوگ بھی انہیں دیکھ کر بے حد حیران ہوتے ہیں اور اس پورے علاقے میں ایسی نوکیلی اور آسمان سے باتیں کرتی ہوئی چٹانیں نہیں ہیں"

"پوری دنیا میں نہیں ہیں ہنر بیگ" میرا منہ ابھی تک کھلا ہوا تھا۔ یا خدا تُو نے نارمل قسم کے پہاڑ بناتے بناتے درمیان میں یہ پھسّو کونز کس طرح بنا دیئے ۔۔۔ قراقرم کا سارا بیلنس یہاں پر ختم کر دیا ۔۔۔ یہ حقیقتاً" ایک حیران کُن لینڈ سکیپ تھی اور اس پر سے نظر نہیں ہٹتی تھی ۔۔۔ نیچے دریا پر روشنی کم ہو رہی تھی اور اس کے اُوپر کھڑی پھسّو کونز کی متعدد نوکدار چوٹیوں پر دھوپ اس طرح تھی جیسے انہوں نے سورج کی روشنی میں سے ایک ایک "ڈوبا" لیا اور پھر سیدھی ہو گئیں۔ انہیں ٹاپ ڈن بھی کہا جاتا ہے یعنی جن چٹانوں پر سورج کی آخری شعاعیں پڑتی ہیں۔

ہم گلمت کے قصبے میں سے گذرے تو شام ہونے کو تھی۔ ایک جگہ "لوک ورثہ میوزیم" کا بورڈ نظر آیا۔

"صاحب گُل مت کا مطلب ہوتا ہے پھُولوں کا باغ ۔۔۔ یہاں سے پہاڑوں اور گلیشیئرز کی جانب بہت سے راستے جاتے ہیں ۔۔۔ افغانستان کی جانب ایک درہ کھُلتا ہے"

حسینی کے قریب ہم بلندی سے اُتر آئے اور ایک جگہ دریا کا پانی سڑک پر بہہ رہا تھا اور ہماری ویگن اُس میں سے با آسانی گذر گئی۔

سڑک کے کنارے سے ایک راستہ الگ ہو کر اوپر جا رہا تھا اور ایک بورڈ پر "بورت جھیل، چھ کلومیٹر" لکھا ہوا تھا ۔۔۔ بورت کا نام میں نے کبھی نہیں سنا تھا۔

"یہ کونسی جھیل ہے ہنر صاحب؟"

"بورت ۔۔۔" اُس نے کہا اور چُپ ہو گیا۔

"ہاں بورت ۔۔۔" میں نے سر ہلایا اور چپ ہو گیا۔

پھسوکو نزاب نزدیک آ رہی تھیں۔



ایک قراقرمی گاؤں جو ہمارے نقشوں میں نہیں تھا اور۔۔
ہنزبیگ۔

ایک پُرپیچ گھاٹی چڑھنے کے بعد جب ویگن پہاڑ کے دوسری جانب اُتری تو دریا کے چوڑے پاٹ کے آخر میں چند گھر تھے اور اُن پر پھستو کونز سایہ فگن تھیں۔ بائیں ہاتھ پر برفپوش چوٹیوں میں سے ایک گلیشیئر اُتر کر نیچے آرہا تھا اور اُس کے عین کنارے پر ایک نئی پتھریلی عمارت کھڑی تھی جس کے باہر "ویل کم ٹو شیسپر ویو ہوٹل۔ پاسو۔ ہنزہ" کا بورڈ لگا ہوا تھا۔

"اِدھر؟ میں نے پُوچھا۔

"نہیں اُدھر ——" حسنات بولا "گاؤں کے قریب ایک اور ہوٹل ہے"

ایک انتہائی بلند چٹان سڑک پر جھکی ہوئی تھی، ہماری ویگن اُس کے نیچے گئی تو اندر تاریکی ہوگئی۔ ہنز بیگ نے اپنا سامان اُٹھایا اور اُتر گیا اور سڑک کے ساتھ چند نیچی چھتوں والے گارے اور پتھر سے بنے ہوئے گھروں کی جانب اشارہ کرکے کہنے لگا "صاحب آپ میرے گھر چلیں گے ——"

سلجوق تو مائل تھا لیکن میں نے اس پر لوجھ ہونا مناسب نہ جانا۔

"تو پھر صاحب آپ سامان ہوٹل میں رکھ کر آؤ اور میرے گھر میں چائے پیئو —— میں انتظار کرتا ہوں —— وہ اُس گلی میں —— کسی سے پوچھ لینا"

اور شام کے ہلکے دھندلکے میں ہنزبیگ اپنے گھر کی جانب اُترنے لگا۔ ہم بھی نیچے اُترے اور پھسّو گاؤں کے قریب پہنچ گئے۔ ویگن ایک چھوٹے سے مکان نما ہوٹل کے سامنے رُکی جس پر "پاسوان" لکھا ہوا تھا اور چند غیر ملکی برآمدے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ اس سے بیشتر کہ میں نیچے اُترتا ہوٹل کا مالک دوڑتا ہوا آگے آیا اور حسنات سے پوچھنے لگا "کوئی مسافر ہے؟"

"ہاں" اُس نے ہم دونوں کی طرف دیکھا۔

"صاحب مجھے افسوس ہے ابھی ابھی چار پانچ جرمن صاحب آگئے ہیں اور میرا ہوٹل بالکل فل ہو گیا ہے۔ آپ واپس گلیشیئر کے پاس شیسپر ویو ہی چلے جائیے وہاں جگہ مل جائے گی۔"

"کیوں بھائی حسنات واپس لے چلو گے؟" میں نے ڈرتے ڈرتے حسنات سے پوچھا جو سورج غروب ہو جانے کے باعث کچھ پریشان تھا کیونکہ اُسے ابھی پندرہ بیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنا تھا۔

"کیا بات کرتے ہو صاحب" وہ خوشدلی سے بولا "ہم آپ کو ادھر کھلے آسمان تلے تو نہیں چھوڑ جائے گا۔"

"ابو سُوست نہ چلیں" سلجوق نے صلاح دی۔

"اور وہاں پہنچ کر کہنا، ابّو کا شغر نہ چلیں ——— آرام سے بیٹھے رہو۔"

حسنات نے ویگن موڑی اور بلند چٹان کے سائے میں سے گذر کر پھسّو گلیشیئر میں سے آتی ہوئی ندی کے پُل پر سے گذر کر ہوٹل کے سامنے سڑک پر روک دی۔ ایک سادہ اور دھیما سا شخص تیز تیز چلتا سڑک پر آیا۔ حسنات نے اُس کے ساتھ کچھ گفتگو کی اور پھر جلدی سے کہنے لگا "ٹھیک ہے صاحب اِدھر پورا ہوٹل خالی ہے ——— آپ اُتر جاؤ"

ہم نے سامان اُتار کر سڑک پر رکھا اور جھک کر ابھی سیدھے ہو رہے تھے کہ حسنات نے ویگن موڑ لی۔

"حسنات بھائی ـــــ وہ آپ کل صبح ہمیں یہاں سے اُٹھا لیں گے ناں؟" میں نے آواز دی۔

"حسنات کی مدھم سی آواز سنائی دی۔"انشاء اللہ" اور اس کی ویگن واپس پھسو گاؤں کی طرف اُترنے لگی۔

شیشے کی کھڑکیوں میں سے نکلنے والے سادہ اور دھیمے شخص نے ہمارا رک سیک اُٹھایا اور ہوٹل کی سکول نما عمارت کی طرف جاتے ہوئے راستے پر چلنے لگا۔

ہم دونوں سڑک پر کھڑے تھے۔ لاہور سے بہت دور اور کاشغر اور یارقند کے قریب ـــــ ایک ایسے قراقری گاؤں کے باہر جو ہمارے نقشوں میں نہیں تھا، ہمارے منصوبوں میں نہیں تھا۔ لیکن ہمارے ہاتھ کی لکیروں میں کہیں تھا اور اسی لئے اِس وقت ہم یہاں کھڑے تھے ـــــ ہسپانیہ کے وسیع صوبے قشتالیہ میں گم ثوریا کی طرح پھسو بھی ایک بستی تھی جس کے نام سے میں آج صبح تک ناواقف تھا لیکن ثوریا قشتالیہ کے بے آباد میدانوں میں پوشیدہ تھا اور پھسو دنیا کے بلند ترین پہاڑوں میں چھپا ہوا تھا ـــــ ہم کیا سوچتے ہیں اور کہاں جانا چاہتے ہیں اور کہاں جاتے ہیں ـــــ ہم اس اجنبی سرزمین پر کھڑے تھے اور یہاں تیز ہوا کا شور تھا جو گلیشیئر سے اُتر کر ہمارے وجود کو سن رہی تھی۔ دریائے ہنزہ کے پانیوں کی دُور جاتی ہوئی گونج تھی جو پھسو کی نوکیلی چٹانوں کے شگافوں میں کہیں گم ہو رہی تھی اور اِن کے علاوہ اور کوئی آواز نہ تھی ـــــ اور تنہائی تھی۔ وہ سادہ اور دھیما شخص اتنی دیر میں واپس آیا اور میرا بیگ اُٹھانے لگا۔

"نہیں اسے رہنے دو ___ آؤ سلجوق" میں نے بیگ اٹھایا اور بڑھتی ہوئی تاریکی میں پتھروں پر آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوٹل کی جانب چلنے لگا ___ ہوا بے حد تیز تھی۔

"آپ یہاں ملازم ہو؟" میں نے پہلو میں چلتے جھکے ہوئے شخص سے پوچھا۔

"نہیں صاحب ___ یہ چار پانچ کمرے میں نے خود بنائے ہیں اِسی برس ___ اُدھر آپ کے علاقوں میں ساری زندگی محنت کی ہے اور اب اپنے گاؤں کے باہر یہ ہوٹل بنایا ہے آپ جیسے صاحبوں کے لئے ___ صاحب یہ کمرہ ٹھیک ہے؟" اس نے برآمدے میں سے گزر کر ایک تازہ رنگ کیا ہوا دروازہ کھولا۔

"ٹھیک ہے" میں نے اندر جھانکے بغیر کہا "کچھ کھانے کو مل جائے گا؟"

"جی آپ جو کہیں گے پکا لوں گا ___" اُس نے نہایت ملائمت سے جواب دیا "لیکن پہلے روشنی کا بندوبست کر لوں" اور باہر چلا گیا۔

مختصر سا کمرہ جس کی کھڑکی سے پرے شاہراہِ ریشم تھی اور اُس سے پرے دریائے ہنزہ اور نوکیلی چٹانیں ___ اور یہ سب کچھ نظر نہیں آ رہا تھا، تاریکی بہت نیچے آ چکی تھی ___ بستروں پر نئی نکور سُرخ رضائیاں تھیں جن میں سے تازہ روئی کی خوشبو آ رہی تھی۔ ایک چھوٹا مگر صاف ستھرا غسل خانہ ___ ایک تھکے ہوئے سیاح کو ایک ویران پہاڑی قصبے میں شام ہو جائے تو اُسے اِس سے بڑھ کر اور کیا چاہیئے ___ اتنی آسودہ رہائش میرے گمان میں بھی نہ تھی۔

"ابو سردی ہے" سلجوق نے ناک کو پکڑ کر اُسے ہلایا ___ اور سردی

تھی۔ اُس نے رُک سیک کھولا اور اپنی سیاہ جیکٹ نکال کر پہن لی۔ میں نے بھی ایک سویٹر نکالا اور ایک پھندنے والی اونی ٹوپی سر پر کھینچ لی۔۔۔۔ مجھے ہلکا سا زکام بھی ہو رہا تھا۔

"یہ کمرے میں رکھ دوں صاحب؟" وہ لالٹین لئے کھڑا تھا۔

"ہاں رکھ دو۔"

"جی صاحب تو آپ کیا کھائیں گے؟"

"کیا مل سکتا ہے؟"

"صاحب مجھے پتہ نہیں تھا کہ اس وقت کوئی مہمان آ جائیں گے۔ اِدھر تو کچھ نہیں ہے، نیچے بستی میں جا کر کوئی انڈہ آلو وغیرہ لاتا ہوں، سُوپ بھی بنا دوں گا۔۔۔۔ آپ اتنی دیر آرام کرو۔"

"ہم آرام نہیں کریں گے۔۔۔۔ کیا نام ہے آپ کا؟"

"جی عظیم۔"

"عظیم آپ اِدھر ہُنر بیگ کو جانتے ہیں؟"

"جی اُسے کون نہیں جانتا۔۔۔۔ ویسے بھی اِن علاقوں میں ہم سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔" "اس کو ملنا چاہتے ہو آپ؟"

"وہ ہمارے ساتھ گلگت سے آیا تھا۔ ہم تھوڑی دیر بعد اُس کے گھر جائیں گے اور واپسی پر کھانا کھائیں گے۔۔۔۔ ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہے صاحب آپ تھوڑی دیر آرام کر لو اور پھر چلے جانا۔"

"اور اِدھر ہوٹل میں۔۔۔۔ میرا مطلب ہے سامان وغیرہ۔"

"کچھ نہیں ہوتا صاحب۔" عظیم سر ہلا کر مسکرانے لگا۔ "اِدھر کچھ نہیں ہوتا آپ اطمینان سے چلے جانا۔"

اس نے تیز ہوا سے بچاؤ کی خاطر کمبل لپیٹا اور پتھریلے راستے پر چلتا ہوا سڑک پر اُتر گیا۔

برآمدے کے چوبی ستون کے ساتھ لالٹین لٹک رہی تھی جو بھپسو گلیشیئر کی سرد ہوا سے آہستہ آہستہ جھولتی ہم بغلوں میں ہاتھ سمیٹتے آرام کرسیوں پر دراز ہو کر یونہی سامنے دیکھنے لگے اور سامنے یکسر تاریکی تھی اور ہم جانتے تھے کہ اُس تاریکی میں ایک وادی ہے جس کے درمیان ایک پُر شور دریا بہہ رہا ہے اور جس کے سر پر چٹانوں کا ایک سر بفلک سلسلہ ہے اور شاہراہِ ریشم ہے جو چین کی سرحد تک چلی جا رہی ہے اور ہوٹل کے پیچھے ہماری پشت پر پھسو گلیشیئر اور بامِ دنیا کی چوٹیاں ہیں جن کی یخ بستگی ہمارے بدنوں میں تیرتی ہے۔ اُس وقت میں اور سلجوق بالکل الگ ہو چکے تھے، ہمارے درمیان باپ اور بیٹے کا رشتہ ختم ہو چکا تھا اور ہم چُپ چاپ برفیلی ہوا اور پانی کے شور کا ایک حصّہ بن کر گم سُم بیٹھے تھے۔ ہم دونوں اپنی اپنی جگہ تنہا تھے اور ہمارے آس پاس فطرت کے عناصر تھے جو ہمیں ایک دوسرے سے الگ کر رہے تھے۔

ابّو" اُس نے میری بازو پر ہاتھ رکھا اور وہ واپس میرے بدن میں بیٹے کی صورت آ گیا اب ہم اکیلے نہیں تھے یا رشتے ہو سکتے ہیں اور یا فطرت کے ساتھ رابطہ ہو سکتا ہے دونوں بیک وقت نہیں ہو سکتے۔

"ابّو ہم اس وقت ہُنزبیگ کا گھر کیسے تلاش کریں گے؟"

"کل صبح چلیں گے"

کل صبح تو حسنات ہمیں لینے آ جائے گا ـــــ اُٹھیں ابّو"

لالٹین کی روشنی سے دُور ہو کر ہم تاریکی میں داخل ہوئے تو اس تاریکی میں بھی راہ سجھائی دینے لگا۔ سڑک کی نیم سیاہی کھیتوں کے پار دریا صرف

گونج تھا لیکن اُس کے کنارے کھڑی چٹانیں موہوم نوکیلے دھبّے تھیں گلیشیر کی ندی سڑک کے نیچے سے گذرتی تھی اور پتہ دیتی تھی کہ پانی ہیں۔ جھکی ہوئی چٹان کے نیچے غار ایسی تاریکی تھی۔ ہم آہستہ آہستہ چلتے گئے۔ چٹان کے خاتمے پر بائیں ہاتھ کو وہ راستہ تھا جس پر ہنزبیگ اُترا تھا۔ ہم سڑک سے اتر کر راستے پر آئے جو دراصل پتھروں کی ایک دیوار تھا اور اُس پر احتیاط سے قدم ٹٹول ٹٹول کر چلنا پڑتا تھا ورنہ نیچے پتہ نہیں کیا تھا۔ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے، دُبکے ہوئے مٹیالے ہیولے، روشن دانوں اور کھڑکیوں سے مبرا ـــــ ہم اُن گھروں کی چھتوں کی سطح پر چل رہے تھے۔ ایک جگہ کھڑے ہو کر ہم دونوں نے باری باری ہنزبیگ کا نام پکارا جو دریائے ہنزہ کے شور میں شامل ہو کر چٹانوں سے ٹکرایا اور ایک ڈراؤنی پکار میں بدل گیا۔ چند قدم آگے جا کر ہم نے پھر "ہنزبیگ صاحب" کا نعرہ لگایا مگر کوئی جواب نہ ملا۔

"ابو میرا خیال ہے ان مکانوں میں کوئی نہیں رہتا ـــــ ہم غلط جگہ پر آگئے ہیں"۔ سلجوق نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اُس لمحے اُس دیوار کے نیچے جس پر ہم کھڑے تھے ایک لالٹین نمودار ہوئی جس کی روشنی دروازے میں کھڑی ایک ایسی خاتون کے چہرے پر تھی جو شکل سے چینی دکھائی دیتی تھی۔ اُس نے ایک لمبا چوغہ اور رنگین چوکور ٹوپی پہن رکھی تھی۔ لالٹین زمین پر رکھ کر اُس نے ہماری جانب دیکھنے کی کوشش کی اور کچھ کہا۔ میں نے دو تین مرتبہ ہنزبیگ ہنزبیگ کہا تو اُس نے سر ہلایا ـــــ "آہا ـــــ اُونز بیگ ـــــ" اور ایک مکان کی طرف اشارہ کیا ـــــ ہم اُس مکان کے قریب پہنچے تو ایک تنگ گلی میں سے ہنزبیگ ہماری طرف لپکا چلا آرہا تھا۔ "صاحب ـــــ میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا"۔ ہمارے جواب کا انتظار کئے بغیر وہ پیچھے مڑا اور ایک کھُلے

صحن میں داخل ہوگیا۔ کچے صحن میں ایک دروازہ تھا جو اُس نے کھولا اور ہمیں پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے اندر چلا گیا۔ اندر داخل ہو کر احساس ہوا کہ باہر پھر بھی کچھ کچھ دکھائی دیتا تھا کیونکہ یہاں مکمل اور گہری تاریکی تھی۔ اس کمرے میں ایک اور دروازہ تھا جو بائیں ہاتھ پر تھا۔ دو تین کمروں میں سے بل کھاتے ہوئے ہم بالآخر ایک نسبتاً کشادہ ہال نما کمرے میں پہنچے۔ چھت میں ایک چوکور روشن دان تھا جس کے راستے نیم تاریک کمرے کی مکمل تاریکی میں اُتر رہی تھی۔ روشن دان کے گرد لکڑی کے بنے ہوئے چار ستون کھڑے تھے۔ ہُنر بیگ نے جلدی سے ایک گیس لیمپ روشن کیا اور میز پر رکھ دیا — ایک دودھیا اور دھندلائی ہوئی روشنی کمرے میں پھیلی اور اس کی شباہت کو واضح کر دیا — یہ ایک ایسا کمرہ تھا جو سطح مرتفع پامیر۔ قراقرم۔ ترکستان اور واخان کوریڈور میں بسنے والے لوگ سینکڑوں برسوں سے شدید سردی سے بچاؤ کی خاطر استعمال کرتے آئے ہیں۔ چونکہ اس میں آنے والے تمام دروازے ایک دوسرے سے مخالف سمتوں میں واقع ہوتے ہیں اور اندر پہنچتے ہی ہر دروازہ بڑی احتیاط سے بند کر دیا جاتا ہے اس لئے برفیلی ہوا بھی یہاں تک نہیں پہنچ پاتی۔ موسمِ سرما میں ایک چوکور آتش دان کمرے کے وسط میں نصیب کر دیا جاتا ہے اور اُس کی چمنی کو روشندان میں سے باہر نکال دیا جاتا ہے اور یوں اہلِ خانہ اِس آتش دان کی جانب پاؤں پسار کر آرام سے سو سکتے ہیں۔ ایک جانب مرد اور دوسری طرف عورتیں اور بچے — یہ حصّہ جو سونے کے کام آتا ہے کمرے کی بقیہ سطح سے نیچا ہے اور اُس کے ساتھ دو حجرہ نما کوٹھڑیاں ہیں جن کا فرش قدرے بلند ہے اور اُس پر پہاڑی بکروں کی

اُون سے بنے ہوئے نمدے بچھے ہیں ـــــــ ہنر بیگ کا یہ کمرہ صرف ساخت کے لحاظ سے مرکزی ایشیائی تھا لیکن اس میں رکھا ہوا تمام تر سامان غیر ملکی تھا۔ فولڈنگ کرسیاں، چھوٹی تپائیاں، متعدد رک سیک، سلیپنگ بیگ، برف کاٹنے والے کلہاڑے۔ کوہ پیمائی میں کام آنے والے نائلون کے رسے، کیلیں، میخیں، برفانی جیکٹیں اور بھاری بُوٹ ـــــــ ہنر بیگ نے جو گیس لیمپ جلایا تھا وہ بھی اسی کوہ پیمائی سامان کا ایک حصہ تھا۔

میں اور سلجوق نمدوں پر بیٹھ گئے، کچھ کچھ خوفزدہ کہ ہم اس شخص کو واجبی طور پر جانتے ہیں اور یوں آنکھیں بند کر کے اس کے ہمراہ اس نیم تاریک غار میں چلے آئے ہیں جس میں سے بوقت ایمرجنسی نکلا بھی نہیں جا سکتا۔

"اِدھر بیٹھیں صاحب ـــــــ" ہنر بیگ نے دو فولڈنگ چیئرز کھول کر میز کے ساتھ لگا دیں۔

"ہم یہیں ٹھیک ہیں" میں نے کہا۔

"نہیں صاحب اُوپر بیٹھو، کرسی اگر ہے تو زمین پر کیوں بیٹھتے ہو"

مجھے اُٹھنا پڑا لیکن سلجوق وہیں براجمان رہا۔

ہمارے کان گیس لیمپ کی ہلکی سرسراہٹ سُن رہے تھے۔ جیسے سُوں سُوں کرتی دودھیا روشنی اُس میں سے لیک کر رہی ہو، ہوا اور پانی کا شور اس نیم روشن کمرے سے کئی دروازے دور ہم پر بند ہو چکا تھا۔

"صاحب آپ سوپ پیو گے یا کافی ـــــــ" ہنر بیگ اپنی کرسی سے اُٹھا تو اس کا سایہ لکڑی کے ستونوں پر بھٹکنے لگا۔

"کس چیز کا سوپ؟" سلجوق فوراً بولا اور اُسے بولنا تھا کیونکہ وہ اب

ایک بھو کا بچہ تھا۔

"چکن ۔۔۔ ٹماٹو ۔۔۔ بیف ۔۔۔ جو آپ پسند کریں" ہنر بیگ نے میری حسرت بھانپ لی" صاحب جن کوہ پیما ٹیموں کے ساتھ ہم پہاڑوں میں جاتے ہیں وہ وطن واپسی پر اپنا بیشتر سامان اور باقی ماندہ خوراک کے ڈبے وغیرہ ہمیں دے جاتی ہیں ۔۔۔ یہ دو رُک سیک مجھے نانگا پربت کی ٹیم نے دیئے تھے اور اُدھر کونے میں جو سامان ہے وہ کے ٹو والے چھوڑ گئے تھے ۔۔۔ آپ کیا پسند کریں گے ؟" اُس نے ایک نیلے رنگ کا گیس سٹوو جلایا اور اس پر پانی سے لبریز ایک کیتلی رکھ دی۔

"ہنر بیگ ۔۔۔ اگر آپ ان کوہ پیما جماعتوں کے ہمراہ جاتے ہیں تو کبھی یہ خواہش پیدا نہیں ہوتی کہ بیس کیمپ چھوڑ کر اُن بلند چوٹیوں پر بھی اپنے قدموں کے نشان ثبت کئے جائیں ۔۔۔ جو ہماری ہیں لیکن اُن پر صرف غیر ملکیوں کے قدم ہی جاتے ہیں ؟"

"صاحب ۔۔۔" اُس نے کیتلی میں انگلی ڈبو کر پانی کی حدت کو جانچا۔ "آپ خواہش کی بات کرتے ہو، ہم تو خواب دیکھتے ان پہاڑوں کے ۔۔۔ لیکن صاحب ہم کیسے جائیں ۔۔۔ ہمارے پاس ٹریننگ نہیں ہوتی، سامان نہیں ہوتا ۔۔۔ آپ کو بتایا تھا کہ ہم تو روزگار کے لئے جاتے ہیں اور ٹیم والوں کی بھی یہی کوشش ہوتی ہے کہ کوئی ممبر اُوپر جائے، ہم لوگ تو اُن کے ملازم ہوتے ہیں اور صاحب اگر ہم ہمّت کر کے، کوشش کر کے اوپر چلے بھی جائیں تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ۔۔۔ نہیں صاحب ۔۔۔ کوئی فائدہ نہیں۔ یہ درست نہیں کہ اُدھر صرف غیر ملکیوں کے قدم ہی جاتے ہیں ۔ ہمارا اشرف امان ہے جو کے ٹو کو فتح کرنے والا پہلا پاکستانی ہے ۔۔۔ کبھی نام سنا؟ نذیر صابر ابھی

دو سال پہلے جاپانی ٹیم کے ساتھ کے ٹو کی چوٹی پر پہنچا تھا اور ان دنوں راولپنڈی میں ٹورسٹ گائیڈ ہے صاحب ــــــ مشکل سے گزارہ ہوتا ہے۔ اشرف امان ٹریکنگ کرتا ہے اور ہنزہ کے ایک کچے مکان میں رہتا ہے ــــ کیا فائدہ صاحب اگر کوئی شاباش نہ دے، حوصلہ نہ بڑھائے۔ کوئی انگریز اگر ننگا پربت پر چلا جائے تو ساری دنیا میں دھوم مچ جاتی ہے، اخباروں میں نام آتا ہے، عزت ملتی ہے اور اگر پاکستانی چلا جائے تو پھر واپس آکر اسی طرح پورٹر کا پورٹر ہی رہتا ہے۔ کیا فائدہ ــــ" اس نے سوپ کی ٹکیاں گرم پانی میں گرائیں اور انہیں حل کر کے گرم گرم سوپ پیالیوں میں ڈال کر ہمارے آگے رکھ دیا۔" تارڑ بھائی اگر پندرہ بیس آدمی ہاکی یا بیٹ لے کر میدان میں اترتے ہیں تو پوری پاکستانی قوم سارے کام کاج چھوڑ کر انہیں دیکھتی ہے۔ دیوانی ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات وہ جیت جاتے ہیں اور اکثر اوقات ہار جاتے ہیں ــــ وہ ایسے کھیل کھیلتے ہیں۔ جن میں موت کا کوئی خطرہ نہیں ہوتا، جن میں شجاعت اور مردانگی کو کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ میں انہیں زنانہ کھیل کہوں گا ــــ اور پھر وطن واپسی پر یہ لوگ ہیرو بن جاتے ہیں۔ انہیں سر پہ اٹھا لیا جاتا ہے۔ اخباروں میں صرف اُن کا تذکرہ ہوتا ہے۔ ــــ صاحب آپ زنانہ کھیل کھیلنے والوں کو تو اپنا ہیرو بناتے ہیں۔ اُن کے پوسٹر چھپواتے ہیں لیکن کوہ پیمائی تو صاحب ایسا کھیل ہے جس کے لئے جان پر کھیلنا پڑتا ہے اور ہزاروں اعلیٰ درجے کے کوہ پیماؤں میں سے کوئی ایک خوش نصیب کے ٹو ایسی دبدبے اور جلال والی چوٹی کا غرور توڑتا ہے ــــ اُس چوٹی پر ہمیشہ کے لئے رکھے ہوئے پاکستانی پرچم زیادہ اہم ہیں یا دنیا کے کسی بھی ملک کے کسی چھوٹے سے میدان میں چند لمحوں کے لئے لہرانے والا پاکستانی پرچم ــــ کوئی فائدہ نہیں صاحب یہ قوم قدر نہیں کرتی۔ کھیل اور کھلاڑی

دونوں زنانہ قسم کے پسند کرتی ہے ــــــ"

میں چپکے سے سُوپ پیتا رہا اور اُس کی باتیں سنتا رہا ــــــ وہ قراقرم کی سیاہ چٹانوں کی قربت میں رہتا تھا، انہی میں سے اپنی روزی نکالتا تھا۔ اور بڑی تنگی ترشی سے گذارہ کرتا تھا ــــــ وہ پاکستانی قوم سے خوش نہ تھا جو اُس کے ساتھی کوہ پیماؤں کے ہُنر کی داد نہیں دیتی صرف کرکٹ اور ہاکی کے کھلاڑیوں کے لئے تالیاں بجاتی ہے۔

کمرے کے دروازے پر جیسے کسی نے ہولے سے دستک دی ہو ــــــ

میں نے ہنزبیگ کی طرف دیکھا۔

"ہوا ہے صاحب"

سُوپ کے خاتمے پر گرم کافی کے مگ ہمارے ہاتھوں میں آگئے۔

سلجوق تو جیسے پریوں کی کہانیاں سُن رہا تھا، منہ کھولے، مگن، ہنزبیگ کے طرف آنکھیں جھپکے بغیر دیکھتا ہوا، یکدم کہنے لگا "آپ نے کبھی برفانی انسان دیکھا ہے؟"

ہُنزبیگ ہنسنے لگا۔ وہ بڑی عجیب سی ہنسی تھی جس میں کمرے سے باہر قراقرم میں گونجتی تیز اور سرد ہواؤں کا شور تھا اور چٹانوں ایسی سختی تھی۔

"نہیں سلجوق کبھی نہیں ــــــ یہ سوال مجھ سے بہت لوگ پوچھتے ہیں ــــــ نہیں میں نے کبھی برفانی انسان نہیں دیکھا۔ یہ ایک جھوٹی کہانی ہے صرف لوگوں کو حیران کرنے کے لئے ــــــ یہاں بھی خدا ہے اور اُدھر اُن برفانی دریاؤں اور اُونچی چوٹیوں پر بھی خدا ہے۔ کوئی بھوت پریت کوئی برفانی انسان نہیں ہے ــــــ اگر ہوتا تو مجھے نہ ملتا؟ ــــــ ہاں وہاں رات کو آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ انسان پچیس ہزار فٹ کی بلندی پر اکیلا اپنے خیمے میں سو رہا ہو اور

خاموشی ہو اور ایسی آوازیں کانوں میں آئیں جیسے کوئی سسکیاں بھر رہا ہے رو رہا ہے، باتیں کر رہا ہے، خیمے کے باہر چل رہا ہے تو پھر اندر کا خوف اُسے یقین دلاتا ہے کہ باہر کوئی ہے ـــــ کوئی ذی روح ـــــ کوئی بھوت پریت ـــــ لیکن سلجوق وہاں کچھ بھی نہیں ہوتا ـــــ درجہ حرارت کی کمی بیشی کے باعث چٹانیں سرکتی ہیں، اُن میں دراڑیں پڑتی ہیں تو آواز آتی ہے ـــــ برف کے تودے جگہ بدلتے ہیں تو اُن کی سرگوشیاں سی ہوتی ہیں۔ گلیشیئر حرکت میں ہو تو وہ بھی آواز کرتا ہے ـــــ بس ـــــ اور کچھ نہیں ہوتا"

"کچھ تو ہوتا ہوگا" سلجوق نے مایوسی سے سر ہلایا۔

"ہاں ہوتا ہے" ہنر بیگ نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیا؟"

"برفانی انسان"

"سچ؟"

"دیکھو ناں سلجوق میں جو وہاں ہوتا ہوں اور برفوں میں رہتا ہوں تو وہاں برفانی انسان تو ہوتا ہے ناں؟"

دروازے پر دستک کا واہمہ ہوا، ہوا نہ تھی بلکہ ایک چھوٹی سی بچی سُرخ خوبانیوں سے بھری ہوئی پلیٹ اُٹھائے اندر آئی تھی۔

"یہ میری بیٹی ہے نجمہ پروین ـــــ" ہنر بیگ نے اسے اپنی زبان میں کچھ کہا اور وہ پلیٹ میز پہ رکھ کر ایک طرف ہو کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا لباس ایک لمبا چوغہ تھا جس میں وہ بالکل گڑیا لگ رہی تھی اور نقوش اُن ترک گڈریوں کے سے تھے جنہیں میں نے ارضِ روم کے آس پاس دیکھا تھا۔

"کھائیں صاحب"

میں نے نیم دلی سے ایک خوبانی اُٹھائی کیونکہ مجھے اس پھل سے زیادہ رغبت نہ تھی ــــــ منہ میں رکھتے ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ خوبانی نہ تھی کچھ اور تھا۔ ایک آسمانی ذائقے کا پھل جو میں نے اس سے پیشتر کبھی نہیں کھایا تھا اور آسمانی ذائقے کی تفصیل بیان کرنا ممکن نہیں ہوتا صرف چکھنے سے پتہ چلتا ہے۔ سلجوق نے بھی خوبانی کا مزہ لیتے ہوئے زور زور سے سر ہلایا اور میری طرف دیکھا "ہُوں ــــــ"

"صاحب خوبانیوں کا موسم تو ختم ہونے کو ہے لیکن میری بچی نے خصوصی طور پر انہیں میرے لئے سنبھال کر رکھا ہوا تھا ــــــ اسے معلوم تھا کہ بابا گلگت گیا ہوا ہے اور وہاں ــــــ"

"تو آپ لیں ناں ــــــ" سلجوق شرمندہ ہو کر بولا۔

"میں اپنا حصّہ کھا چکا ــــــ یہ آپ کے لئے ہے۔"

سلجوق جو اکثر عادتوں کے علاوہ کھانے پینے کے معاملے میں بھی بے حد نک چڑھا ہے بے حد سنجیدہ چہرہ لئے بیٹھا تھا مگر اس کا ہاتھ غیر سنجیدگی کی حد تک خوبانیوں کو کم کئے چلا جا رہا تھا۔ میں نے ایک پدرانہ غراہٹ کے ساتھ اپنا گلا صاف کیا تو اُس نے فوراً ہاتھ روک لیا ــــــ پلیٹ میں صرف پانچ چھ خوبانیاں بچی تھیں۔ میں نے نجمہ پروین کے ساتھ گفتگو کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ہاتھ باندھے خاموش کھڑی ہمیں دیکھتی رہی ــــــ گیس کی روشنی میں اُس کا سُرخ چہرہ اور تاتاری آنکھیں نامعلوم شہروں سے آئے ہوئے اُن اجنبیوں کو دیکھ رہی تھیں جو اُس کے بابا کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے ــــــ وہ کبھی پھسُو سے باہر نہیں گئی تھی۔

"کبھی کوئی حادثہ بھی ہوا ہنر بیگ؟" میں پھر پہاڑوں کی جانب لوٹ آیا۔

"صاحب حادثوں کا کھیل ہے ــــــ حادثہ تو ہوتا ہے"

"کوئی ایسا حادثہ جس نے یادیں چھوڑی ہوں، یاد آتا ہو"

"ہاں ـــــ ۱۹۸۳ء میں بیلجیئم کی ٹیم کے ساتھ راکاپوشی گیا تھا تو واپسی پر میرا عزیز ترین دوست گلمت کا رہنے والا سلطان اللہ بیگ ہم سے علیحدہ ہو کر بھٹک گیا ـــــ صاحب ہم نے اُسے بہت تلاش کیا ـــــ تین دن اور تین رات برفوں میں مارا مارا پھرا لیکن وہ نہ ملا۔ گلگت سے ہیلی کاپٹر بھی آیا لیکن وہ نہ ملا۔ ـــــ اب وہیں ہے راکاپوشی کے پاس ـــــ اب کبھی گیا تو اُسے ضرور تلاش کروں گا، اُسے ضرور ملوں گا۔ صاحب وہ ہمارا دوست تھا ـــــ"

ہنر بیگ خاموش ہو گیا۔ اُس کے سفید مشقتی چہرے پر دوست سے جدائی کا غم پھر سے گہرا ہو رہا تھا اور کمرے کے کواڑوں پر ہوا کا دباؤ بڑھ رہا تھا۔ تب مجھے یاد آیا کہ ہم اِس خاموش اور قدیم وضع کے کچے کمرے میں رہنے کیلئے نہیں آئے، چند لمحوں کے لئے آئے ہیں اور ہمیں باہر جانا ہے تیز ہواؤں اور پانیوں کے شور میں اور تاریکی میں۔

"صاحب آپ کھانا کھا کر جاؤ" میں اُٹھنے لگا تو ہنر بیگ اپنے دوست کی یاد سے یکدم علیحدہ ہو گیا۔

"نہیں شیسپر ویو کا عظیم اس وقت ہمارے لئے آلو اُبال رہا ہو گا ـــــ پھر کبھی سہی"

"پھر تو کبھی نہیں صاحب ـــــ" ہنر بیگ بولا "اِدھر ان پہاڑوں میں کون آتا ہے۔ آپ گلگت تو شائد آؤ گے۔ کریم آباد بھی شائد لیکن ادھر کہاں آؤ گے، اِدھر تو ہم آپ کو لے آیا"

"کل صبح روانگی سے پیشتر اگر وقت ملا تو ہم دونوں پھر آئیں گے"

"صاحب ـــــ" ہنر بیگ سر جھکا کر شرمندگی سے کہنے لگا "وہ جنات تو نہیں لے کر جائے گا آپ کو۔ وہ تو صبح پانچ بجے حاجیوں کو بھر کر گذر جاتے

گئی یہاں سے"

"لیکن اس نے تو وعدہ کیا تھا۔"

"صاحب وہ میرے کہنے پہ ہی وعدہ کیا تھا پر اُس کا ویگن فُل تھا۔ پہلے سے ہی۔ آپ فکر نہ کرو آپ اِدھر رہو دو چار دن ہم بندوبست کر دے گا آپ کی واپسی کا —— صاحب آپ دوبارہ آؤ تو شمشال ضرور جاؤ۔ یہیں پھسو سے راستہ جاتا ہے۔ صرف تین دن کا ٹریک ہے ہم آپ کو لے چلے گا۔"

"آپ گئے ہو؟" سلجوق نے آنکھیں جھپکیں، وہ تھکا ہوا تھا۔

"کئی مرتبہ صاحب —— خطرناک راستہ ہے لیکن میں لے چلوں گا دیکھئے" وہ کونے میں جا کر ایک صندوق پر جھک گیا، واپس آیا تو اُس کے ہاتھوں میں "نیشنل جیوگرافک" کا ایک شمارہ تھا۔ یہی شمارہ لاہور میں میرے بک شیلف میں بھی رکھا ہوا تھا اور اس میں "ہائی روڈ ٹو ہُنزہ" کے نام سے ایک مہاتی نو کی داستان اور تصویریں تھیں۔ اس نے رسالہ کھولا "یہ دیکھئے صاحب یہ فرانسیسی صاحب اُن کی بیگم اور بچہ آئے تھے اِدھر پھسو میں اور میں انہیں گائڈ کے طور پر شمشال کی وادی میں لے کر گیا تھا —— یہ دیکھئے بیگم صاحبہ کو میں دریائے شمشال پر بنے ہوئے تختوں کے راستے پر سے گذرنے میں مدد دے رہا ہوں آپ نے پہچانا؟ —— اور یہ اِدھر میرا تذکرہ بھی ہے مضمون میں ——"

—— ہاں یہ ہُنر بیگ ہی تھا۔ تختوں کے خطرناک پُل پر کسی چینی بازی گر کی طرح ایک سفید فام خاتون کو سہارا دیتا ہوا —— عجیب بات ہے، پچھلے برس میں نے اس شمارے میں شائع شدہ انہی پُر خطر راستوں اور دریاؤں کی تصاویر کو —— اور خاص طور پر اس تصویر کو اُس قیدی کی طرح دیکھا تھا جو اپنی کال کوٹھڑی میں

بند اُونچے روشندان میں پھدکتی چڑیا کو دیکھ کر آزادی کا سانس محسوس کرتا ہے۔ اُس وقت ہُنر بیگ میرے گھر میں ایک تصویر تھا اور اس وقت میں اُس تصویر کے گھر میں تھا۔

"آپ آنا صاحب میں آپ کو شمشال لے کر چلوں گا۔"

"اتنا خوبصورت نام میرے ہاتھ کی لکیروں میں ہونا تو چاہیئے ـــــ شکریہ ہنر بیگ ہم اِس شام کو یاد رکھیں گے۔" ہم اُٹھنے لگے تو وہ "ٹھہریئے صاحب" کہہ کر ایک رُک سیک کی طرف گیا اور اُس میں سے ایک ایسا ہیڈ لیمپ نکال کر لے آیا جو کوہ پیما رات کے وقت استعمال کرتے ہیں۔ "مجھے خیال نہیں آیا تھا، رات ہو گئی ہے اُدھر آپ کے ہوٹل تک بہت اندھیرا ہو گا، آپ یہ لے جاؤ۔" اُس نے لیمپ کے ساتھ بندھے الاسٹک کو کھینچا اور اُسے سلجوق کے ماتھے پر اس طرح لگا دیا جیسے ریڈ انڈین چیف کے ماتھے کے ساتھ پرندوں کے پر لگے ہوتے ہیں ــــ اور لیمپ کو آن کر دیا۔ روشنی خاصی تیز تھی لیکن اُس کی تیزی مکان سے باہر آتے ہی منتشر ہو گئی۔ باہر ہوا کی تیزی میں شدت آ چکی تھی اور دریا کا شور بلند ہو چکا تھا۔ کانوں پر تیز دستکیں ہوتی تھیں۔

"خدا آپ دونوں کو اپنی حفاظت میں رکھے ـــــ" ہنر بیگ ہاتھ ملا کر جدا ہوا اور ہم سڑک پر آ کر ہوٹل کی جانب چلنے لگے۔ سلجوق کے ماتھے پر نصب لیمپ کی روشنی تاریکی کے وسیع خلا میں تیرتی تھی اور مدھم ہوتی تھی۔ وہ کوئلے کی کان میں کام کرنے والا کوئی نوجوان مزدور لگ رہا تھا۔

"ابو" اس نے یکدم پلٹ کر میری طرف دیکھا اور میری آنکھیں چندھیا گئیں۔

"دوسری طرف دیکھو"

"لیکن ابّو" اس نے پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا اور اس کے ماتھے پر روشن بلب نے پھر مجھے اندھا کر دیا۔

"گدھے" میں نے اُس کی ٹھوڑی پکڑ کر اُس کا چہرہ سڑک کی جانب کر دیا "اُدھر دیکھ کر بات کرو ——— ہیڈ لیمپ لگا کر مخاطب کی طرف دیکھ کر بات نہیں کرتے"

"سوری ابّو" اُسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا "وہ دراصل" وہ اپنے سامنے دیکھتا ہوا بولا، سڑک روشن ہو رہی تھی "اگر ہم کل چلے گئے تو ہُنز بیگ کو یہ ہیڈ لیمپ کس طرح واپس کریں گے؟"

میں رُک گیا۔ "ہُنز بیگ" میں نے منہ کے آگے ہتھیلیوں کا پیالہ بنا کر آواز دی جو ہوا کے شور میں گونجی اور گونجتی چلی گئی۔

دُور اس مکان کی جانب سے جو اندھیرے میں کہیں تھا اور جس کے اندر ایک قدیم طرز کے کمرے میں ایک گیس لیمپ اب بھی روشن تھا، کافی کی خالی پیالیاں میز پر تھیں اور اُن کے ساتھ ایک پلیٹ تھی۔ جس میں چند سُرخ خوبانیاں تھیں ایک آواز بکھرتی ہوئی آئی "جی جی صاحب صاحب"

"یہ ہیڈ لیمپ ——— لیمپ ———"

"صاحب ——— صاحب ——— یہ سَل ——— سَل ——— جُوق ——— جُوق کے لئے ہے ہے ہے" اُس کی آواز ہم تک پہنچتی پہنچتی بکھر گئی۔ وہ اب بھی اپنے مکان کے باہر کھڑا دور تاریکی میں رینگتی اس ہیڈ لائٹ کو دیکھ رہا تھا۔

"خدا حافظ" سلجوق نے زور سے کہا "اور تھینک یو"

تھینک یُو ——— تھینک یُو ——— سرد ہوا قراقرم کی چٹانوں میں اس تھینک یو کو دیر تک پٹختی رہی۔

جو کچھ ہنر بیگ نے جواب میں کہا وہ گم ہو گیا، ہم تک نہ پہنچ سکا کیونکہ ہمارے درمیان فاصلہ بڑھ گیا تھا۔ اب ہم لاہور میں تھے اور وہ پھیتو میں رہ گیا تھا۔



پھسّو کی رات اور ہوا وحشی ہوتی جاتی تھی

سلجوق اپنے بے ہنگم طور پر بڑھنے قد کی وجہ سے کسی بے مہار شتر کی طرح پاؤں جھٹکتا ہوا چلتا ہے اس لئے اُس کے ماتھے پر نصب روشنی اکثر بھٹک جاتی اور سڑک پر پڑنے کی بجائے آس پاس کی چٹانوں اور فضاؤں میں تیرنے لگتی۔ میں اُس کی ٹھوڑی پکڑ کر اُس کا رُخ صراطِ مستقیم کی جانب کرتا جو کہ ایک پُر پیچ پہاڑی سڑک تھی — ہم خاصی دیر چلتے رہے۔

"ابو" اس نے حسبِ سابق یکدم میری طرف دیکھا اور پھر میرے چہرے کو چمک سے جھجکتے پاکر فوراً دوسری جانب دیکھنے لگا۔"ابو ہوٹل کتنی دُور ہے؟"

مجھے احساس ہوا کہ ہم خاصی دیر سے چل رہے ہیں اور اِدھر آتے ہوئے تو راستہ صرف دس منٹ میں کٹ گیا تھا۔

"ہم گُم تو نہیں ہو گئے؟" اُس نے میرے ساتھ لگتے ہوئے کہا۔

میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آس پاس "دیکھنے" کی کوشش کی۔ صرف ہوا اور پانی کا شور اور گھٹا ٹوپ اندھیرے میں سلجوق کا روشن ماتھا۔

"نہیں" میں نے اُسے تسلّی دی۔"ہم سڑک پر چل رہے ہیں اور اِن علاقوں میں صرف ایک ہی سڑک ہے"

"ہاں لیکن یہ سڑک دو سمتوں کو جاتی ہے۔ یہ نہ ہو کہ ہم چین کی جانب چل دیئے ہوں۔ ابن انشاء کی طرح "چلتے ہو تو چین کو چلیئے ــــــ ہیں الو؟" وہ ہنسا اور اُس کی ہنسی میں اِس انجانے پہاڑی سلسلے کی رات ہیبت جھلکی ــــــ اور میں بھی قدرے متاثر ہو چکا تھا لیکن اظہار نہیں کرتا تھا۔

ہمارے قدموں کی ٹھَپ ٹھَپ ــــــ چٹانوں سے ٹکراتی ہوا کا شور اور تاریک خلا جس میں ہم چلتے جاتے تھے۔ ایک جگہ تاریکی مزید گہری ہوئی، ہمارے اوپر وہی مہیب چٹان جھکی ہوئی تھی ایک سیاہ بادل کی طرح جو تاریکی میں بھی شکل رکھتا ہے۔ پھر دائیں ہاتھ سے تیز اور یخ ہوا کے تھپیڑے شرلاٹے بھرتے ہوئے آئے اور ہمارے قدم ڈولنے لگے۔ پانی کی آواز بھی نزدیک ہو گئی اور ہم جان گئے کہ ہم پسو گلیشیئر کے عین سامنے سے گذر رہے ہیں اور ہمارے قدموں تلے سڑک کے نیچے اُس کے پانیوں کی ندی بہتی ہوئی دریائے ہنزہ کی طرف جا رہی ہے اور ہم چین نہیں جا رہے ہوٹل جا رہے ہیں۔

تاریکی میں لالٹین کا بُجھتا ہوا جگنو دکھائی دیا اور ہم نے اپنے قدم تیز کر دیئے۔

ہوٹل کے برآمدے میں چند لوگ سر جوڑے کرسیوں پر بیٹھے تھے، انہوں نے ہمیں آتے دیکھا اور ہم اُن کے قریب سے گذر کر کمرے میں چلے گئے۔ سلجوق نے ہیڈ لائٹ اُتار کر بستر پر رکھی تو علیم دستک دے کر اندر آ گیا "صاحب یہ لوگ آپ سے ملنا چاہتے ہیں"

"مجھ سے؟"

"جی صاحب گاؤں سے آئے ہیں"

میں باہر آ گیا۔ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے دو مرد اُٹھے اور بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا "ہم بہت دیر سے آپ کا انتظار کر رہے تھے" اُن میں سے ایک صاحب

نے نظریں جھکا کر بات شروع کی "میرا نام حقیقت ہے، مقامی سکول میں مدرس ہوں اور مجھے سب لوگ ماسٹر حقیقت کہتے ہیں۔ پھسو میں آپ کی آمد کے بارے میں سُنا تو ملنے چلا آیا"

"آپ نے پھسو میں میری آمد کے بارے میں کس سے سُن لیا؟"

"پھسو چند گھروں کا نام ہے تار ڑ صاحب اور ایک سڑک کا اور اس سڑک پر آج صرف حسنات کی ویگن آئی ہے اور اُس میں سے واحد مسافر آپ تھے جو اِدھر اُترے ـــــ شائد آپ کا بیٹا بھی آپ کے ساتھ ہے جو ابھی ابھی ـــــ"

"جی میرا بیٹا بھی میرے ساتھ ہے"

"میں بازار میں چائے پینے کے لئے گیا تو اُدھر آپ کی آمد کا پتہ چلا ـــــ"

ماسٹر حقیقت ایک ایسے انسان تھے جن کے لئے ماحول، مقام اور ترقی یافتہ مرکزوں سے دوری کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ وہ ہر لمحہ فطرت سے سیکھتے ہیں، زمین سے رابطہ رکھتے ہیں۔ پہاڑوں اور برفانی تودوں میں گھرے ہونے کے باوجود، اکیلے ہونے کے باوصف وہ صرف اپنی سوچ سے، اپنی دانش کو بروئے کار لا کر کل عالم کے علم کو محسوس کرتے رہتے ہیں۔

"آپ باہر کی دنیا کو ہمارے وجود کے بارے میں بتائیے" ماسٹر حقیقت لگاتار بول رہے تھے۔ لیکن آنکھیں جھکائے نہایت عاجزی اور انکساری کے ساتھ "انہیں بتائیے کہ ادھر صرف ہنزہ نہیں ہے اور بھی علاقے ہیں جو ہنزہ سے کہیں زیادہ حسین اور دلفریب ہیں، شمشال ہے، چپرسان کی وادی ہے، ہم ہیں ـــــ باہر کے لوگ ہمیں بھی ہنزہ میں شمار کرتے ہیں حالانکہ ہماری زبان یعنی گوجال کے علاقے کی زبان بالکل مختلف ہے، یہ ترکی اور واخی کے زیادہ قریب ہے اور ہم خود واخی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس کے افراد افغانستان

کی واخان پٹی، روس اور چین میں آباد ہیں - ہماری رسوم و روایات ہنزہ سے الگ ہیں - میں نے اِن علاقوں کے بارے میں ایک تحقیقی کتاب بھی لکھی ہے لیکن پھسّو کے رہنے والے ایک عام ماسٹر کی کتاب کون چھاپے گا - اگر آپ کے پاس وقت ہوا تو میں آپ کو اپنے مسودے دکھاؤں گا —— کل آپ میرے ہاں تشریف لائیے - میرا چھوٹا سا باغ بھی ہے اور درختوں پر اب بھی چند خوبانیاں موجود ہیں —— آپ ضرور آئیے گا ——"

"صاحب کھانا تیار ہے" عظیم نے کچن میں سے برآمد ہو کر اطلاع کی -

"آپ بھی آئیں ماسٹر صاحب"

"نہیں میں کھا چکا ہوں —— آپ آرام کیجئے —— انشاءاللہ کل ملاقات ہوگی، ضرور تشریف لائیے گا"

"آپ کا ایڈریس ؟" سلجوق نے خوبانیوں کا تذکرہ سن کر فوری دلچسپی کا اظہار کیا -

"میرا ایڈریس بس یہی ہے —— ماسٹر حقیقت —— پھسّو" وہ ہنسے اور پھر سر جھکائے اپنے ساتھی کے ہمراہ اندھیرے میں اُتر گئے -

"آئیے صاحب"

"اِدھر ہی لے آؤ برآمدے میں"

"اِدھر ؟ صاحب ہمارا فسٹ کلاس ڈائننگ روم بھی ہے" عظیم نے سینہ پھلا کر کہا "اور اِدھر ہوا بہت سرد ہے صاحب"

"ڈائننگ روم" میں میز پر سُوپ تھا، ساگ اور آلو تھے اور بے حد مزیدار تھے - لالٹین کی روشنی میں ہم دونوں کھانا کھا رہے تھے اور عظیم کسی وکٹورین بٹلر کی طرح مؤدب ہاتھ باندھے کھڑا تھا "کھانا ٹھیک ہے صاحب

"پانی ——— روٹی اور چاہیے صاحب ——— آملیٹ بنا لاؤں ———"

پھسو گلیشیر کے عین کنارے پر دنیا کی اس واحد عمارت کو ابھی فطرت کے پُر شور عناصر قبول نہیں کر پائے تھے۔ یہ اُن کی راہ میں رکاوٹ تھی اور وہ اس کے دائیں بائیں اور چھتوں پر حاوی ہو رہے تھے جیسے اُسے راہ سے ہٹا دینا چاہتے ہوں۔ ہوا کے شرلاٹے غضب میں آئے ہوئے درویشوں کی طرح ہُو ہُو کرتے اس پر قہر پھونک رہے تھے، کھڑکیاں بند تھیں۔ مگر اُن کے پٹ ہوا کے دباؤ سے پھول رہے تھے اور ہم اُن کی تندی سے باخبر ایک بے اطمینان مگر پُر مسرت احساس لئے کھانے پر جھکے رہے۔

ہوا کی آہٹوں میں کسی مکانکی شور کا اضافہ ہوا۔ ہارن کی آواز سنائی دی اور برآمدے میں تیز روشنی پھیل گئی۔

"شاید کوئی مسافر" عظیم باہر چلا گیا۔

دو سائے ہاتھ ملتے ہوئے اندر آئے۔ اُن کے بدنوں کو تیز ہوا نے جھکا رکھا تھا، لالٹین کی روشنی اُن کے چہروں پر پھیلی ——— دو نوجوان چہرے

"کچھ کھانے کو ہوگا؟"

"ہاں صاحب ——— آپ بیٹھئے" عظیم کچن میں چلا گیا۔

"السلام و علیکم" وہ ناکافی روشنی میں ہمارے وجود سے آگاہ ہوئے۔

"وعلیکم السلام"

"ہماری ویگن خراب ہو گئی تھی" وہ کرسیوں کو گھسیٹ کر اُن پر ڈھیر ہو گئے۔ "آج صبح گلگت سے چلے تھے"

انہوں نے بتایا کہ وہ آغا خان رورل ورکس پروگرام کے کارکن ہیں اور پھسو کے نواح میں واقع پہاڑی قصبوں میں آب رسانی کے منصوبوں کے بارے

میں ایک فلم رپورٹ بنانے کے لئے آتے ہیں۔ ہنزہ اور گوجال میں ہم نے اِس پروگرام کے بورڈ اور دفاتر جابجا دیکھے تھے۔ رفاہِ عامہ کے لئے آغا خاں فاؤنڈیشن کی جانب سے ان پس ماندہ علاقوں میں مشنری سپرٹ کے ساتھ جو کام ہو رہا ہے وہ قابلِ قدر ہے ــــ کھانے سے فارغ ہو کر چائے کی پیالی پر ہم لوگ رات گئے تک اُن کے منصوبوں کے بارے میں گفتگو کرتے رہے اور ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ کل شام ہم گلگت کی پرانی پولو گراؤنڈ میں سُرخ، پولو شرٹ اور سفید گھوڑے والے جس کھلاڑی کو دیکھ رہے تھے اِن نوجوانوں میں سے ایک اُس کا بھائی ہے اور دوسرا بیٹا ــــ اور وہ کھلاڑی بُلبُل جان تھا۔

ہمارے کمرے کا ماحول ہوٹل سے باہر لیٹے پھسو گلیشیئر سے کچھ اتنا مختلف نہ تھا۔ بستر یخ تھے اور ہر سانس کے ساتھ بدن مزید ٹھنڈا ہوتا تھا۔

غسل خانے میں کپڑے بدلتے ہوئے میرے گھٹنے کسی ڈِسکو ڈانسر کی طرح ایک دوسرے سے بھڑتے رہے۔ کمرے میں واپس آیا تو سلجوق جین اور جیکٹ سمیت بستر میں روپوش تھا ــــ میرا زکام سنجیدہ ہو رہا تھا اور جسم قدرے گرم تھا۔

"سلجوق میاں یہاں کتنے روز ٹھہرا جائے؟"

"ابو شمشال نہ چلیں ہنر بیگ کے ساتھ؟" وہ رضائی میں سے بولا۔

"نہیں ہمارے پاس وقت نہیں ہے، راستہ بھی وہاں تک خطرناک ہے، ابھی ہنزہ جانا ہے ــــ اور عید سے پیشتر گھر بھی پہنچنا ہے۔ امی، سمیر اور عینی ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے"

"ہاں ابو آج میں اُن کے لئے تھوڑا سا اُداس ہو گیا ہوں" اُس کی آواز میں تھراہٹ تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر رضائی میں لپٹے ہوئے اس کے بدن کو پیار سے تھپکا اور پھر اپنے بستر میں لپٹ گیا —— باہر پھسو گلیشیئر پر ہوا سیٹیاں بجاتی تھی اور وحشی ہوتی جاتی تھی۔



اِس گلیشیئر کی ہَوا بہت سرد ہے۔

برآمدے میں رکھی آرام کرسیوں پر ہمارے بدن آرام سے تھے کیونکہ اُن پر دھوپ پھیل رہی تھی اور اُن کے سامنے شاہراہِ ریشم کا ایک طویل ٹکڑا پہاڑوں میں بچھا ہوا تھا، ایک سیاہ فیتہ جو بلند ہوتا دکھائی دیتا تھا اور پھر غائب ہو جاتا تھا اور پھر نمودار ہو جاتا تھا۔ سامنے پھسو کونز کی چٹان تکونیں سورج کے قریب تھیں اور اُس کی روشنی میں تھیں اور اُن کے پاؤں میں کہیں دریا تھا جو صرف اپنے شور کی وجہ سے یہاں چار پانچ کلومیٹر دور اپنے وجود کا پتہ بھیجتا تھا۔ دریا کے چوڑے پاٹ میں جہاں جہاں خشکی تھی وہاں چراگاہیں تھیں اور اُن سے اِدھر کنارے کے ساتھ ساتھ کھیت تھے اور کھیتوں کے اختتام پر وہ سڑک تھی جس کے کنارے شیسپر دیو تھا اور جس کے برآمدے میں رکھی آرام کرسیوں پر ہم تھے اور اپنے سامنے اس وسیع لینڈ سکیپ کو اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے ایک وسیع کولوسیم میں صرف دو تماشائی بیٹھے ہوں اور بقیہ رومی تھیٹر خالی پڑا ہو۔

عظیم ہمیں ناشتہ دے کر گاؤں جا چکا تھا اور ہمیں بتا چکا تھا کہ آج صبح منہ اندھیرے حسنات کی ویگن اپنے چینی حاجی باباؤں سے لدی ہوئی

ہوٹل کے سامنے سے گذر کر سوئے گلگت جا چکی تھی اور اب ہمیں انتظار کرنا تھا، یہیں برآمدے میں بیٹھ کر کسی ایسی ویگن یا جیپ کا جو ہمیں گنیش واپس لے جا سکے اور گنیش سے دو کلومیٹر کی چڑھائی پر بلتت تھا، ہنزہ تھا' جسے دیکھنے کے لئے دراصل ہم گھر سے نکلے تھے اور اس کی بجائے یہاں آن بیٹھے تھے اس برآمدے میں اور ہماری پشت پر پھسو گلیشیر کا یخ بستہ سانس تھا اور اس عظیم لینڈ سکیپ کی وسعت میں ہم انتظار کر رہے تھے۔ عظیم نے کہا تھا، صاحب آپ آرام سے بیٹھو۔ اِدھر سواری کم ہی آتی ہے۔ ہو سکتا ہے آج آجائے، ہو سکتا ہے کل ـــــ بہرحال آپ آرام سے بیٹھو۔ اور ہم آرام سے بیٹھے سستا رہے تھے اور شاہراہِ ریشم کی ویران لمبائی کو آنکھوں سے ناپ رہے تھے ـــــ گلگت کی جانب سے ایک جیپ آئی، دور چٹان میں سے ایک نقطے کی صورت نمودار ہوئی اور ہم اُسے دیکھنے لگے، دیکھتے رہے اور وہ یہاں سے ایک چیونٹی کی مانند رینگتی دکھائی دیتی تھی۔ جہاں چڑھائی ہوتی وہاں وہ رُکی ہوئی نظر آتی رہتی، ایک ہی جگہ پر اٹک جاتی اور پھر بلندی پر پہنچنے کے بعد نیچے اُترتی تو پھر رینگتی دکھائی دیتی۔ کسی موڑ پر وہ غائب ہوتی اور تا دیر غائب رہتی۔ خاصی دیر بعد وہ ہمارے عین سامنے سڑک پر سے گذر گئی۔ ہم نے اُس جیپ کو کم از کم دس منٹ تک اپنے سامنے کی لینڈ سکیپ میں حرکت کرتے ہوئے دیکھا ـــــ ویران رومی تھیٹر میں بیٹھے ہوئے دو تماشائیوں کی طرح اطمینان سے۔

"ابو اگر آج کوئی سواری نہ ملی تو پھر ہم کیا کریں گے؟"

"بورت جھیل چلیں گے اور دیکھیں گے کہ وہاں روسی مرغابیوں کی آمد شروع ہوئی ہے یا نہیں ـــــ یا پھر ٹروُر کی اُس چوٹی پر پہنچنے کی کوشش کریں

گے جہاں سے افغانستان کی واخان پٹی دکھائی دیتی ہے اور اُس کے ساتھ روس کی سرزمین پر رینگتی ٹریفک نظر آتی ہے اور چینی ترکستان کا علاقہ نظر آتا ہے۔"

"روس، افغانستان اور چین" اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں "۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم ان تینوں ملکوں کے عین اوپر بیٹھے ہوئے ہیں؟"

"ہاں یہ وہی جگہ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہاں چار سلطنتیں ملتی ہیں"

"چوتھی کونسی ابّو؟"

"پاکستان اور کونسی"

"ہاں ___" وہ سر جھٹک کر مسکرایا "عجیب بات ہے یہاں اِس جگہ بیٹھے ہوئے یہ نہیں لگتا کہ ہم پاکستان میں ہیں۔ پاکستان تو لاہور ہے کراچی ہے، کوئٹہ اور پشاور ہے ___ لیکن یہ جگہ پاکستان نہیں لگتی"

"ماسٹر حقیقت ٹھیک کہتا تھا، لوگوں کو ہمارے وجود کے بارے میں آگاہ کرو"

"ابو ماسٹر حقیقت کی خوبانیاں ___"

"ہاں ہاں چلیں گے ___ دوپہر کے کھانے کے بعد"

دُور شاہراہِ ریشم پر چار پیکر نمودار ہوئے اور چڑھائی چڑھنے لگے ___ ہم انہیں دیکھتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔

"ابّو آج صبح عظیم مجھے بتا رہا تھا کہ ایک زمانے میں پھسو میں جرم کرنے والوں کو سزا کے طور پر پھسو کونز میں واقع کسی وادی میں بھیج دیا جاتا تھا اور مجرم اپنا ہل، بیج اور کھیتی باڑی کا سامان وغیرہ ساتھ لے جاتا تھا اور وہاں جا کر ایک

چھوٹا سا کھیت بنا کر رہنے لگتا تھا۔ اس طرح کئی وادیاں آباد ہو گئیں — کیا یہ سچ ہے؟"

"پتہ نہیں بیٹا لیکن اس روایت کو سُن کر جی چاہتا ہے کہ بندہ یہاں کوئی جرم کرے اور سزا کے طور پر کسی وادی میں بھیج دیا جائے —"

"کمال ہے ابّو" سلجوق نے دور سڑک پر ہماری جانب حرکت کرتے ہوئے پیکروں کی طرف اشارہ کیا "یہ تو کوئی غیر ملکی ہپّی ہیں۔ دیکھیں انہوں نے رُک سیک اُٹھا رکھے ہیں"

اُن چاروں نے جنہیں ہم ایک عرصے سے شاہراہِ ریشم پر چلتا ہوا دیکھ رہے تھے واقعی رُک سیک اُٹھا رکھے تھے اور ہپیوں کی طرح جُھکے جُھکے چلے آ رہے تھے۔ جب خاصی دیر بعد وہ ہمارے سامنے پہنچے تو دم لینے کے لئے رُک گئے۔ اُن میں سے ایک نے جو دور سے لڑکا دکھائی دے رہا تھا اپنا سامان سڑک پر پھینکا اور ہاتھ ہلاتا ہوا ہمارے پاس آنے لگا۔ اُس نے نیلی جین اور جوگر شوز پہن رکھے تھے، گلے میں ایک سنہری زنجیر لٹک رہی تھی اور بھورے اور لمبے بال ہپیوں ایسے تھے۔

"السلام و علیکم" اس نے قریب آکر کہا۔

"ابّو یہ ہپی تو مسلمان ہے" سلجوق نے آہستہ سے کہا۔

"آپ پھسو کب آئے؟" وہ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر پسینہ پونچھنے لگا۔

"اور آپ پھسو کب آئے؟"

"میں تو پھسو میں رہتا ہوں —" اس نے اپنے بھورے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "ہماری کھیتیاں ہیں۔ دریا کے پار، میں اور میری بہنیں صبح سویرے وہاں گئے تھے اور اب دال کے پودے اور چارہ اُٹھا کر واپس گاؤں

جا رہے ہیں۔"

اب غور کیا تو معلوم ہوا کہ وہ تینوں خواتین بھی غیر ملکی نہیں تھیں بلکہ اپنی دیسی پیداوار تھیں اور کیا خوب پیداوار تھیں۔ اُن کی شباہت اور خاص طور پر ان کے رُک سیکوں سے ہمیں دھوکہ ہوا تھا ——— چونکہ ان علاقوں میں کوہ پیما جماعتیں اکثر آتی رہتی ہیں اس لئے بیشتر باشندوں کے پاس اُن سے خریدے ہوئے رُک سیک ہیں جنہیں وہ کھیتوں سے چارہ لانے اور سامان ڈھونے کیلئے استعمال کرتے ہیں۔

اس مقامی ہپّی نے ہمیں بتایا کہ وہ کراچی کے کسی انجینئرنگ کالج میں زیرِ تعلیم ہے اور گرمیوں کی چھٹیاں گذارنے اپنے گاؤں آیا ہوا ہے اور اس دوران کاشتکاری میں اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ وہ صرف لباس میں جدید تھا مگر خوش قسمتی سے اس کی خصلت ابھی تک قدیم تھی۔ وہ اپنی وراثت سے الگ نہیں ہوا تھا اور پشت پر چارہ ڈھونے کو عار نہیں سمجھتا تھا۔ نیلی امریکی جین۔ جاگر شوز اور گلے میں سنہری زنجیر پہن کر اس طرح مزدوری کرنا ایک بڑے دل اور احساسِ کمتری سے پاک ہونے کی علامت تھی۔

اُس نے اپنی بہنوں کی جانب دیکھا جنہیں تجسس ہوٹل کے برآمدے کے قریب لا رہا تھا اور پھر غصّے سے کچھ کہا۔ اُن تینوں نے اپنے لدے ہوئے رُک سیک اُٹھائے اور ہماری طرف دیکھتی ہوئیں گاؤں کی جانب اُترنے لگیں۔

"آپ کب تک یہاں ہیں؟" اُس نے مجھ سے پوچھا۔

"جب تک کوئی سواری ہمیں یہاں سے اُٹھا نہ لے، ہم یہیں ہیں۔"

"آپ کو پھتسو پسند آیا؟"

"بہت"

"اور آپ کو؟" اُس نے سلجوق سے پوچھا۔

"آپ کے اِس گلیشیر کی ہوا بہت سرد ہے۔" سلجوق نے برف کی جانب ناک گھما کر ایک طویل سانس لیا۔

"ہوا تو سردیوں میں سرد ہوتی ہے" وہ ہنسنے لگا" دیکھئے میں نے صرف ایک ٹی شرٹ پہن رکھی ہے"

"امپورٹڈ لگتی ہے۔" سلجوق نے ٹی شرٹ کی جیب پر لگے مونوگرام کو قریب ہو کر دیکھا۔

"کراچی میں میرے ایک دوست کی بوتیک شاپ ہے۔ میں صرف اُسی کے کپڑے پہنتا ہوں ــــ شائد امپورٹڈ ہی ہے ــــ"

اِس دوران وہ گاؤں کی طرف اُترتی سڑک کی جانب کبھی کبھار دیکھتا ــــ کیونکہ اس کی بہنیں کچھ دور جا کر پھر رُک گئی تھیں اور رُک سیک سڑک پر رکھ کر گپیں ہانک رہی تھیں۔ اُس نے پہلے آرام سے اور پھر غصّے سے انہیں چلے جانے کا اشارہ کیا اور وہ جواب میں ہاتھ ہلا ہلا کر ہنسنے لگیں۔

"میں پھر آؤں گا۔" وہ اُٹھا، سڑک پر جا کر اپنا بوجھ اُٹھایا اور بہنوں کے قریب جا کر انہیں کچھ کہا۔ اُن سب نے ایک مرتبہ ہماری طرف دیکھا اور پھر رُک سیک اُٹھا کر گاؤں کی طرف چلنے لگیں۔

ہم پھر خالی سڑک کو گھورنے لگے۔

"ماسٹر حقیقت کے باغ میں چلیں ابو ــــ وہ خرمانیاں ــــ"

"یار تم اتنے ندیدے تو نہیں ہوتے تھے"

"ابو قسم سے ہنر بیگ کے گھر جو خرمانیاں کھائی تھیں ناں ــــ واہ واہ کیا ٹیسٹ تھا اُن کا، بورت جھیل کل دیکھیں لیں گے، ٹھیک ہے؟"

"خرمانیاں کیوں کہتے ہو خوبانیاں کیوں نہیں کہتے؟"

"ابو جو لاہور میں ہوتی ہیں وہ خوبانیاں ہوتی ہیں لیکن پھسو والی مزیدار خرمانیاں ——"

"ٹھیک ہے۔" میں نے بمشکل اپنے آپ کو کرسی کے آرام سے علیحدہ کیا۔ "میں کپڑے بدل لوں پھر چلتے ہیں ماسٹر حقیقت کی —— خرمانیاں کھانے۔"

مجھ پر پھسو گلیشیئر کی انجمادی سردی اثر انداز ہو چکی تھی۔ میں مکمل طور پر زکام زدہ اور کچھ کچھ بخار زدہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ میں نے ایک اور بھاری سویٹر پہنا اور پھندنے والی اونی ٹوپی کانوں تک کھینچ لی۔ باہر نکلنے سے پیشتر سوچا کہ غسل خانے کی سہولت کا فائدہ اُٹھا لیا جائے۔ میں اندر جا کر سہولت سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش میں تھا کہ دروازے پر زور زور سے دستک ہوئی اور پھر سلجوق کی پریشان ہراساں آواز سنائی دی۔ "ابو۔ ابو"

"یار کیا ہے، کیوں شور مچا رہے ہو!"

"ابو باہر سڑک پر ایک چھوٹی سوزوکی وین رکی ہے جو ہنزہ جا رہی ہے چلنا ہے؟"

اب ظاہر ہے یہ عجیب مقام اور حالت تھی جس میں مجھے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ آیا فوری طور پر باہر جا کر شاہراہ پر رکی ہوئی وین میں ابھی اِس وقت بھاگ دوڑ کر کے سوار ہوا جائے اور ہنزہ پہنچا جائے یا یہ کہ پھسو میں ٹھہر کر بورت لیک اور پھسو گلیشیئر دیکھنے کے علاوہ اُس چوٹی پر جایا جائے جہاں سے تین ملکوں کی سرزمین ننگی آنکھ سے دکھائی دیتی ہے۔

"تمہارا کیا خیال ہے سلجوق؟" میں نے ذمہ داری اُس کے کاندھوں پر ڈال دی۔

"پتہ نہیں ابو"

"پتہ نہیں کیا، ماشاءاللہ جوان جہان ہو فیصلہ کر سکتے ہو"

"ابو وہ جو لڑکا تھانان ہی، وہ اِس وین کو لایا ہے، آپ بتائیں"

"یار میں بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں اِس وقت تم بتاؤ"

"ابو میرا جی چاہتا ہے۔ پھسو میں ٹھہرنے کو ۔ بہت ۔ لیکن ابو ہو سکتا ہے یہاں سے کئی روز تک کوئی اور سواری نہ ملے اور عید بھی قریب آ رہی ہے ۔ لیکن ابو جیسے آپ کی مرضی"

"کمال کا بچہ ہے فیصلہ ہی نہیں کر پاتا ۔" میں نے جھنجھلا کر اپنے آپ کو تیزی سے درست کیا اور جین چڑھا کر ہانپتا ہوا باہر آگیا ۔ ایک چھوٹی سی وین شاہراہِ ریشم پر کھڑی ہارن دیتی جا رہی تھی ۔ میں نے ایک لمحے کے لئے توقف کیا اور پھر سواری نہ ملنے کے باعث پھسو میں پھنس جانے کے خوف سے کہا "چلو"

ہم دونوں نے افراتفری میں سامان سمیٹا اور اسے گھسیٹتے ہوئے سڑک پر آ گئے۔ وہ مقامی ہی وین کے ڈرائیور کو صبر کی تلقین کر رہا تھا "ان لوگوں کے پاس جگہ تو نہیں تھی لیکن میری درخواست پر مان گئے ہیں"

"خدا حافظ" اس نے ہاتھ آگے کر دیا۔

میں نے ہاتھ ملانے سے پیشتر ہوٹل کا کرایہ اور خوراک کی قیمت اُس کے حوالے کر دی تاکہ وہ عظیم کو ادائیگی کر دے اور اندازے سے زیادہ رقم دی "شکریہ ۔ اور پھر ملیں گے"

وین میں واقعی جگہ نہیں تھی لیکن بنالی گئی۔ ہمارے بیٹھتے ہی وہ ایک جھولے کی طرح جھولی اور پھر شاہراہِ ریشم پر جھولتی چلی گئی ۔ ادھر چٹانیں

اُدھر دریا ــــــ اور بیچ میں ہماری جھولتی ہوئی وین جو درجنوں مسافروں کا بوجھ کھینچتی ایک کٹی کھاتی ہوئی پتنگ کی طرح کندھے ہلاتی کبھی اس طرف کبھی اس طرف اور ساتھ ہی ہمارے دل بھی کبھی ڈوبے کبھی نکلے ــــــ یا وحشت یہ کس شے میں بیٹھ گئے ہیں۔ اچھے بھلے ہوٹل شیسپر ویو کے برآمدے میں بیٹھے دھوپ سینک رہے تھے، بورت لیک اور گلیشیئر پر جانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ ماسٹر حقیقت کی خوبانیاں ہضم کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ کہاں بیٹھے تھے اور اب کہاں بیٹھ گئے ــــــ بہر حال تھوڑی دیر کے بعد عادت ہو گئی اور یوں بھی کیسٹ پلیئر اتنا چیختا ہوا بلند تھا کہ اس شور میں اپنے دل کی دھک دھک سنائی نہیں دیتی تھی صرف کوئی شے حلق میں اُچھلتی ہوئی محسوس ہوتی تھی ــــــ

وین کے پچھلے حصے میں پھسّو کی تکونی چٹانیں تصویر ہو رہی تھیں مگر وین کے جھولنے کی وجہ سے آؤٹ آف فوکس ہوتی جاتی تھیں۔

سلجوق جو بقیہ مسافروں کی طرح دونوں ہاتھوں سے چھت سے لگے ہوئے ڈنڈے کو تھامے ہوئے اکڑوں بیٹھا تھا، کہنے لگا "ابّو یہ ذرا میری جیب میں سے ایک خرمانی نکال کر میرے منہ میں تو ڈال دیں"

"خرمانی؟"

"ہاں ہنزبیگ والی تین خرمانیاں میں نے سنبھال لی تھیں"

"بُری بات ــــــ"

"ابّو بہت مزیدار تھیں اس لئے ــــــ"

میں بھی اگرچہ دونوں ہاتھوں سے راڈ کو تھامے ہوئے تھا لیکن اوندھے منہ گرنے کا خطرہ مول لے کر میں نے اُس کی جیب سے خرمانیاں نکالیں،

دوا اس کے منہ میں ڈالیں اور ایک خود نوش کی ——بلاشبہ انہیں چوری کرنا جائز تھا۔ کیا ناجائز قسم کا ذائقہ تھا جو لفظوں میں نہیں آسکتا۔

گلمت میں ہم چند لمحوں کے لئے رُکے اور پھر وہی "جھولنا جھلاڈری" شروع ہوگیا—— چونکہ دین کا پچھلا حصہ بالکل ڈبہ نما تھا اس لئے کھڑکیوں کی غیر موجودگی میں ہم باہر کے نظاروں سے بھی یکسر محروم تھے۔ پتہ نہیں کیا کیا اور کیسا کیسا گذرتا رہا اور شائد یہ ہمارے حق میں اچھا ہی ہوا کہ ہم یوں نابینا ہو کر سفر کرتے رہے ورنہ وہاں دریا تو ہوگا اور بہت گہرائی میں کہیں ہوگا اور کھڈیں بھی ہوں گی اور بہت خطرناک ہوں گی۔ ہمارے اوسان تب بجا ہوئے جب وین جا چکی تھی اور ہم شاہراہ ریشم پر گنیش میں "کریم آباد - دو کلومیٹر" کے بورڈ کے سامنے کھڑے تھے اور ہمارے سر پر وادیٔ ہنزہ کے پاپلر اور برفپوش چوٹیاں جھکی ہوئی تھیں۔ پہاڑوں کی عظمت کی آخری حد، ہنزہ——



ہُنزہ داستان

دراصل ہُنزہ داستان کا آغاز اب ہوتا ہے۔

ہُنزہ

ہُنزہ - ۱۸۲۰ء

ولیم مورکرافٹ اور جارج ٹریبک لکھتے ہیں "نگر یا برشال سکردو گلگت روڈ پر ہے۔ یہ وادی تین دن کی مسافت پر ہے۔ دریا میں سونا ہے۔ نگر سے پرے سطح مرتفع پامیر کے دامن میں ضلع ہنزہ ہے۔ شہر کا نام کنجوت ہے۔ جہاں سلیم شاہ رہتا ہے۔ یہاں سے بدخشاں کو ایک درّہ نکلتا ہے۔"

ہُنزہ - ۱۸۵۰ء

"اِسے ہُن دیس یعنی برفوں کا ملک کہا جاتا ہے۔ چینیوں نے اسے کنجوت کا نام دیا تھا اور ہندو اِسے ہُما دیس یعنی پہاڑوں کا وطن کہتے ہیں۔ اگر کوئی جرم کرتا ہے تو اُسے ہنزہ سے نکال دیا جاتا ہے اور یہ بہت بڑی سزا ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہنزہ نام کا ایک گاؤں کاکیشیا کے پہاڑوں میں واقع ہے، اس کے باشندوں کو امیر تیمور نے نکال دیا اور وہ یہاں آکر آباد ہو گئے۔"

ہُنزہ - ۱۸۷۶ء

"یہ وادی آٹھ نوہزار فٹ کی بلندی پر ہے اور دریا پر اس طرح جھکی ہوئی ہے۔ جیسے پریوں کا کوئی گمشدہ باغ۔ پاپلر کے درختوں پر انگوروں کی بیلیں لٹکتی ہیں۔ گھروں کی چھتوں پر خوبانی کا پھل سوکھتا ہے اور راستوں پر شہتوت بکھرے ہوتے ہیں جن سے برانڈی بنائی جاتی ہے۔ یہ لوگ گرمیوں میں صرف پھل کھاتے ہیں۔ لکڑی کی کمی کے باعث آگ نہیں جلاتے۔"

ہُنزہ — ۱۸۹۰ء

"اس وادی میں سکوں کے بغیر امارت ہے۔ ٹیکسوں کے بغیر تحفظ ہے۔ پولیس بالکل نہیں کیونکہ جرم نہیں ہوتا۔ ہر گاؤں کا ایک بینڈ ہے جس کی دُھن پر بچے بوڑھے اور عورتیں رقص کرتے ہیں۔ شراب بہت عمدہ ہے اور عام ہے۔"

ہُنزہ — ۱۹۰۰ء

ایک ایسی سرزمین جہاں بس اتنا ہے۔ جتنی ضرورت ہے۔ نہ کم نہ زیادہ"

"ہنزہ کے باشندوں کے اعصاب لوہے کے تاروں کی طرح سخت ہیں اور وائلن کے تاروں کی طرح حساس"

ہُنزہ — ۱۹۸۴ء

میں اور سلجوق شاہراہِ قراقرم پر گنیش کے قصبے کے نزدیک "کریم آباد — دو کلومیٹر" کے بورڈ کے سامنے کھڑے تھے اور ہمارے سر پر وادی ہُنزہ کے پاپلر اور برفپوش پہاڑ جھکے ہوئے تھے —— اور اُن میں کہیں کنجوت ہوگا۔ جو بلتت تھا اور اب کریم آباد ہے —— ہُنزہ کا صدر مقام —— ہم زرافوں کی طرح گردنیں اٹھائے اُوپر دیکھ رہے تھے اور ہماری پُشت پر دریائے ہُنزہ کے پار ایک بلند برفانی درّے کی آغوش میں ریاست نگر تھی جو پہاڑوں کے گھیرے میں تھی اور وہاں تک پہنچتے پہنچتے سورج کی روشنی سایہ ہوئی جاتی تھی۔

وقت دوپہر کا تھا۔ دھوپ چمکتی تھی اور اُس کی حدت میں خنکی کے سانس تھے۔ ایک کچے مکان کی ٹوٹی ہوئی دیوار کی اوٹ میں سے سُرخ تربوز چہرے والا ایک نوجوان منہ کھولے ہمیں دیکھے جا رہا تھا۔ میں نے اشارہ کیا تو وہ اُسی طرح منہ کھولے ہمارے پاس آ گیا۔

"کریم آباد" میں نے پہاڑ میں گم ہوتے راستے کی جانب انگلی اُٹھائی۔

اُس نے سر ہلا دیا۔

"یہ رُک سیک لے جاؤ گے؟"

اُس نے پھر سر ہلایا۔

"کتنے پیسے؟"

وہ اپنی مقامی زبان میں کچھ بڑبڑایا لیکن اُس کا منہ بدستور کھلا رہا، ہنزہ میں آپس کی شادیوں کی وجہ سے بہت سارے بچے ذہنی طور پر تندرست نہیں ہوتے اور یہ اُنہی میں سے ایک لگتا تھا جو اب بڑا ہو چکا تھا —— اُس نے انگلیوں کی مدد سے اشارہ کیا کہ دس روپے لوں گا۔

رُک سیک اُس کی مضبوط پشت پر لاد دیا گیا اور وہ سر جھکا کر اُوپر چڑھنے لگا۔ پہاڑی کے پہلو میں سے اُٹھتا ہوا یہ ایک چھوٹا سا راستہ تھا جس پر بُھر بُھری ریت کی موٹی تہ بچھی ہوئی تھی۔ اِس میں پاؤں دھنستا تھا اور اُسے اُٹھا کر آگے رکھنے میں مشقت کرنا پڑتی تھی۔ میرا زکام مشغلے سے بڑھ کر بیماری کے قریب آ رہا تھا اور میں نے اپنے ٹوٹتے ہوئے بدن کو سویٹر اور اونی ٹوپی میں ڈھانپ رکھا تھا۔ میرے ہاتھ میں ایک دادا جانوں والی چھڑی تھی جس کی مُٹھی پر بوجھ ڈال کر میں ریت سے قدم نکال نکال کر آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ سورج کی حدت میں سے خنکی کے سانس کم ہونے لگے اور گردن پر پسینے

کے قطرے پھسلنے لگے۔ رُک سیک اُٹھانے والا نوجوان خاصی دور جا چکا تھا، اُس کے اور میرے درمیان سلجوق تھا جس کے نوجوان قدموں سے قدم ملانا میرے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ دائیں جانب سیبوں کا ایک باغ آیا جس کی چند ٹہنیاں راستے پر آئی ہوئی تھیں ـــــ سیب کو گوالمنڈی کی ریڑھی پر بِکتے دیکھنا اور وادیٔ ہنزہ کے کسی باغ میں درخت کے ساتھ لٹکتے دیکھنا دو مختلف تجربے ہیں۔

سلجوق کھڑا ہو گیا "ابو ایک سیب توڑ لوں؟"

سیبوں پر گرد کی تہیں جمی ہوئی تھیں "نہیں ـــــ آرام سے چلتے جاؤ"

اس نے سر جھٹکا اور چلنے لگا۔

اب راستہ بالکل کھلی فضا میں تھا اور سورج نزدیک آگیا تھا ـــــ میرے گھٹنوں میں تھکاوٹ کا سیسہ بیٹھ کر بوجھ ہو رہا تھا۔ حلق خشک تھا اور پاؤں تلے ریت جلتی تھی۔ بدن پسینے سے بھیگ رہا تھا ـــــ میرے کھلے ہوئے ہانپتے منہ میں ہوا بہت کم جا رہی تھی اور پھیپھڑوں میں جا کر خالی ہو جاتی تھی ـــــ یہ کیسا پریوں کا گمشدہ باغ ہے، پہاڑوں کی عظمت کی آخری حد ہے جہاں صحراؤں کی جلتی دھوپ اور تپتی ریت ہے، پہاڑ خشک ہیں اور چشموں کی ٹھنڈک کی بجائے بدن پسینے میں بھیگتا ہے ـــــ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اِردگرد کے پہاڑ سرک رہے ہیں، ایک کی بجائے کئی سلجوق ہیں جو میرے آگے آگے چل رہے ہیں ـــــ میں نے ایک دیوار پر ہاتھ رکھ کر اپنے آپ کو سنبھالا اور اُس کے سائے میں ڈھیر ہو گیا۔

سلجوق نے سُرخ چہرے والے نوجوان کو آواز دے کر روکا اور خود میرے پاس آگیا۔

"کیا بات ہے ابو؟" وہ یکدم ہراساں ہو گیا۔

"کچھ نہیں" میں نے سر جھٹکا "میں بہت تھک گیا ہوں ——— اور میرا سر چکرا رہا ہے اور مجھے پیاس لگی ہے"

"بلندی کی وجہ سے ابو" اس نے فوراً اپنا بیگ زمین پر رکھا اور اُس کی زپ کھولنے لگا "پسینے کی صورت میں آپ کے بدن کے نمکیات ضائع ہو گئے ہیں اس لئے ———" اُس بیگ میں سے نمک کا پاؤڈر نکال کر پانی میں گھولا اور مجھے پلا دیا "تھوڑی دیر آرام کر لیتے ہیں"

ریتلا راستہ بل کھاتا ہوا اُوپر جا رہا تھا اور اُس کے اختتام پر چند مکان نظر آ رہے تھے۔ اِن مکانوں کے پیچھے، بہت پیچھے ایک چٹان نما ٹیلے پر ایک چھوٹا سا سفید ڈبہ نظر آ رہا تھا جو ہنزہ کے میروں کا قدیم قلعہ تھا۔ پس منظر میں برفپوش بلندیاں اور ایک تاریک درّہ تھا بلکہ یوں لگ رہا تھا جیسے چٹانیں اور برف اِس پرانی عمارت پر بس حاوی ہونے کو ہیں اور وہ اُن کی آمد سے بے خبر سر اُٹھائے وادیٔ ہنزہ کو دیکھ رہی ہے۔ بیشتر لوگ اِس قلعے کی طلسماتی تصاویر کو دیکھ کر ہی ہنزہ کا سفر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں لیکن فی الحال درّے اور برفپوش چوٹیوں پر وہ نیم سیاہ بادل اور دُھند نہیں تھی جن میں سے جھانکتا ہوا چینی خانقاہ نما یہ قلعہ مجھے بھی مسحور کر دیتا۔ یہاں دُھوپ تھی، دوپہر میدانوں ایسی تھی۔ اور میرے دماغ پر اثر انداز ہو رہی تھی اور نمکین پانی پینے کے باوجود ابھی تک میرا حلق سوکھ رہا تھا ——— میں اُٹھا اور راستے کے ساتھ ڈھلوان پر کھڑے ایک درخت کے سائے میں جا بیٹھا۔ کہیں پانی چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ چند لمحوں کے بعد مجھے سردی محسوس ہونے لگی۔ نہ دھوپ میں سُکھ نہ سائے میں چین ——— یہاں سے میر کا نیا محل بھی دکھائی دے رہا تھا اور اُس کے نیچے کھیتوں میں کسان مشقت کر رہے تھے۔

مشقت کرنے والوں کے اُوپر شاہوں کا سایہ، کتنی پرانی اور پھر بھی کتنی نئی تصویر۔

کچھ دیر سستانے کے بعد جب میرے حواس بحال ہوئے تو ہم پھر اُسی راستے پر آگئے لیکن اب میں لمبے لمبے سانس کھینچ کر آہستہ آہستہ قدم اُٹھا رہا تھا۔ مجھے خوف سا محسوس ہوا کہ کہیں میں سچ مچ سنجیدگی سے بیمار نہ ہو جاؤں —— اور یہ خوف صرف سلجوق کی وجہ سے تھا۔ مقامی ہسپتال کے قریب پہنچے تو ایک موڑ آیا جہاں سے راستہ یوں آسمان کی طرف اُٹھتا تھا جیسے کوئی جہاں سے اُٹھتا ہے، میں بھی ہانپتا لرزتا اُس کے ساتھ اُٹھتا گیا۔ اس کے اختتام پر "ہنزہ اِن" کا سبز بورڈ دکھائی دیا جس کے ساتھ سُرخ رو نوجوان ٹیک لگائے ہمارا انتظار کر رہا تھا منہ کھولے ہوئے۔ گلگت میں اپنے بیگ صاحب نے فرمایا تھا کہ کریم آباد میں انسان راکاپوشی کے روبرو ہونے جاتا ہے اور "ہنزہ اِن" سے راکاپوشی کے سفید چہرے اور آپ کے درمیان کوئی دوسرا حائل نہیں ہوتا، وہیں ٹھہریئے گا۔

"ہنزہ اِن" کی انتظامیہ جو نہایت مسکین اور بے چارے سے ایک بندے پر مشتمل تھی ہماری منتظر تھی۔

"کمرہ چاہیے" میں نے اپنے بھیگے ہوئے چہرے کو تولیے سے پونچھتے ہوئے کہا۔

"صاحب" وہ مودب ہو کر نرم آواز میں بولا "یہ راستے کے ساتھ اُوپر چار کمرے ہیں اور اِدھر راستے سے پانچ سیڑھیاں نیچے اُتر کر بھی چار کمرے ہیں جن کی چھت پر ہم کھڑے ہیں —— آپ کہاں ٹھہرو گے؟"

"اُن میں" میں نے اوپر اشارہ کیا۔ "اور اِن میں" میں نے نیچے جاتی ہوتی سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ "کیا فرق ہے؟"

"صاحب اِدھر تو تھوڑی بہت ٹریفک گذرتی رہتی ہے ___" بعد میں پتہ چلا کہ تھوڑی بہت ٹریفک سے اُس کی مراد سارے دن میں دو تین جیپیں پانچ سات سیاح اور چند مقامی باشندے تھے ___"اور اُدھر اُن کمروں کے آگے کوئی راستہ وغیرہ نہیں، برآمدہ ہے، اُس کے آگے کھیت ہیں اور نیچے دریائے ہنزہ ہے اور راکاپوشی ہے"

"نیچے چلو"

ہم راستے سے ہٹ کر پانچ سیڑھیاں نیچے اُترے اور ریسٹ ہاؤس نما چار کمروں کی ایک عمارت میں کے برآمدے میں آ گئے جس کے آگے کھیت تھے اور نیچے دریائے ہنزہ تھا اور راکاپوشی تو تھی۔ برآمدے میں راکاپوشی کی جانب پشت کئے ایک صاحب جو نوجوان تھے، قدرے فربہ تھے صرف شلوار میں ملبوس اپنی چھاتی کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کچھ کھا رہے تھے۔ ہم نے آخری کمرہ پسند کیا اور مینجر صاحب کو چائے کا آرڈر دے کر بستر پر ڈھیر ہو گئے ___ ابھی ہم اچھی طرح ڈھیر نہیں ہوئے تھے کہ صاحبِ شلوار بلا روک ٹوک اندر آ گئے۔

"السلام وعلیکم چوہدری صاحب" انہوں نے نہایت اپنائیت سے ہاتھ آگے کر دیا۔ میں نے وہیں لیٹے لیٹے ایک مرجھایا ہوا ہاتھ اُن کی جانب بڑھا دیا۔ "آپ تارڑ صاحب ہوناں۔ تو میں دیکھتے ہی پہچان گیا تھا کہ اپنے تارڑ صاحب ہیں ___ اوئے ہوئے جین میں ہی بستر پر لیٹ گئے؟ ___ میں کوئی شلوار وغیرہ پیش کروں، دھوتی بھی ہے"

میں نے ایک بوسیدہ سی مسکراہٹ کے ساتھ اُن کی اس پیش کش کو رَد کر دیا۔

"یہ آپ کا بیٹا ہے ___ ماشاءاللہ ___ سناؤ بھئی بیٹا جان کونسی جماعت

میں پڑھتے ہو؟"

انہوں نے سلجوق کو تھپک کر پوچھا۔ جواب میں سلجوق نے ایک بُرا سا منہ بنایا اور خاموش لیٹا رہا۔ انہوں نے میرے بستر پر اپنے بیٹھنے کے لئے جگہ بنا لی اور ایک ایسے انسان کی طرح لگاتار بولنے لگے جو کسی ویران جزیرے میں ایک عرصہ تنہا رہنے کے بعد اپنے پہلے ذی رُوح سے ملتا ہے۔"جناب آپ گجرات کے ہو ناں؟ —— میں بھی گجرات کا ہوں پر اب جرمن میں ہوں پچھلے دس سال سے، پچھلے مہینے اپنی بُڈھی کے ساتھ پاکستان آیا —— اوئے ہوئے بڑی مایوسی ہوئی۔ بڑا گند ہے اس ملک میں اور گجرات —— وہاں تو بُو ہی بُو ہے —— میں نے سوچا بُڈھی کیا کہے گی، اسے سیر کراؤ۔ تو جی مجھے کسی نے کہا اسے ہنزہ لے جاؤ اچھی جگہ ہے —— ہم جی پنڈی سے جہاز پر بیٹھ تو گئے پر اوئے ہوئے جو اُس میں ہم کو دھکے لگے اور جو بُرا حال ہوا —— جہاز ایک دم نیچے ہی نیچے بس اللہ کا کرم تھا تو پہنچ گئے نہیں تو ہونے لگا تھا۔ قل ہو اللہ —— نہیں دراصل جرمن میں رہا ہوں ناں —— ہاں ہونے لگا تھا انا للہ —— گلگت سے ادھر کریم آباد آتے آتے بھی حشر ہو گیا ——"

اخلاقاً مجھے اُٹھ کر بیٹھنا پڑا "آپ کتنے روز سے یہاں ہیں؟"

"میں جی؟ —— کوئی دس دن ہو گئے ہیں —— یہ اچھا ہوٹل ہے چوہدری صاحب، نہ کوئی آوے نہ کوئی جاوے —— سارا دن برآمدے میں بیٹھو اور نظارے لو، چائے پیو —— پر جی کھان پین کا بہت بُرا حال ہے —— نہ مرغی عام ہے اور نہ گوشت —— بندہ بھوکا مر جاتا ہے۔ ساگ اور آلو کھا کھا کر —— پر آپ کہاں آ گئے۔ سُنا ہے سوات بڑی اچھی جگہ ہے، اچھی جگہ ہے؟"

"اچھی جگہ ہے"

"یہاں تو بس پہاڑ ہی پہاڑ ہیں چوہدری صاحب ___ نہ کھانے کو ملتا ہے نہ پینے کو___ اور نہ کوئی بولی سمجھ آتی ہے ان کی۔ میں تو بات کرنے کو ترس گیا تھا کسی پنجابی بھرا سے___ شکر ہے آپ آ گئے۔ اب کمپنی رہے گی___"

اتنی دیر میں انتظامیہ چائے لے کر آ گئی۔ اُن صاحب نے چائے دانی کا ڈھکن اُٹھا کر سونگھا اور کہنے لگے" اوئے یہ لاچیوں والی نہیں ہے" مسکین انتظامیہ نے نفی میں سر ہلایا "یار لاچیاں والی لاؤ___ یہ لے جاؤ" انتظامیہ نے میری طرف دیکھا" ٹھیک ہے شام کو لاچیاں والی پی لیں گے، اب یہی چلے گی"

"میرا نام وارث ہے" انہوں نے چائے بنا کر میرے آگے رکھ دی" میں نے بتایا تھا ناں کہ میں جرمن میں ہوتا ہوں___ آپ کبھی جرمن گئے ہو؟"

"ہاں اتفاق ہوا ہے"

میری "ہاں" سے وراثت صاحب قدرے دل گرفتہ ہوئے اور پھر کھانس کر کہنے لگے" ناں میرے پاس دھوتیاں بھی ہیں اور شلواریں بھی___ لا دوں؟ آرام سے کھُلے ہو کر لیٹو"

میں نے پھر شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔

"سُنا ہے کاغان بڑی اچھی جگہ ہے! اچھی جگہ ہے؟"

"ہاں اچھی جگہ ہے"

"یہاں تو کوئی حال نہیں جی___ آپ پتہ نہیں کیوں آ گئے ہو"

سلجوق جو خاصی دیر سے تلملا رہا تھا اور اس کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ اُٹھ کر بیٹھ گیا" انکل اگر یہ جگہ اچھی نہیں تو آپ دس روز سے یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"میں بیٹا جان" وہ اپنے سینے پر ہتھیلی رکھ کر بولے" میں نے کیا کرنا ہے۔

میں تو نظارے دیکھتا رہتا ہوں برآمدے میں بیٹھ کر اور چائے شائے پیتا رہتا ہوں۔ اصل میں میری بڈھی کو یہ جگہ پسند آگئی ہے"

یہ "بڈھی" جو بھی تھی یہیں کہیں تھی اس لئے میں نے پوچھا "بڈھی؟"

"آہو جی ——— جرمن ہے ——— ابھی ریسٹ کر رہی ہے کمرے میں اُس کی طبیعت ذرا خراب شراب ہے ——— بلاؤں؟" انہوں نے میرے جواب کا انتظار کئے بغیر وہیں بیٹھے بیٹھے بزبانِ جرمن کوئی نعرہ لگایا جس کے نتیجے میں ساتھ کے کمرے سے اُسی زبان میں کوئی ناگفتہ بہ سا جواب آگیا اور وارث صاحب ٹھنڈے ہو گئے "ابھی ریسٹ کر رہی ہے، شام کو ملا دیں گے ——— یہ جو میری بُڈھی ہے ناں اُدھر جرمن میں پاگلوں کے سکول میں اُستانی ہے ———"

پوچھنا تو یہ چاہیے تھا کہ یہ معاشقہ جو شادی پر منتج ہوا کیا اُس سکول میں طالب علمی کے زمانے میں شروع ہوا لیکن پوچھا یہ گیا کہ اچھا تو آپ جرمن میں کیا کرتے ہیں؟

"میں بس کام کاج کرتا ہوں ——— پر اب ذرا کام بہتر ہو جائے گا کیونکہ میں بھی جرمن ہو جاؤں گا، بڈھی جو جرمن ہے ——— آپ چترال گئے ہو؟"

"نہیں"

"سنا ہے اچھی جگہ ہے ——— اچھی جگہ ہے؟"

"پتہ نہیں ———"

"اچھا تو پھر آپ آرام کرو ——— ویسے جین میں اچھی طرح آرام تو نہیں ہو سکتا پر آپ ——— خیر یہاں کی چائے ضرور پینا لاچیاں والی، بڑی مزیدار بناتا ہے" وہ اُٹھے اور سینے کے بالوں میں اُنگلیاں چلاتے ہوئے باہر چلے گئے۔

انتظامیہ چائے کے برتن لینے آئی تو میں نے "ہنزہ اِن" کے بارے میں پوچھا۔

وہ مسکین صورت کہنے لگا "یہ ہم نے کرائے پر کمرے لئے ہیں صاحب ——— ہم دو بھائی ہیں، سارا کام خود ہی کرتے ہیں ——— آپ کی خدمت کریں گے صاحب"۔

میں نے نیچے اُترتے ہوئے ہوٹل کے کچن کے باہر دو جہازی سائز یا ماہلہ موٹر سائیکل پارک ہوئے دیکھے تھے۔ ان علاقوں میں اِکا دُکا جیپ تو نظر آ جاتی ہے لیکن موٹر سائیکل اور وہ بھی بھوتو قبیل کے ایک عجوبے سے کم نہ تھے۔ میں نے اُن کے بارے میں دریافت کیا تو مسکین صورت نے بتایا کہ دو جاپانی باوے ہیں اور جاپان سے انہی موٹر سائیکلوں پر بیٹھ کر یہاں ہنزہ تک آئے ہیں۔ ان میں سے ایک تو اس وقت خاصا بیمار ہے اور کمرے میں لیٹا رہتا ہے اور دوسرا اُس کی خدمت خاطر میں لگا رہتا ہے ——— صاحب میرے خیال میں جو بیمار ہے وہ اُس کا بیوی ہے ——— پر ہو سکتا ہے خاوند ہو ———

بے اختیار میری باچھیں پھیل گئیں "کیا مطلب؟"

"صاحب نہ داڑھی ہے نہ مونچھ۔ لمبے لمبے بال ہیں۔ دونوں نے پتلونیں پہن رکھی ہیں۔

اَب صاحب کچھ پتا پتہ نہیں چلا ہم کو۔ آپ دیکھو گے تو ہمیں بھی بتا دینا شام کو کھانا کھاؤ گے؟"

مسکین صاحب رخصت ہوئے تو برآمدے میں بیٹھے ہوئے وارث صاحب کوئی جرمن پاپ سانگ پنجابی سُروں میں گانے لگے۔ چنانچہ ہم نے بہتری اسی میں سمجھی کہ آرام کا پروگرام ملتوی کر کے منہ ہاتھ دھویا جائے اور وادی ہنزہ سے ملاقات کی جائے۔ سلجوق غسل خانے میں گیا اور فوراً ہی باہر آ گیا "اور "ابو نلکے میں سے جو پانی آ رہا ہے اُس میں ریت ہی ریت ہے اور کالا

سیاہ تیل جیسا ــــ"

"بیٹا جان ہنزہ میں یہی پانی ملتا ہے" برآمدے کی طرف سے وارث صاحب کی آواز آئی اور اس کے پیچھے پیچھے وہ خود آ گئے" چوہدری صاحب آپ نے ابھی اِن کی نالیاں نہیں دیکھیں برفانی پانی والیاں ــــ جن کو یہاں کے لوگ نہریں بولتے ہیں۔ بس سارا پانی وُہیں سے آتا ہے ــــ ٹھنڈا ٹھار اور ریت والا ــــ یہ لوگ تو اِس کو پیتے بھی ہیں۔ چوہدری صاحب کہتے ہیں۔ اس میں دھاتیں ہیں اور صحت کے لئے اچھا ہے ــــ میری روح تو نہیں مانتی اس کو پینے کے لئے ــــ آپ کی مانتی ہے؟"

"پتہ نہیں" میں نے بیزار ہو کر کہا۔

"میں نے تو آتے ہی مینجر سے کہہ دیا تھا کہ بھائی میاں میرے لئے صاف سُتھرا پانی لایا کرو ــــ معدے میں ریت بٹھانی ہے اِس گندے پانی کو پی کر ــــ نہ گُردے میں پتھری بنوانی ہے ــــ ویسے ہوٹل اچھا ہے جی اور سستا بھی ــــ کمرہ ہے تو ڈبّے کا ڈبہ پر ہے تو کمرہ ناں ــــ اور کمرہ اور کھانا پینا اور صرف ڈیڑھ سو روپیہ روز کا ــــ میں بھی اور میری بڈھی بھی ــــ ڈیڑھ سو روپیہ کیا ہے چوہدری صاحب ــــ تیس جرمن مارک نہیں بنتے ــــ آپ کبھی جرمن گئے ہو ــــ آہو آپ تو گئے ہو ــــ اچھا جی آرام کرو ــــ" وارث صاحب بے فکری سے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے باہر چلے گئے۔

میں نے غسل خانے میں جا کر صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ ٹین کے سِنک میں ریت جمع تھی اور کموڈ کی تہ میں ریت تھی۔ میں نے نل کھولا تو سیاہ تیل نما پانی برآمد ہوا ــــ ڈرتے ڈرتے منہ ہاتھ دھویا اور آنکھوں میں چند چھینٹے مارے۔ آنکھیں جھپکنے پر کہیں ایک ذرے کی چبھن بھی محسوس نہ ہوئی۔ اگر ریت تھی تو اتنی باریک

کہ صرف دکھائی دے لیکن محسوس نہ ہو۔ میں نے ہنزہ کے لوگوں کی طویل العمری کے بارے میں بڑی داستانیں پڑھ رکھی تھیں اور اُن کی قابلِ رشک صحت کا ایک راز مقامی پانی بتایا جاتا تھا جس میں معدنیات کی آمیزش تھی۔ میری رُوح اِسے پینے کے لئے مان تو رہی تھی لیکن میں نے پیٹ میں گڑبڑ کا خطرہ مول لینا مناسب نہ سمجھا اور اسے چکھے بغیر باہر آگیا۔ سلجوق اس دوران تیار ہو چکا تھا، چھڑی ہاتھ میں، کیمرہ، بسکٹ، سیاحتی کتابچے اور میرے سگرٹ چھوٹے نائلون کے تھیلے میں۔ کمرے سے باہر آئے تو برآمدے میں وارث صاحب کرسی پر نیم دراز اُونگھ رہے تھے۔ ہماری آہٹ سُن کر اُن کے کان تھرائے اور وہ "آئیے چوہدری صاحب"، کہہ کر اُٹھ بیٹھے۔ "کدھر کی تیاریاں ہیں؟"

"بس ذرا گھومنے جا رہے ہیں"

"اِدھر کچھ نہیں ہے دیکھنے کو چوہدری صاحب —— یہ سیڑھیاں چڑھ کر ریسٹ ہاؤس ہے۔ ساتھ ایک ہوٹل ہے، چند دکانیں ہیں اور بس —— اُدھر قصبہ ہے کچا سا۔ میں نے دیکھا ہوا ہے سارا علاقہ —— بڈھی کی تو طبیعت خراب ہے اس لئے میں جناب صبح سویرے نکل جاتا ہوں اور دس بارہ میل کا چکر لگا کر آجاتا ہوں ناشتے کے ٹائم —— "

"اس ہوائی چپل میں آپ دس بارہ میل سیر کر آتے ہیں؟" سلجوق نے بظاہر سنجیدگی سے پوچھا۔

"نہیں نہیں میں تو ننگے پیر سیر کرتا ہوں بیٹا جان۔ سارے راستوں پر ریت بچھی ہوئی ہے، مجال ہے کوئی اینٹ روڑا پاؤں میں چبھے —— میری بڈھی کو بڑی پرابلم ہوئی پہلے دن، اُس نے پہنی ہوئی تھی اُچی ایڑھی والی گرگابی —— تو اُس سے تو چلا ہی نہ جائے۔ دو مرتبہ ٹھاہ نیچے گری —— بلاؤں؟"

یہاں پہنچ کر انہوں نے ایک گہرا سانس لیا اور پھر اپنے دروازے کی جانب رُخ کرتے ہوئے جرمن میں کچھ کہا۔ اُدھر سے بُڈھی نے بھی کہا اور بہت کچھ کہا۔ وارث صاحب فوراً اٹھے "لو جی وہ تو مجھے بلا رہی ہے۔ اجازت" اور کان لپیٹے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

برآمدے میں سکون تھا اور میں نے پہلی مرتبہ اطمینان سے اپنے سامنے دیکھا۔

وادیٔ ہنزہ کے ڈھلوان کھیت، باغوں کے گوشے، پاپلر کے جُھنڈ اور نیچے گنیش کے قریب دریائے ہنزہ کا بل کھاتا ہوا سرمئی اژدھا جو سارے منظر میں لیٹا ہوا آہستہ آہستہ شُوک رہا تھا اور اُس کی شُوک مدھم ہو کر ہم تک پہنچ رہی تھی۔ دریا کے دوسرے کنارے سے اُٹھتے ہوئے وادیٔ نگر کے پہاڑ اور ایک تنگ درّہ جس میں ایک سیاہی مائل گلیشیئر جھانکتا ہوا آگے آ رہا تھا۔ گلیشیئر کے عین اوپر دو برف پوش چوٹیاں ـــــ اور نگر تو بالکل آپ کے سامنے ہے لیکن ذرا بائیں ہاتھ پر راکاپوشی کا شہرِ برف پھیلتا ہے۔ ہم نے اس کے پاؤں تلے سے گذرتے ہوئے اس کی سرد خوبصورتی کا دیدار کیا تھا اور اب یہ ہمارے سامنے کسی بڑے ماڈل کی طرح آراستہ تھا اور ساکت تھا اور حرکت نہیں کر رہا تھا ـــــ صرف ہماری آنکھوں کے لئے نیں اور سلجوق اس منظر کے بارے میں سرگوشیاں کرتے رہے جیسے بلند آواز میں بولنے سے یہ سب کچھ غائب ہو جائے گا۔ بہرحال ایسا نہیں تھا کیونکہ وارث صاحب پچھلے دس روز سے اس کے سامنے بیٹھ کر باآوازِ بلند، جرمن گانے پنجابی لہجے میں گا رہے تھے اور راوریہ منظر کہیں نہیں گیا تھا بلکہ شائد جا نہیں سکا تھا ورنہ چلا جاتا۔

برآمدے کی پانچ سیڑھیاں طے کر کے ہم اُوپر راستے پر آ گئے جہاں

"ہنزہ اِن" کا دوسرا حصّہ اور کچن واقع تھا۔ کچن کے باہر ریاماہا موٹر سائیکلوں کا جوڑا قبل از تاریخ کسی جانور کے ڈھانچے کی طرح ساکت کھڑا تھا۔ موڑ پر ریسٹ ہاؤس کی عمارت تھی، ایک اور ہوٹل، چند دکانیں ——اور یہ جگہ ایسی تھی۔ جہاں سے راستے جدا ہوتے تھے۔ دائیں ہاتھ پر پاپلر کے درختوں میں گھرا ہوا ایک ریتلا راستہ تھا۔ جس کے ساتھ ساتھ ایک چھوٹی سی برفانی نہر بہہ رہی تھی۔ نہر کے کنارے ایک دکان کے باہر کوکا کولا کے متعدد کریٹ دیکھ کر سلجوق چونک گیا "ابو کوکا کولا تو یہاں بھی ملتا ہے"

کوکا کولا ملتا تو تھا لیکن دُگنی قیمت پر راولپنڈی سے گلگت اور پھر وہاں سے ہنزہ تک کا کرایہ بھی اس کی قیمت میں شامل تھا۔

بوڑھے دکاندار نے پوچھا "صاحب ٹھنڈا چاہیئے؟"

"آپ کے پاس فریزر ہے؟" سلجوق بولا۔

بوڑھے نے سر ہلایا "ہاں ہے"

سات آٹھ فٹ چوڑی نہر کے آرپار ایک شہتیر رکھا تھا جس کے درمیان میں رسّی سے بندھی ہوئی شہتوت کی ٹوکری برفیلے پانی میں غرق تھی۔ بابا جی نے رسّی کھینچ کر ٹوکری باہر نکالی تو اُس میں بوتلیں تھیں۔ اُس نے ایک بوتل کھولی اور سلجوق کو تھما دی "دیکھو صاحب ٹھنڈی ہے"

"ہوں" سلجوق نے پہلا گھونٹ بھرا "بہت ٹھنڈی ہے"

"یہ ہمارا فریزر ہے صاحب" اُس نے بوتلوں سے بھری ہوئی ٹوکری کو پھر سے پانی میں اُتار دیا۔

کچھ دیر پہلے میں پسینے سے بھیگا ہوا بدن کھینچتا اُوپر آرہا تھا اور دھوپ سے حواس باختہ ہو رہا تھا ——اور اب اطمینان سے نہر کے کنارے ایک بنچ

پر بیٹھا تھا اور سلجوق کی بوتل میں سے گھونٹ بھرتا ہوا ایک بے نام سی خنکی میں جو بھلی لگتی ہے سانس لے رہا تھا۔

قصبے سے آتے ہوئے ڈھلوان راستے پر دو غیر ملکی اُتر رہے تھے۔ قریب آئے تو ہم نے فیودورو کی عینک دیکھی اور اُس کی بیوی کے ہانپتے ہوئے سانس سُنے ——

"آہا —" فیودورو نے سلجوق کے کندھے کو تھپک کر پُر مسرت لہجے میں کہا "تم بھی آگئے ؟"

"ہاں — ہم پھسو چلے گئے تھے آج ہی آئے ہیں، آپ کہاں گئے تھے؟"

"ہم "اس کی بیوی نے زبان باہر لٹکا کر تھکاوٹ کا اظہار کیا "ہم اُلتر گلیشیئر کی ٹریکنگ کرنے گئے تھے"

"پھر ——"

"گلیشیئر بہت اچھا ہے لیکن ماؤنٹین بہت بُری ہے — بہت بُری بہت خطرناک اُدھر پتھر گرتے ہیں — آپ کہاں ٹھہرے ہیں ؟"

"ہُنزہ اِن"

"ہم بھی وہیں ہیں۔ اَپر پورشن میں" فیودورو نے کہا "اس وقت ہم بہت تھکے ہوئے ہیں شام کو ملیں گے"

اور وہ دونوں "ہنزہ اِن" کی طرف اُتر گئے۔

کنجوت، بلتت، کریم آباد —— پہاڑیوں پر پھیلا ہوا، اُونچا ہوتا قدیم قلعے پر ختم ہو رہا تھا اور اس کے پیچھے جاندار اور پُر ہیبت برفپوش چوٹیاں۔ ہم دونوں ریتلے راستے پر قصبے کی جانب چڑھنے لگے۔

دائیں جانب میر کے باغات تھے اور اُن کے آخر میں بلندی پر میر کا نیا محل

تھا جو چند برس پیشتر اس لئے تعمیر کیا گیا تھا کہ پرانے قلعے کی کچی اینٹیں چھ سو برس سے میروں کا بوجھ اُٹھاتے اُٹھاتے بھربھری ہو چکی تھیں ـــــ بائیں جانب نیچے ایک آرا مشین پر شہتیر کاٹے جا رہے تھے اور اُس کے پہلو میں "ہل ٹاپ ہوٹل" کے کمرے تھے جو فی الحال ہنزہ کا بہترین ہوٹل ہے۔ فی الحال اس لئے کہ یہاں ایک فائیو سٹار ہوٹل کا ڈھانچہ تو تیار ہو چکا ہے مگر ملکیتی مسائل کی بنا پر پچھلے کئی برسوں سے ادھورا پڑا ہوا ہے۔ ہنزہ میں زمین اور جائداد صرف مقامی باشندوں کے مابین ہاتھ بدلتی ہے اور وہ یہ پسند نہیں کرتے کہ باہر سے تجارت پیشہ لوگ آکر اُن کی وادی کو ایک تجارتی منڈی بنا کر وہاں کاروبار شروع کر دیں۔ ہل ٹاپ کی چھت کے ساتھ "ہنزہ فوڈز" کی دکان تھی جس میں روائتی خوراکیں سیب، شہتوت، سوکھی ہوئی خوبانیاں اور شہد وغیرہ فروخت ہوتی ہیں۔

راستوں پر شہتوت سیاہ ہو رہے تھے اور اُن پر شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ سیب کے درخت گھروں کے اندر سے باہر دیکھتے تھے۔

ایک تنگ اور پُرپیچ سیڑھی نما گلی میں سے گذر کر ہم بلتت کی پولو گراؤنڈ میں آ گئے۔ ان علاقوں میں گاؤں چاہے چار گھروں پر مشتمل ہو لیکن وہاں ایک عدد پولو گراؤنڈ ضرور موجود ہوتی ہے۔ کسی زمانے میں ہنزہ کے گھوڑے اور پولو کے کھلاڑی بہت مشہور تھے مگر پھر باہر کی ہوا آئی، لوگوں نے گھوڑے بیچ کر ڈیزل کی جیپیں خرید لیں اور پولو کے کھلاڑی کراچی اور راولپنڈی کے دفتروں میں کلرک بابو بن گئے ـــــ میدان اب بھی موجود ہیں اور تقریبات کے لئے استعمال ہوتے ہیں ـــــ اور سال میں ایک دو مرتبہ کبھی علاقائی حکام کی آمد پر اور کبھی سیاحوں کی فرمائش پر پولو کا میچ منعقد کر لیا

جاتا ہے۔

ہم دونوں چلتے جا رہے تھے اور سیاحوں کو بدتمیزی کا جو الاؤنس دیا جاتا ہے اسے استعمال میں لاتے ہوئے لوگوں کے گھروں میں جھانکتے جا رہے تھے۔ بیشتر گھروں کے ساتھ سیب اور خوبانی کے مختصر باغ تھے، عورتیں خوبانی کے پھل کو چھتوں پر سکھانے کے لئے پھیلا رہی تھیں۔ جس طرح آلو انگریزوں کی سٹیپل فوڈ ہے اور ہم گندم استعمال کرتے ہیں اسی طرح اہلِ ہنزہ خوبانیوں کو کام میں لاتے ہیں۔ جب تازہ ہوں تو پھل اور سویٹ ڈش کے طور پر اور پھر انہیں سکھا کر ان کا آٹا پیس لیا جاتا ہے جس سے روٹی بنتی ہے اور سردیوں کی طویل راتوں میں کام آتی ہے جب ہر طرف برف ہوتی ہے۔ خوبانی کے تیل سے روغن بھی حاصل کیا جاتا ہے جو ڈالڈے اور مٹی کے تیل کی آمد سے پیشتر کھانا پکانے، سر میں لگانے اور پینے کے علاوہ چراغ جلانے کے کام بھی آتا تھا۔ چند برس پیشتر خوبانی کا ایک غیر شرعی مصرف بھی رائج تھا۔ اہلِ دل حضرات انہیں نچوڑ کر ان کے رس سے ایک نیم نشہ آور مشروب تیار کیا کرتے تھے جسے عرفِ عام میں "ہنزہ واٹر" کا نام دیا جاتا تھا۔ ان دنوں اگر آپ کسی اہلِ دل سے ہنزہ واٹر کے بارے میں پوچھیں تو ایک ٹھنڈی آہ بھر کر قریبی نہر کی جانب اشارہ کر کے کہتا ہے "اب تو یہی واٹر رہ گیا ہے"۔ البتہ شنید ہے کہ دور افتادہ قصبوں میں مقیم اہلِ دل ابھی تک تائب نہیں ہوئے اور بلتت میں بھی اگر آپ شباہت غیر ملکی رکھتے ہوں تو اس کا پوشیدہ اور مناسب بندوبست ہو ہی جاتا ہے۔ ہماری شکل چونکہ بہت ہی دیسی ہے اس لئے ہمیں تو ہر جگہ انکار ہی ہوا۔ یہ نہیں کہ خدانخواستہ ہم اس کی کوالٹی کا اندازہ کرنے کے لئے اس کے چند گھونٹ بھرنا چاہتے تھے بلکہ محض اپنے

سیاحتی تجسس کو نکیل ڈالنے کے لئے کہ دیکھیں تو سہی وہ کونسا وائرس ہے جو خمار کے جراثیم سے آلودہ ہے اور پھر صرف دیکھ کر ہم لاحول پڑھیں اور اُسے قریبی نہر میں بہادیں، بس صرف اس لئے۔

یورپ کی سیاحت کے دوران ایک مرتبہ سویڈن کے شہر یوٹے بورگ یا گوٹن برگ میں سے گذر ہوا جہاں ہمارا ایک عزیز دوست راڈنی نام کا قیام پذیر تھا۔ راڈنی اگرچہ نیم مشنری اور پادری قسم کا بچہ تھا لیکن اہلِ دل میں شمار ہوتا تھا اور اپنی حیاتِ طیبہ کے چند برس لاہور اور راولپنڈی میں گذار چکا تھا۔ ملاقات ہوئی تو بے حد راضی ہوا اور میری موجودگی سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے اگلی شب اپنے گھر کے پہلو میں بہتی ہوئی نہر کے کنارے ایک "ہنزہ ایوننگ" برپا کرنے کا اعلان کر دیا ـــــ موصوف بھی ہنزہ کے مداحین میں شامل تھے اور پاکستان کے قیام کے دوران گرمیوں میں ہمیشہ اُدھر کا رُخ کرتے بلکہ اِدھر کا۔ ہنزہ اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ ڈرائینگ روم میں ہنزہ کی بڑی بڑی رنگین تصاویر آویزاں تھیں۔ مہمانوں کی تواضع ہنزہ کی ایک خشک خوبانی اور ایک سوکھے ہوئے شہتوت سے کرتے اور فارغ اوقات میں ہنزہ کا اونی چوغہ زیبِ تن کر کے گوٹن برگ کے بازاروں میں نکل جاتے اور مقامی باشندوں کی توجہ کا مرکز بن جاتے ـــــ اگلی شب اُن کی منعقد کردہ "ہنزہ ایوننگ" میں اُن کے دوستوں نے جوق در جوق شرکت کی۔ شام کا آغاز ہنزہ کے پرندوں کی آوازوں سے ہوا جنہیں راڈنی نے ٹیپ ریکارڈر میں بند کر رکھا تھا۔ پھر دریاؤں کا شور اور مقامی زبان کی گفتگو سنائی گئی ـــــ پھر ایک طویل فلم دکھائی گئی جو راڈنی کی ذاتی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ یہ کوششیں اگرچہ خاصی آؤٹ آف فوکس تھیں لیکن اسے دیکھ کر سویڈش مردوں نے کرسیوں کو تھاما اور خواتین نے اپنے

سینوں کو ـــــ بعد میں انہوں نے ہمیں بقول اُن کے ہنزہ کے کھانے کھلائے جو انہوں نے خود پکائے تھے اور ایسے پکائے تھے کہ انہیں کھانے کے بعد ہنزہ جانے کی خواہش کی بجائے غسل خانے جانے کی حاجت ہوتی تھی اور سب سے آخر میں ہنزہ کے لوک گیتوں کی دُھنوں پر خواتین و حضرات نے ایک واجبی سا رقص کیا۔ رقص کے اختتام پر ہر مہمان کی خدمت میں " ہنزہ واٹر" کا ایک ایک گھونٹ پیش کیا گیا جسے انہوں نے پچھلے تین برسوں سے اپنے فریج میں کسی خاص موقع کے لئے محفوظ کر رکھا تھا، مجھے پیاسا رکھا گیا اور کہا گیا کہ آپ تو خود ہنزہ دیس میں سے آئے ہیں، آپ کے کام و دہن اس مشروب کی لذت سے آگاہ ہوں گے اور ویسے بھی سپلائی بہت مختصر ہے اس لئے آپ وطن واپسی پر سویڈن کی اس "ہنزہ ایوننگ" کی یاد میں ہنزہ واٹر نوش کر لیجئے گا ـــــ اب ہماری قسمت دیکھئے کہ ہنزہ تو آ گئے لیکن ہنزہ واٹر کا دیدار نہ ہو سکا۔ حالانکہ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا چکھنا تو نہیں تھا، صرف دیکھنا تھا اور بہا دینا تھا ـــــ تمام گھروں کے ساتھ ساتھ برفانی نہریں بہہ رہی تھیں۔ ہر گھر کے آگے ایک چھوٹے سے ڈیم کی مدد سے پانی کو حسبِ ضرورت اپنے باغ یا غسل خانے میں منتقل کرنے کا پرانا مگر آزمودہ طریقہ کار برتا گیا تھا۔ برفانی نہر گھر کی بالائی سطح کے قریب تھی چنانچہ اُس میں واٹر پائپ ڈال کر پانی کو حسبِ منشا گھر کے مختلف حصوں میں پہنچایا گیا تھا ـــــ ہنزہ کے راستوں اور گلیوں میں جو ریت دکھائی دیتی ہے وہ انہی نہروں کی ہفتہ وار صفائی کے دوران باہر نکال کر بچھا دی جاتی ہے ـــــ بلتت میں ہر جگہ ان برفیلی نہروں کے چلنے اور ان میں سے نکلنے والے آبی راستوں کی آواز آپ کے کانوں میں آتی رہتی ہے۔ یہ آبی سرسراہٹ یا تو غرناطہ کے قصرِ الحمرا میں سنائی دیتی ہے اور یا ہنزہ میں۔

مقامی خواتین چونکہ سیاحوں کی تانک جھانک کی عادی ہوتی ہیں اس لئے سر جھکائے کام کاج میں مصروف رہتی ہیں اور جب کبھی اُن میں سے کسی نے سر اُٹھا کر دیکھا تو ہمیں اپنے ہی وطن کے باسی پا کر سلام ضرور کیا اور اگر ادھیڑ عمر تھیں تو آگے بڑھ کر اپنے گاؤں کی بڑی بوڑھیوں کی طرح پیار دیا اور اپنی زبان میں دعائیں دیں۔ اِن میں سے بیشتر کا لباس روایتی تھا یعنی لمبا گھیرے دار چوغہ، رنگین شلوار اور سر پر رنگ برنگے دھاگوں سے کاڑھی ہوئی ہنزہ کی چوکور ٹوپی اور اُس پر دوپٹہ ایک مخصوص طریقے سے اوڑھا گیا تھا —— دوپٹے کو پنوں کی مدد سے ٹوپی پر لگایا جاتا ہے —— یہ ٹوپی انتہائی دیدہ زیب تھی مگر بدقسمتی سے اب صرف عمر رسیدہ خواتین کے سروں پر ہی نظر آتی ہے۔ نوجوان نسل اِسے آؤٹ آف فیشن قرار دے کر ترک کر رہی ہے۔ البتہ چند اولڈ فیشنڈ لڑکیاں بھی نظر آئیں جو اِن ٹوپیوں اور دوپٹوں کے ساتھ اپنے کوہستانی برفپوش پس منظر میں بے حد قدرتی اور جاذبِ نظر لگتی ہیں۔ اُن کی ٹوپیوں کے رنگ قابلِ فہم طور پر بڑی بوڑھیوں کی نسبت شوخ اور چمکیلے ہوتے ہیں —— اُن کے رخساروں پر اُن سیبوں کی سُرخی جھلکتی ہے جن کے درختوں تلے وہ گھریلو کام کاج میں مصروف ہوتی ہیں۔

ہنزہ کی عورت نے مجھے بے پناہ متاثر کیا —— یہ عورت ہمارے ہاں کی خواتین سے بے حد مختلف ہے۔ جہاں محنت اور مشقت اہلِ ہنزہ کے خون میں شامل ہے وہاں اُن کی خواتین میں اعتماد اور اپنی ذات پر بھروسے کی ایک ایسی کیفیت پائی جاتی ہے جو یقیناً قابلِ تقلید ہے —— وہ سر اُٹھا کر چلتی ہے۔ گھر میں بازار میں۔ کھیت میں۔ خریداری کرتے، چشمے سے پانی لاتے ہوئے۔ بلند پہاڑوں میں گھرے کسی کھیت میں سے مویشیوں کا چارہ لاتے ہوئے، اس کی کمر کی

ہڑی بالکل سیدھی ہوتی ہے، اُس کی آنکھوں میں ایسی بیباکی ہوتی ہے جس کے سامنے شائد جنگلی درندے بھی نہ ٹھہر سکتے ہوں ـــــ وہ مردوں سے بات کرتی ہے تو جھک کر، منمناتے ہوئے آنکھیں چُرا کر نہیں بلکہ برابری کی سطح پر جیسا کہ دو انسانوں کو ہونا چاہیئے۔ لیکن اُن کا اعتماد اور بیباکی بلند پہاڑوں اور دشوار ترین طرزِ زندگی کا دین ہیں۔ ایک ایسی دنیا جہاں جھجکتی ہوئی نظریں چُراتی ہوئی عورت کا گذارہ نہیں ہو سکتا۔ اُسے برفیلے موسموں، پہاڑی راستوں اور گھریلو کام کاج کی زیادتی سے نپٹنے کے لئے ایسا ہونا پڑتا ہے ـــــ وہ مرد کی دنیا میں نہیں، اپنی دنیا میں رہتی ہے ـــــ ہاں یہ ہے کہ یہ پُرکشش آزاد فطرت جب اخلاقیات کی حدود میں آتی ہے تو وہاں وہ وہی مشرقی عورت بن جاتی ہے جس کی اپنی ایک روایت ہے۔ لیکن ایک فرق کے ساتھ، ہمارے ہاں کی عورتیں کسی بھی "نازک" صورتِ حال میں حواس کھو بیٹھتی ہیں کیونکہ انہیں مرد کے سامنے جانے اور اُس سے آزادانہ گفتگو کرنے کا کوئی تجربہ نہیں ہوتا جب کہ ہنزہ کی عورت ایک ٹھوس معاشرتی سسٹم کی وجہ سے اوّل تو کسی "نازک" صورتِ حال کا سامنا کرتی ہی نہیں اور اگر ایسا ہو جائے تو پھر اُس سے پناہ حاصل کرنا ناممکن ہو جاتا ہے ـــــ میری خواہش ہے کہ پاکستان کی تمام عورتیں اِسی قوّت اور اعتماد کی حامل ہو جائیں، لیکن شائد ہم مرد یہ برداشت نہ کر سکیں کہ ہماری عورتیں ہم سے برابری کی سطح پر بات کریں ـــــ اِس سے ہماری "مردانگی" کو ٹھیس پہنچے گی۔

عورتوں کی طرح ہنزہ کے بہت کم ایسے مرد ہوں گے جنہیں میں نے یونہی بازار یا کھیت میں یا اِدھر اُدھر بے مقصد ٹہلتے یا اونگھتے دیکھا ہو۔ وہ بھی ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مشغول رہتے ہیں اور معاشرتی ذمّہ داریوں کو اپنے فرائض میں اس طرح شامل کرتے ہیں کہ راہ چلتے ہوئے اگر کسی کھیت کے گرد بنی ہوئی

پتھر کی دیوار میں سے چند پتھر کھسک کر راستے پر آگرے ہیں تو وہ سب سے پہلے اُن پتھروں کو اُٹھا کر دیوار کو درست کریں گے اور پھر آگے جائیں گے میں نے متعدد بار یہ دیکھا کہ انہوں نے راہ چلتے ہوئے کسی ہم وطن کا بوجھ بانٹ لیا اور اپنا راستہ چھوڑ کر اُس کے ہمراہ چلے گئے ــــــــ

ہنزہ کا حُسن قدرتی ہے لیکن اس کی خوشحالی یہاں کے باشندوں کی بے پناہ مشقت اور تنظیم کی مرہونِ منت ہے۔ محنت سے لگن کی وجہ سے انہیں اکثر ایشیا کے جرمن بھی کہا جاتا ہے۔ دریا کے پار نگر ریاست میں یہی پہاڑ، گلیشیئر پانی اور آب و ہوا موجود ہے لیکن وہاں کے حالات دیگر پہاڑی وادیوں ایسے ہیں۔ اہلِ ہنزہ اپنے دونوں ہاتھوں کو کبھی ساکت نہیں رکھتے اور انہوں نے ایک ایسی بستی آباد کر رکھی ہے جس کے دروازوں میں سے بھوک اور غربت کبھی داخل نہیں ہوئی۔ اُن کے پاس بہت کچھ نہیں، صرف گذارہ چلتا ہے لیکن ایک ایسے وقار کے ساتھ کہ اُس پر امارت سے مخمور لوگ بھی رشک کریں ــــــــ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہنزہ میں قیام کے دوران مجھے پوری وادی اور اس کے گرد و نواح میں ایک بھی فقیر دکھائی نہیں دیا۔ ہنزہ میں اگر آپ تندرست ہیں تو کام کرتے ہیں اگر بوڑھے ہیں تو پھر بھی اپنا ذاتی کام نپٹا لیتے ہیں اور اگر لاچار ہیں کسی بھی وجہ سے تو آپ کا خاندان اور پورا قبیلہ آپ کی بنیادی ضرورتوں کا خیال رکھے گا ــــــــ پھر فقیر کہاں سے آئیں؟

پولو گراؤنڈ سے اوپر جاتے ہوئے دائیں ہاتھ پر جماعت خانہ کی عمارت ہے اور اُس سے ذرا آگے چند دکانیں ہیں، سایہ دار درخت ہیں اور اُن درختوں کے نیچے دیوار پر متعدد پتھر رکھے ہوئے ہیں ــــــــ اس جگہ کو ہنزہ کا ڈرائنگ روم کہا جاتا ہے کیونکہ اکثر بوڑھے لوگ سارا دن اُن پتھروں پر بیٹھے گپیں ہانکتے رہتے

ہیں۔ یہیں سے ایک راستہ مزید بلندی کی طرف جاتا ہے جس کے دائیں ہاتھ پر ایک پُر شور پن چکی ہے اور راستے کے عین اُوپر لکڑی سے بنا ہوا ایک دیدہ زیب کمرہ ہے جو شائد مسجد کے لئے استعمال ہوتا ہے اور آپ کو اس کمرے کے نیچے سے گذر کر آگے جانا پڑتا ہے۔ اہلِ ہنزہ عقیدے کے لحاظ سے اسماعیلی ہیں اور کریم آغا خان کے لئے اُن کی عقیدت اُن کے گھروں اور دکانوں میں آویزاں اُن کی تصاویر اور خوبصورت جماعت خانوں میں جھلکتی ہے۔ اہلِ ثروت حضرات اپنے مکانوں میں ایک کمرہ مسجد کے لئے مخصوص کر دیتے ہیں۔ اُن کی مذہبی رواداری بھی آپ کو حیران کرتی ہے کیونکہ آپ ایک تنگ نظر اور متعصب ماحول سے نکل کر ایک ایسی جگہ آجاتے ہیں جہاں مذہب پیار اور بھائی چارہ ہے، کُفر کے فتوے اور پتھر نہیں۔

میں اور سلجوق جب ہانپتے ہوئے ہنزہ کے اِس ڈرائنگ روم تک پہنچے تو پتھروں پر بیٹھے ہوئے سارے بوڑھے اُٹھ کھڑے ہوئے اور ہمیں باری باری سب سے ہاتھ ملانا پڑا۔ انہیں اپنی خیریت بتائی، اُن کی خیریت دریافت کی، ہنزہ میں آمد کا وقت، اس کے بارے میں تاثرات اور بال بچوں وغیرہ کی تعداد جاننے کے بعد انہوں نے ہمارے لئے دو نسبتاً بڑے پتھر خالی کر دیئے اور ہم اُن پر بیٹھ کر اُن کی گفتگو میں شریک ہو گئے۔ اِن میں کچھ تو اپنا کام کاج نپٹا کر چند لمحوں کے لئے یہاں ریلیکس کرنے آئے تھے۔ کچھ نے اپنی بیشتر زندگی ہنزہ سے باہر ملازمت کے سلسلے میں گذاری تھی اور اب ریٹائر ہونے کے بعد زندگی کے بقیہ ایام سے لطف اندوز ہو رہے تھے ـــــ راہ چلتے کوئی نوجوان چند لمحوں کے لئے رُکتا اور بوڑھوں کے ساتھ گپ لگا کر پھر اپنے راستے پر چلا جاتا۔ میں نے سگریٹ سلگایا تو ایک بابا جی کہنے لگے "یہ چیز اچھی نہیں ہوتی ـــ کیا تم نہیں

چاہتے کہ میری عمر پاؤ اور پھر یہاں ہنزہ کے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر زندگی کا لطف لو۔"

میں نے کہا" باباجی اُدھر ہمارے شہروں میں آپ کی عمر کے لوگ اتنے خوش قسمت نہیں ہیں، اگر مجھے بھی ہنزہ میں بوڑھا ہونا ہوتا تو کبھی سگریٹ نہ پیتا ـــــ" بہرحال میں نے اُن کی دل آزاری سے اجتناب کیا اور سگریٹ بجھا دیا۔ اور میرے لئے یہ عجیب بات تھی کہ ان میں سے کوئی بھی شخص تمباکو نوشی نہیں کر رہا تھا، چائے نہیں پی رہا تھا، پان نہیں چبا رہا تھا ـــ بس تمام حضرات مزے سے بیٹھے تھے، مسکرا رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔

اہلِ ہنزہ کی ایک اور عادت ہمارے دیہات کی یاد دلاتی ہے۔ آپ کسی بھی شخص کے قریب سے "السلام وعلیکم" کہنے اور ہاتھ ملانے کے بغیر نہیں گذر سکتے۔ آپ اتنے لوگوں سے ہاتھ ملاتے ہیں کہ کوئی چھوٹا موٹا سربراہِ سلطنت بھی ایک دن میں اتنے لوگوں سے ہاتھ نہیں ملاتا ہوگا۔ یہاں آنے والے غیر ملکی سیاح فوری طور پر اس روائت کے پرجوش کارکن بن جاتے ہیں اور دکانوں اور گھروں میں گھس گھس کر "السلام وعلیکم" کہتے پھرتے ہیں۔ ایک فرانسیسی سیاح میرے قریب آیا اور کہنے لگا "سلاموالے کُم" میں حیران ہو کر اس کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ معذرت آمیز لہجے میں بولا" اوہ سوری ـــــ تم تو شائد ہنزہ کے رہنے والے نہیں ہو ـــــ اس لئے والیکم سلام تو نہیں کہہ سکتے ـــــ"

ہنزہ کا یہ ڈرائنگ روم مقامی مرکز اطلاعات کا کام بھی دیتا ہے۔ ایک تو بلتت کا قلعہ یہاں سے چند اُونچے قدم کے فاصلے پر ہے اور دوسرے کوہِ اُلتر اور اُلتر گلیشیئر کو جانے والے تمام سیاح یہیں سے گذرتے ہیں۔ چنانچہ ان بابا لوگ کو علم ہوتا ہے کہ آج گلیشیئر کی جانب کتنے سیاح گئے اور شام کو کتنے لوٹ

کرآئے اور اگر کم آئے تو فوری طور پر قصبے کے نوجوانوں کو اُن کی تلاش میں روانہ کیاجائے۔ اس کے علاوہ بلتت سے پرے تمام قصبوں اور وادیوں سے آنے والے کسان اور محنت کش بھی یہیں سے قصبے میں داخل ہوتے ہیں اور وہ چند لمحے رُک کران بابوں کو اپنے علاقوں کے حالات، حادثات، واقعات وغیرہ کے بارے میں باخبر کرجاتے ہیں اور پھر یہ خبریں ان کے توسط سے پورے ہنزہ کو پہنچ جاتی ہیں ـــــ ان میں سے کسی ایک بابے کو قابو کرکے اگر اُس کی گفتگو ریکارڈ کرلی جائے تو وادیٔ ہنزہ پر ایک طویل اور مبسوط مقالہ تیار ہوسکتا ہے۔

ایک اور باباجی تشریف لائے اور پوچھا "کہاں سے آئے ہو؟"

میں نے عرض کیا "لاہور سے"

کہنے لگے "میں بھی لاہور گیا ہوں۔ سارا شہر دیکھا ہوا ہے، بہت اچھا شہر ہے، تم شاہی مسجد کے پاس رہتے ہو؟"

میں نے کہا "نہیں گلبرگ میں"

فرمانے لگے "یہ شاہی مسجد کے پاس ہے؟"

میں نے کہا "نہیں وہاں سے خاصا دور ہے"

کہنے لگے "میں نے تو صرف شاہی مسجد دیکھی ہے، باقی لاہور کا مجھے نہیں پتہ"

ایک اور بابے نے دریافت کیا کہ کام کیا کرتے ہو؟

میں نے بتایا کہ کتابیں لکھتا ہوں اور اخبار اور ٹیلی ویژن کے لئے کام کرتا ہوں۔

وہ کہنے لگے یہاں تو کتابوں کی کوئی دکان نہیں، اخبار بھی کم آتا ہے ٹیلی ویژن بھی نہیں ـــــ اور کیا کرتے ہو؟

فرانسیسی سیاحوں کا ایک گروہ ہانپتا ہوا اُوپر آیا۔ ان میں ایسی خواتین بھی

تھیں جن کے فیشن ماڈلوں ایسے لباس سے لگتا تھا کہ وہ پیرس کی کسی شبینہ پارٹی میں شمولیت کے لئے بن سنور کر نکلی ہیں۔ سلک کے بلاؤز مزید ریشمی ہو رہے تھے، گھیرے دار پھولوں والے سکرٹ جنہوں نے کیا کیا گھیر رکھا تھا اور بڑے بڑے ہیٹ۔ اُن کے چہرے دُھوپ کی تمازت سے سرخ ہو رہے تھے اور ہونٹ سانس لینے کے لئے کھُلے کے کھُلے تھے اور وہ پُورے بدن سے ہانپ رہی تھیں۔ مجھے پہلی بار علم ہوا کہ ہانپنا صحت کے لئے کتنا مضر ثابت ہو سکتا ہے ___ دیکھنے والے کی صحت کیلئے۔ ان سیاحوں نے سب بابوں سے ہاتھ ملائے۔ بابوں نے مردوں کے ہاتھ چھوئے اور خواتین نے محسوس کئے لیکن نہایت شائستگی کے ساتھ ___ پھر انہوں نے چند تصویریں اُتاریں اور قلعے کی جانب چلے گئے۔

"تم قلعہ نہیں دیکھو گے؟" ایک بابے نے مجھ سے پوچھا۔ "قلعے کا چوکیدار میر کے محل میں رہتا ہے اور اس وقت ان سیاحوں کے ہمراہ گیا ہے۔ کُنجی اس کے پاس ہوتی ہے بعد میں مقفّل کر کے واپس چلا جائے گا۔"

ہم اپنی پتھریلی نشستوں سے اُٹھے تو بابوں کی فوج بھی کھڑی ہو گئی۔ اُن سے ہاتھ ملانے کے بعد ہم دونوں پن چکی کے قریب سے گذر کر بائیں ہاتھ پر مُڑ گئے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ راستہ بھی بلندی کی طرف جاتا تھا۔

ایک پتھریلی چاردیواری کے اندر بلتت کے بلند ترین مقام پر ہنزہ کے میروں کی آبائی قیام گاہ اور حفاظتی قلعے کی عمارت تھی اور بوسیدگی کے اُس مقام پر تھی جہاں ڈائنامائٹ کی گئی وہ چٹان ہوتی ہے جو صرف ایک لمحے کے لئے سامنے قائم نظر آتی ہے اور اُسی لمحے کے آخر میں پتھروں میں بدل کر زمین پر بیٹھ جاتی ہے۔

پوری وادیٔ ہنزہ اور بلتت قدموں میں تھا اور راکاپوشی ہمیشہ کی طرح روبرو تھی۔ کوہ اُلتر اور گلیشیر کو جاتے والے درّے کی چٹانیں اور برف قریب آ رہی تھیں۔

چھ گلیشیئر دراصل اُوپر تلے گرے اور برف کے اس مجموعے کو اُلتر کہا گیا۔ درّے اور اُلتر نالے کے ساتھ ایک عمودی چٹان تھی جس میں ایک سفید نالہ تلوار کے گھاؤ کی طرح نمایاں ہو رہا تھا۔ چٹان کے اوپر ایک چھوٹی سی کوٹھڑی بھی دکھائی دیتی تھی۔ پتھر کی چار دیواری پر سے جھانکتے تو ایک تاریک کھائی اُتنی دور تک جاتی ہے جتنی دُور دیکھنے کی ہمت آپ میں موجود ہو۔ چوبی دروازہ کھُلا تھا۔ ہم اندر داخل ہو گئے۔

۱۸۸۹ء تک انگریز گلگت گیریسن میں مقیم وہسکی پیتے رہے اور اُبلے ہوئے آلو کھاتے رہے۔ اُن کے لئے صرف ساٹھ میل دور ایک برفانی وادی میں روپوش اہلِ ہنزہ خوبصورت مگر وحشی اور جاہل لوگ تھے جو کاشغر اور یارقند جانے والے قافلوں کو لُوٹتے تھے، کبھی چین والوں کے ساتھ روابط بڑھاتے تھے اور کبھی افغانوں کو دوست بنا لیتے تھے۔ اُسی برس گرومبچسکی نام کا ایک رُوسی افسر اپنے کوسک سپاہیوں کے ہمراہ ہنزہ میں داخل ہوا اور وہاں ایک روسی دستہ تعینات کرنے کا ارادہ ظاہر کیا —— اِس پر انگریزوں کی وہسکی پانی ہوئی اور آلو پتھر ہونے لگے۔ میر آف ہنزہ صفدر علی کے ساتھ اُن کا معاہدہ تھا کہ وہ اُن کی ڈاک کاشغر تک جانے دے گا اور اس کے بدلے میں انگریز اُسے ایک معقول رقم ادا کرتے رہیں گے لیکن روسیوں کی آمد نے انگریزوں کو چوکنا کر دیا۔ یوں بھی وہ کسی معقول یا نامعقول بہانے کی تلاش میں تھے اور یہ بہانہ تو بہت ہی معقول تھا کہ ہنزہ کے بعد روسی گلگت آسکتے ہیں اور گلگت سے دلّی اگرچہ دور ہے لیکن ہے تو سہی۔ ۱۸۹۰ء میں اُن کی فوج کرنل ڈیورنڈ کی سرکردگی میں نلت کے قلعے پر قابض ہو گئیں جو ہنزہ کی شہ رگ سمجھا جاتا تھا۔ اِس لڑائی میں اہلِ ہنزہ کے پاس چند توڑے دار بندوقیں

تھیں اور انگریز فوج رائفلوں اور مشین گنوں سے مسلح تھی۔ اس کے باوجود انگریزوں کا جانی نقصان اس قدر زیادہ تھا کہ انہیں اس چھوٹے سے قلعے کو سر کرنے والی فوج کے دو افسروں کو وکٹوریہ کراس سے نوازنا پڑا۔ کرنل ڈیورنڈ کے نازک مقام پر گارنٹ کی ایک گولی داخل ہوئی اور وہیں قیام کیا۔ بعدازاں اُس نے یہ گولی نکلوا کر لنڈن میں اپنی ہمشیرہ کو روانہ کر دی۔ نلت کے بعد وہ بلتت کی جانب آئے اور شدید مزاحمت کا سامنا کرنے کے بعد اس کے قلعے پر قابض ہو گئے۔ میر صفدر علی کا اگرچہ پیچھا کیا گیا لیکن وہ درّہ کِلک عبور کر کے اپنے خاندان سمیت چین چلا گیا ــــ بلتت کے قلعے کو انگریز فوجیوں نے خزانے کی تلاش میں تہس نہس کر دیا لیکن اُنہیں گن پاوڈر کے چند تھیلوں کے علاوہ اور کچھ نہ ملا۔ میر آف ہنزہ کے زنانہ میں گوروں نے تھیٹر کی اداکاراؤں کی نیم عریاں تصویریں لگادیں اور ٹاؤن سینڈ نام کا ایک ٹامی قلعے کی چھت پر چڑھ کر بینجو بجانے لگا ــــ انگریزوں نے میر صفدر علی کے بھائی کو ہنزہ کا نیا میر مقرر کر دیا ــــ اس کے بعد ہنزہ کی قسمت کشمیر کے مہاراجہ کے ساتھ منسلک ہو گئی لیکن مرکز سے دُوری کی وجہ سے وہ ہمیشہ اپنی من مرضی کرتے رہے۔ برِصغیر آزاد ہوا تو ہنزہ کی قید بھی ختم ہوئی۔

فرانسیسی سیاح سر جھکائے گھوم رہے تھے کیونکہ اکثر چھتیں بہت نیچی تھیں اور اُن میں سے مٹی گر رہی تھی۔ چوبی ستون خستہ ہو چکے تھے۔ قلعے کی دیواروں کی چنائی اینٹوں سے نہیں کی گئی تھی بلکہ متعدد شہتیر چٹان میں گاڑ کر اُن کے اندر پتھر اور مٹی بھری گئی تھی۔ یوں سارا قلعہ سرکنڈے کی طرح جھول تو سکتا تھا لیکن آسانی سے گر نہیں سکتا تھا ــــ لیکن اب تو جن شہتیروں پر تکیہ تھا وہی سالخوردہ ہو رہے تھے ــــ میں نے سلجوق کا ہاتھ تھام رکھا تھا کیونکہ فرش کی مٹی

بیٹھتی جارہی تھی۔

میر کی جیل اور تابوت کی طرح بند تاریک کوٹھڑیاں جن میں مخالفین کو ڈھانچہ ہو جانے تک قید رکھا جاتا تھا۔

ایک انتہائی مخدوش زینے پر ڈولتے ہوئے قدم رکھتے ہم اُوپر کی منزل پر گئے—میر کا زنانہ—میر کا چوبی تخت جس پر سلجوق نے براجمان ہو کر نیچے پھیلے ہنزہ پر ایک شاہانہ نظر ڈالی اور میں نے کیمرے کا بٹن دبا دیا۔ ایک کمرے کی چھت پر لکڑی کے چند بیل بوٹے باقی تھے—پاؤں میں مٹی اور شہتیروں میں سے گرتی سر پر مٹی اسلحہ خانے میں دو چار ٹوٹی ہوئی تلواریں۔ ڈھالیں اور ایک پھٹا ہوا ڈھول—فرش میں سوراخوں کا حجم ہر قدم سے بڑا ہو رہا تھا اور وہاں انتہائی احتیاط سے چلنا پڑتا تھا۔

ایک اور ٹوٹا ہوا بھربھرا زینہ جس پر دانت بھینچ کر ہم دھڑام سے نیچے گرنے کی توقع میں قدم رکھتے بالآخر قلعے کی چھت پر پہنچ گئے—یہاں ہوا قدم اُکھاڑتی تھی، وہ پابند نہ تھی، ہم اُس کی راہ میں تھے۔ چھت میں بھی متعدد سوراخ تھے اور شہتیر کڑکڑاتے تھے۔ درمیان میں ایک پگوڈا نما لکڑی کا ڈھانچہ تھا لیکن چھت کے کناروں پر کوئی حفاظتی دیوار یا پتھر وغیرہ نہیں تھے۔ میں نے سلجوق کو درمیان میں کھڑے رہنے کی تاکید کی اور چھت کے کنارے پر جا کر نیچے جھانکا—ہزاروں فٹ نیچے بہتے اُلتر نالے نے جیسے کمند پھینک کر میرے وجود کو قابو میں کیا اور اپنی طرف کھینچا۔ میں بے اختیاری کے لمحے سے ہراساں ہو کر پیچھے ہو گیا۔

قلعے کی چھت پر کھڑے انسان کو یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ ہوا اُسے اُڑا لے جائے گی اور وہ دراصل مٹی سے بنے ہوئے ایک قالین پر کھڑا ہے جو قراقرم کی چوٹیوں اور منجمد دریاؤں کے روبرو پرواز کر رہا ہے—صرف تیز ہوا ہے

جو برفیلی ہے۔ پہاڑ اور گہری کھائیاں ہیں اور آپ اُن کے سامنے بے بس، ڈرے ڈرے اور مرعوب۔

"صاحب آپ کدھر آگیا ہے، اُوپر آنے کی اجازت نہیں"۔ چوکیدار کا سَر چھت پر رکھا تھا اور اُس کا بقیہ دھڑ نظروں سے اوجھل زینے پر تھا۔

ہم نیچے آئے۔ چھتوں سے مٹی جھڑ رہی تھی اور متعدد شہتیر فرش پر پڑے تھے اور کاغذ کی طرح ہلکے تھے کیونکہ انہیں دیمک چاٹ چکی تھی۔ شاملر لیٹنر نے اسی قلعے کے بارے میں کہا تھا کہ دردستان کی پریاں اور آسمانی دیویاں خاموش ہیں۔ ہنزہ کا حکم (دبیر) اب بارش نہیں برساتا گھروں میں اُن کی کلہاڑیاں ٹوٹ چکی ہیں اور مقدس ڈھول کی آواز گم ہو چکی ہے ـــــ وہ عہد کب کا دفن ہو چکا اور یہ قلعہ بھی زیرِ زمین جانے کو ہے۔ شاید یہ وہی مقدس ڈھول تھا جو اس وقت اسلحہ خانے کے گرد آلود کمرے میں پھٹا ہوا پڑا تھا اور جو کسی زمانے میں بیرونی حملے یا کسی مقامی جشن کے موقع پر قلعے کی چھت پر رکھ کر بجایا جاتا تھا اور اس کی آواز پوری وادی میں گونجتی تھی ـــ اب اس کی آواز گم ہو چکی ہے ـــ کیا ہنزہ کا واحد لینڈ مارک اور گمشدہ پریوں کے باغ کی علامت یہ قدیم قلعہ واقعی ختم ہو جائے گا ـــ اور ہنزہ کا گمشدہ قلعہ کہلائے گا ـــ



باس میں آئی۔بی ہوں ..... ابراہیم بیگ۔

جب ہم قلعے میں سے باہر آئے تو چوکیدار چار دیواری کے اندر گرے ہوئے پتھروں کو اُٹھا اُٹھا کر دیوار پر رکھ رہا تھا۔ اُس نے ہمیں دیکھتے ہی دروازہ مقفّل کیا اور چلا گیا ـــــ شام ہونے کو تھی اور بلتت کی چھتوں پر عورتیں سوکھنے کیلئے پھیلائی ہوئی خوبانیوں اور شہتوتوں کو سمیٹ سمیٹ کر نیچے گھروں کے اندر لے جا رہی تھیں۔ چار دیواری کے بالکل نیچے ایک باغ میں سیبوں پر سورج کی آخری کرنیں تھیں اور اُس سے پرے راکاپوشی زرد ہو رہی تھی۔ ہم نیچے اُترنے لگے ـــــ ایک گھر کی چھت پر دو لڑکے بھاگ دوڑ میں مصروف تھے، اُن میں سے ایک ہمیں دیکھ کر نیچے اُترا اور ہمارے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ سر جھکائے شرمندہ سا۔ میں نے مسکرا کر پوچھا کیا ہے؟ اُس نے ایک پوٹلی میں سے چند پتھر نکالے اور ہتھیلی پر پھیلا کر انگریزی میں کہنے لگا "سَرپریشس سٹونز" کھردرے پتھروں میں یاقوت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تھے۔

"کتنے کا؟" سلجوق نے پوچھا۔

"پانچ روپے"

"نہیں دو روپے"

"جی ہاں" اُس نے ایک پتھر سلجوق کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

"پڑھتے ہو؟"

"جی ہاں"

"یہ پتھر کتنے کا؟"

"تین روپے"

"نہیں ایک روپیہ"

"جی ہاں"

بیش قیمت پتھروں کی تھوک خریداری کے بعد ہماری چال میں ایک شاہانہ اور امیرانہ اضافہ ہو گیا۔ لڑکے نے تین روپے اپنی پوٹلی میں ڈالے، اُس کا دھاگہ کھینچ کر انہیں محفوظ کیا اور پھر دوڑتا ہوا واپس اپنی چھت پر جا کر کھیلنے لگا۔ یہ چھت بھی قلعے کی چھت کی طرح ایک چھوٹا سا چوکور ٹکڑا تھی اور اُس کے گرد کوئی دیوار وغیرہ نہ تھی۔ وہ لڑکا اور اُس کا چھوٹا بھائی بلا خطر اُس پر اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ ہمیں صرف اُن کی جانب دیکھنے سے ہی خوف محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں یہ دوسری جانب کھائی میں نہ جا گریں۔ ایک مقامی کہاوت کے مطابق ہنزہ کی ماں یہ کبھی نہیں کہتی کہ بچو اُدھر مت جاؤ وہاں کھائی ہے، اُس چٹان پر نہ چڑھو گر جاؤ گے کیونکہ جن بچوں نے گرنا تھا وہ گر چکے اور اب وہ بچے پیدا نہیں ہوتے جو بلندیوں سے نیچے گر سکتے ہیں۔۔۔ تین چار سال کی عمر کے بچے ایسے پہاڑی راستوں پر اُچھلتے کودتے چڑھتے نظر آتے ہیں جن پر کوہ پیمائی کے سامان سے لیس کوئی تجربہ کار کوہ پیما بھی پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے۔

ہم اُس دوراہے پر پہنچے جہاں سے دائیں ہاتھ پر چٹان سے چمٹا ہوا

ایک راستہ اُلتر گلیشیئر اور درّے میں اُترتا ہے اور بائیں جانب اُترنے سے گلی کے اُوپر منقش کمرہ ہے، پن چکی ہے اور نیچے ڈرائینگ روم میں سے گذر کر "ہنزہ اِن" کی طرف جایا جاتا ہے ——— اِس دوراہے پر ہماری ملاقات "آئی بی" سے ہوئی۔

چُست نیلی جین، جاگر شوز۔ بنیان کے بغیر ایک کاڑھا ہوا ململ کا کُرتہ زیبِ تن کئے۔ گلے میں سنہری زنجیر۔ بال لانبے اور گھنگھریالے۔ درمیانہ قد سفید چہرے میں کھُبی ہوئی منگول آنکھیں ——— وہ لکھنؤ کے کسی بانکے کی طرح اُترتی شام کی سرد ہوا سے بے نیاز ٹہلتا ہوا ہماری طرف چلا آ رہا تھا۔

ہمیں دیکھ کر اُس کی منگول آنکھیں سمٹ گئیں، وہ رک گیا "ہیلو باس آپ کہاں گھوم رہا ہے؟"

باس نے اُسے بتایا کہ کہاں گھوم رہا ہے اور آزردہ بھی ہوا کہ اِن بانکے میاں نے اُسے کسی نہ کسی حوالے سے پہچان لیا ہے اور اب خواہ مخواہ راستہ کھوٹا کریں گے اور ظاہر ہے بور کریں گے ——— بانکے مجھے ہمیشہ بور کرتے ہیں۔

"باس یہ آپ کا بچہ ہے؟" اُس نے سلجوق کی طرف دیکھا۔

"ہاں باس" میں نے جواب دیا "آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

"میں اُدھر کراچی میں ہوتا ہوں۔ آپ کا ڈرامہ وغیرہ دیکھا ہے ٹی وی پر ——— ایک دم فسٹ کلاس باس"

یعنی موصوف کراچی کے تھے اور ہنزہ میں ململ کا کُرتہ پہنے گھوم رہے تھے ——— حد ہے!

"آپ شائد کہیں جا رہے تھے؟" میں نے پیچھا چھڑانے کی غرض سے کہا۔

"ہاں باس اُدھر اوپر جا رہا تھا قلعہ دیکھنے ——— ہم نے سوچا کہ اتنے لوگ آتا

ہے یورپ سے اسے دیکھنے تو ہم بھی دیکھیں کہ وہ سالا کیا دیکھنے آتا ہے ـــــ آپ کدھر ٹھہرے ہو؟"

"ہنزہ اِن میں"

"ہل ٹاپ بیسٹ ہے۔ ہنزہ اِن گذارہ ہے"

"آپ ہل ٹاپ میں ہیں؟"

"نہیں باس میں اپنے سُسرال میں ہوں ـــــ اپنا گاؤں ادھر سے دور ہے، گلیشیئر کے پاس"

"آپ ہنزہ کے رہنے والے ہیں؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

"برابر ہنزہ کا باس ـــــ" وہ مسکرایا "دکھائی نہیں پڑتا کہ میں ہنزہ کا ہوں"

"لباس اور زبان سے تو دکھائی نہیں پڑتا"

"کیا کریں باس ـــــ سٹڈی کراچی میں کیا۔ نوکری بھی وہیں ملا۔ بال بچہ بھی اُدھر ہے۔ سال میں ایک دو مرتبہ ہفتے دو ہفتے کا پھیرا اِدھر ہوتا ہے ـــــ تو پھر فرق پڑ جاتا ہے باس۔ اِدھر ہمارا پیٹ دیکھو اس کو بھی فرق پڑ گیا ہے ـــــ اِدھر ہوتا تو ساتھ لگا ہوتا اتنا بڑا نہ ہو جاتا ـــــ"

"اور آپ ہنزہ کے باشندے ہونے کے باوجود اُدھر اُوپر قلعے تک کبھی نہیں گئے؟"

"نہیں باس کبھی نہیں گیا ـــــ آج ہم نے سوچا کہ یہ سالا یورپ والا جو اِسے دیکھنے ـــــ"

ابراہیم بیگ جسے اُس کے کراچی کے دوست "آئی بی" کہتے تھے اگلے چند روز کے لئے ایک ہمدرد دوست اور ٹورسٹ گائڈ ثابت ہوا۔ اُس نے قلعہ دیکھنے کا پروگرام فوری طور پر ملتوی کر دیا اور ہمارے ساتھ نتھی ہو گیا۔ اُس کی موجودگی

ہمارے لئے بے حد سودمند تھی، وہ تمام راستے جانتا تھا، لوگوں کو پہچانتا تھا اور ہنزہ کے دیگر باشندوں کی طرح ہر بچہ اُس کا بھانجا بھتیجا۔ ہر مرد اُس کا ماموں، چچا نوجوان کزن اور ہر عورت اُس کی خالہ پھوپھی یا نانی وغیرہ نکل آتی تھی۔ میرے سامنے وہ کئی ایسے "سگے بھائیوں" سے بھی ملا جن کے نام اسے بھولتے تھے اور یہ حقیقت ہے کہ اہلِ ہنزہ صرف آپس میں شادیاں کرتے ہیں اور تقریباً ساری آبادی ایک دوسرے کے ساتھ کسی نہ کسی رشتے سے منسلک ہے۔ چڑھائی چڑھتے ہوئے اُس کا سانس پھول جاتا اور وہ شرمندہ ہو کر کہتا، باس یہ کراچی کی وجہ سے ہے۔ دو تین روز اِدھر رہنے کے بعد یہ معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔ اکثر اوقات راہ چلتے نوجوان اُس سے ہنستے ہوئے کچھ دریافت کرتے اور وہ ہاتھ ہلا کر انہیں ٹال دیتا۔ بعد میں اُس نے بتایا کہ ہنزہ کے نوجوان سیاحوں کے ہمراہ بطور گائڈ منسلک ہو جاتے ہیں اور اُن سے اپنی محنت کا معقول معاوضہ حاصل کرتے ہیں اور یہ نوجوان بھی یہی پوچھتے تھے کہ بھائی ان کو کہاں لے کر جا رہے ہو۔ کس گلیشیر کی سیر کروائی ہے اور معاوضہ کیا طے پایا ہے ——— اور اس کے جواب میں آئی بی انہیں بتاتا کہ نہیں یہ دوست ہیں ———

دور اپرے سے بائیں ہاتھ پر درّے اور گلیشیر سے آنے والے چٹانی راستے پر چند غیر ملکی سیاح قدم گھسیٹتے ہوئے واپس آ رہے تھے، اُن کے ہمراہ ہنزہ کے دو نوجوان گائڈ تھے ——— دو بوڑھی عورتیں سر پہ پانی کے کنستر رکھے اُوپر آ رہی تھیں۔

"آپ اُلتر گلیشیر گئے ہو باس؟" آئی بی نے دریافت کیا ——— "نہیں؟ ابھی تو ٹائم نہیں ہے۔ آؤ آپ کو درّے تک لے کے جاتا ہوں ——— آؤ ——— فکر نہ کرو راستہ بالکل خطرناک نہیں ہے"

وہ راستہ آئی بی کے لئے تو خطرناک نہیں تھا لیکن ہمارے شہری قدم

اُس پر خوفزدہ پرندوں کی طرح پھڑپھڑاتے تھے۔ اِس میں اُس نیم تاریکی کا بھی دخل تھا جو درّے میں ہم سے پہلے اُتر چکی تھی۔ دائیں ہاتھ پر نیچے گہرائی میں اُلتر نالے کا شور اُٹھ رہا تھا اور بائیں جانب ہمارے سروں پر ایک عمودی چٹان جھکی ہوئی تھی اور آسمان اوجھل تھا۔

چونکہ یہ راستہ چٹان میں سے تراشا گیا تھا اس لئے جا بجا نوکیلے پتھر راستے کو روکتے تھے اور بے دھیانی آپ کا سر اُن میں پرو سکتی تھی ـــــ سیاحوں کا گروہ قریب آیا تو آئی بی اور مقامی نوجوانوں کے درمیان کچھ مذاکرات ہوئے۔ انہوں نے حیرت کا اظہار کیا کہ ہم شام ڈھلے اُلتر کی جانب کیوں جا رہے ہیں اور آئی بی نے مسکراتے ہوئے انہیں تسلّی دی کہ نہیں ہم صرف درّے تک جا رہے ہیں ـــــ ہم پھر چلنے لگے۔ میں سلجوق کے بارے میں بے حد متفکر تھا کیونکہ اُس کی چال میں نوخیزی کی ایک بہکی بہکی اُٹھان تھی اور وہ راستہ صرف پختہ اور نپے تلے قدموں تلے ہی آتا تھا کیونکہ وہ تھا ہی مختصر اور جا بجا کھائی کی طرف جھکتا ہوا ـــــ تھوڑی دور جا کر ہم نے بلکہ میں نے مزید آگے جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا کیونکہ اب قدموں کے ساتھ ساتھ آنکھیں بھی دیکھنے سے قاصر ہو رہی تھیں۔ گہری شام میں صرف اندھیرا درّے میں اُتر سکتا تھا ـــــ واپسی پر ڈرائینگ روم کے سامنے والی دکانوں پر بلب جل چکے تھے۔ ہنزہ میں بجلی تو ہے لیکن صرف شب نو بجے تک اور اُس کے بعد صرف پورے چاند کی صورت میں ہی روشنی ہوتی تھی اور یہ وہ راتیں نہیں تھیں۔

"ہنزہ اِن" کے قریب پہنچ کر آئی بی نے ہمیں اگلی صبح اُلتر گلیشیئر تک لے جانے کا وعدہ کیا اور پھر خدا حافظ کہہ کر اپنی نیلی جین اور ململ کے کُرتے سمیت تاریکی میں غائب ہو گیا۔

ہم راستے سے الگ ہو کر سیڑھیاں اُترنے لگے تو سلجوق رُک گیا۔ اُس کی نظریں "ہنزہ اِن" کے بالائی برآمدے پر تھیں جس میں دو سائے تھے۔

"ابّو میرا خیال ہے فیو دورو اور اُس کی بیوی ہیں ——— اِن سے باتیں کریں؟"

"نہیں نہیں ——— صبح مل لیں گے" ——— پتہ نہیں یہ یورپی جوڑا کس کیفیت اور حالت میں ہے، میں نے سوچا، خوامخواہ بچّے کے اخلاق پر بُرا اثر پڑے گا۔

"ہیلو ہیلو" انہیں ہماری موجودگی کا شبہ ہوا اور وہ ہاتھ ہلانے لگے۔

"اب تو وہ بلا رہے ہیں" سلجوق خوش ہو گیا۔

فیو دورو اور اُس کی بیوی کھانے سے فارغ ہو کر چائے پی رہے تھے۔ ہم اُن کے ساتھ بیٹھ گئے۔ سامنے راکاپوشی تھی۔ جس کی سفیدی تاریکی کے باوجود کسی سفید شارک کی طرح پہاڑ کے سیاہ سمندر میں سے اُبھری ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

"ہم کل صبح اُلتر گلیشیئر پر جا رہے ہیں" میں نے انہیں بتایا۔

"نہیں نہیں،" اُس کی بیوی بولی" بچّے کے ساتھ نہیں۔ راستہ بہت خطرناک ہے۔ پتھر گرتے ہیں اور چند مقامات پر برف بالکل نرم ہے اور اُس کے نیچے کھائیاں ہیں"

"ہوں ——— " فیو دورو قدرے تامّل سے بولا " ہے تو خطرناک لیکن ———" اُس نے سلجوق کے کندھے کو پیار سے تھپکا" نوجوانوں کو تھوڑے بہت خطرے میں ڈالنا چاہیئے"

" میرے لئے ایک باپ کی حیثیت سے یہی کافی خطرہ ہے کہ میں اسے پنڈی سے گلگت اور وہاں سے یہاں تک لے آیا ہوں"

"نہیں نہیں" اُس کی بیوی نے غصے سے کہا "بچّے کے لئے نہیں ــــــ"

"تم اُلتر گلیشیئر دیکھنا چاہتے ہو؟ ابھی، اِسی وقت؟" فیو دورد اُٹھا اور کمرے میں سے اپنا وڈیو کیمرہ اُٹھا لایا "تم اِس ویو فائنڈر میں سے اُسے دیکھ سکتے ہو"۔ اُس نے کیمرے کا بٹن دبایا اور وڈیو فلم ویو فائنڈر کی ننھی مُنّی سکرین پر چلنے لگی ــــ گلیشیئر ــــ آبشاریں ــــ اور پھر بلندی پر نیلا آسمان اور چند ہیائی برفیں ــــ ایک جگہ بلند چٹان سے پتھر لڑھکتے ہوئے آ رہے تھے۔

سلجوق اور میں باری باری ویو فائنڈر پر آنکھ جما کر فلم دیکھتے رہے۔

فیو دورو وینس کے محکمہ ٹیلی فون کے کمپیوٹر ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھا اور بقول اُس کے سارا سال کمپیوٹر بنے رہنے کے بعد اُس کا جی چاہتا تھا کہ پانچ چھ ہفتوں کے لئے اُس کی چابی کھول دی جائے اور وہ آزاد ہو جائے۔ سیاحت کے دوران وہ وڈیو فلمیں بنا کر اطالوی ٹیلی ویژن کے ہاتھ بیچ دیتا تھا اور اس طرح اخراجات کا کچھ حصہ اُس کی جیب میں واپس آ جاتا تھا۔ لیکن صرف کچھ حصہ ــــ اُس نے پہلے بھی بتایا تھا کہ وہ دونوں انڈس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ دوسرے سیاحوں کی طرح وہ بھی ہنزہ کی خوشحالی سے بے حد متاثر تھا۔ اُس نے بتایا کہ لداخ میں یعنی سکردو سے صرف سو ڈیڑھ سو میل دور چھوٹی چھوٹی وادیاں ہیں جن میں رہائش پذیر لداخی سینکڑوں برسوں سے موسم اور غربت سے چپکے چلے آ رہے ہیں۔ ایک وادی میں رہنے والے یہ بھی نہیں جانتے کہ صرف چار پانچ میل کے فاصلے پر ایک اور وادی ہے اور اُس میں انہی کی طرح کے لوگ رہتے ہیں۔ وہ آس پاس سے بالکل بے خبر صرف زندہ رہنے کی جستجو میں لگے رہتے ہیں۔ خوراک کا ذخیرہ صرف سردار کے پاس ہوتا ہے اور ہر صبح پوری وادی کے لوگ اُس کے گھر کے سامنے کھڑے ہو کر تھوڑا سا "سامپا" وصول کرتے ہیں۔ "سامپا" اُبلے

ہوئے باجرے کا مرکب ہوتا ہے جو اُن علاقوں کی واحد خوراک ہے۔ اِسے نگلنے کے بعد وہ سارا دن پہاڑی ڈھلوانوں پر جانوروں کی طرح مشقت کرتے رہتے ہیں۔

کچن کی طرف سے ایک شخص تیز تیز قدم اُٹھاتا اوپر برآمدے میں آیا اور ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ فوراً ہی باہر آیا اور پھر نیچے چلا گیا واپس آیا تو اُس کے ہمراہ "ہُنزہ اِن" کا مسکین مینجر تھا۔ وہ دونوں کمرے میں چلے گئے۔

"جاپانی کی حالت بہت خراب ہے" فیودورو کی بیوی نے سر ہلا کر تاسف سے کہا "پتہ نہیں کیا ہوتا ہے ــــ ہُنزہ بہت خوبصورت ہے لیکن اپنے وطن سے دور مر جانا بدصورت ہوتا ہے"

"کیا اُس کی حالت واقعی اتنی خراب ہے؟"

"سی سی ــــ" فیودورد نے بھی سر ہلایا "بہت کمزور ہے۔ نیم بیہوش تیز بخار، پیچش اور سر درد ــــ"

کمرے کا دروازہ کھلا اور مسکین صورت باہر آگیا۔

"کیوں بھئی جاپانی کا کیا حال ہے؟"

"بہت بُرا حال ہے صاحب ــــ اچھا بھلا تھا۔ یہاں کوئی اَن دھوئے انگور کے چند دانے کھائے جس کی وجہ سے گڑبڑ ہوگئی۔ آج ہسپتال میں لے گئے تھے۔ انہوں نے گلوکوز لگایا ــــ تھوڑا ٹھیک ہوگیا اب پھر خراب ہے۔ اس کا ساتھی بولتا ہے صبح اِسے گلگت سے جائے گا جیپ میں ڈال کر ــــ"

"اور موٹر سائیکل؟" سلجوق نے پوچھا۔

"پتہ نہیں اُن کا کیا کریں گے صاحب ــــ صاحب میں تو دعا کرتا ہوں

کہ یہ کسی ماں کا بچہ اِدھر سے ٹھیک ہو کر اپنے گھر واپس جائے ــــ نہیں تو صاحب ــــ نہیں تو ہمارا بہت بدنامی ہے۔ لوگ کہیں گے پتہ نہیں اُس نے ہنزہ اِن میں کچھ کھایا تو ایسا ہو گیا ــــ اللہ اُسے شفا دے ــــ صاحب آپ کھانا اِدھر ہی کھا لو گے؟"

"نہیں، نیچے ہمارے برآمدے میں لے آنا ــــ ہم وہیں جا رہے ہیں۔"

نیچے جانے سے پیشتر ہم جاپانی کے کمرے میں گئے۔ کمرہ تو وہی تھا ہمارے ایسا، اتنا مختصر کہ بستروں کے علاوہ اور جگہ نہ ہونے کے برابر تھی۔ اُس کا ساتھی ہمیں دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ انگریزی سے یکسر ناواقف تھا، شانوں تک آئے ہوئے بال، ریکسین کی جیکٹ اور پتلون اور فل بوٹ ــــ اُس کی ہیئت کسی خلائی نورد کی سی تھی ــــ اور وہ اس وقت تھا بھی خلا میں ــــ اپنی زمین سے بہت دور، بے بس اپنے نیم بے ہوش ساتھی کو دہشت بے چارگی سے دیکھتا ہوا ــــ اور اُس کے ساتھی کا سر تکیے پر جھٹکوں کے ساتھ ہلتا تھا، آنکھیں بند تھیں اور چہرے کی پھیکی پیلاہٹ میں پتے کے مرجھانے سے پیشتر کا رنگ تھا ــــ ہم نے اشاروں کنایوں سے اُس کا حال دریافت کیا اور باہر چلے آئے۔

سیڑھیاں اُتر کر اپنے برآمدے میں ہمارا پہلا قدم تھا اور اُس کی آہٹ تھی اور ساتھ ہی وارث صاحب کی آواز تھی "آ گئے او چوہدری صاحب" اور وہ کمرے سے باہر تھے، اب وہ شلوار کے اوپر ایک عدد بش شرٹ بھی پہنے ہوئے تھے "بڑی دیر لگا دی میں نے کہا ــــ میں نے کہا ربّ خیر کرے ابھی تک آئے نہیں ــــ یہاں کیا پتہ جی۔ کچھ پتہ نہیں ــــ کہاں گئے تھے؟ ــــ اچھا یہ قلعہ کہاں ہے؟ ــــ ہنزہ میں؟ ــــ اچھا ہے؟ ــــ لاہور والے قلعے سے بڑا ہے؟ ــــ نہیں، تو پھر کیا قلعہ ہوا ــــ میں تو کہیں نہیں گیا ــــ یہ نیچے ہسپتال کے قریب ٹیلیفون

ایکسچینج میں ناروے وال کے دولٹر کے ہیں میں اُن کے پاس گیا تھا گپ لگانے —— بس اور کہیں نہیں گیا —— بڈھی کی طبیعت خراب ہے ناں اس لئے —— ابھی سُوپ پلایا ہے اُس کو —— "اس دوران اُن کے کمرے میں سے جرمن میں کچھ احکام صادر ہوئے اور وہ "چوہدری صاحب اگر کوئی دھوتی وغیرہ چاہیئے رات کے لئے —— ذرا بڈھی بلا رہی ہے" کہہ کر غائب ہو گئے۔

برآمدے کی کرسیوں پر بیٹھتے ہی ہمارے بدن تھکاوٹ سے پتھر ہونے لگے۔ برآمدے کے آگے کیاری میں نیم سفید پھولوں کے بڑے بڑے گچھے ناتواں سے ڈنٹھلوں پر لرز رہے تھے اور اُن میں سے ایک کچھ بیمار کر دینے والی خوشبو آرہی تھی۔ اُن کے آس پاس سلاد اُگی ہوئی تھی اور ہنزہ اِن کا ایک فاتر العقل ملازم اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر سلاد کے پتے چُن رہا تھا۔ کیاری سے پرے کھیت تھے جو تاریک تھے اور ہنزہ دریا کا شور تھا مکانی اور مدھم مدھم اور را کاپوشی تھی جو ایک ہلکے دھبے ایک نامعلوم واہمے کی طرح تھی —— ہو سکتا ہے اب وہاں نہ ہو اور چونکہ ہماری آنکھیں اُسے وہاں دیکھتے رہنے کی عادی ہو چکی تھیں اس لئے "نظر" آرہی ہو۔

میرا زکام شدید ہو چکا تھا اور بدن میں تھکاوٹ کے علاوہ حرارت کروٹیں لیتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد مینیجر کھانا لے کر آگیا۔

"صاحب ساگ ہے بہت اچھا اور تازہ آملیٹ ہے اور ڈاؤ ڈاؤ ہے ——"

"کیا ہے؟" سلجوق مسکرانے لگا۔

"ڈاؤ ڈاؤ سُوپ صاحب —— ہُنزہ کی خاص چیز ہے۔ آپ پسند کرو گے۔"

اور ہم نے پسند کیا۔ اِس میں وہ سلاد بھی تھی جو ابھی ابھی فاتر العقل ملازم کیاری میں سے توڑ کر لے گیا تھا۔ چائے کے بعد مسکین صورت نے کمرے میں سے لالٹین اُٹھائی اور اُسے جلا کر ہمارے سامنے میز پر رکھ دیا —— نو بجے بجلی چلی گئی

اور برآمدے کے بلب بجھ گئے، پہلے اندھیرا آگے آیا اور پھر لالٹین کی روشنی اُس اندھیرے میں سرائت کرتی کرتی اپنا لرزتا مدھم وجود برقرار رکھنے کے لئے تھرتھرانے لگی۔



کُل کتنے قتل؟... ثمر قند۔ رحیم یاری اور بربر قتل۔

میرا سَر بقیہ بدن سے کٹا ہوا گلیشیئر کا ایک ٹکڑا تھا جو شاید یخ بستگی کی وجہ سے مکمل طور پر ٹھنڈا ہو کر مر چکا تھا ـــــ فریزر میں بہت عرصہ رکھا رہنے والا خوراک کا تھیلا تھا ـــــ میں صرف اتنا جانتا تھا کہ میرے ایک ہاتھ میں مگ ہے جس میں چند لمحے پیشتر وہ پانی تھا جسے میں نے سر پر ڈالنے کی حماقت کی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے بعد اب میں کیا کروں۔ بقیہ بدن پر کسی نہ کسی طرح ہمت کر کے ایک اور مگ پانی انڈیل کر نہا لوں یا اس یخ بستگی کی حالت میں اُٹھ کر اگر اُٹھ سکوں تو، باہر جا کر وارث صاحب پر برس پڑوں ـــــ کیونکہ آج صبح میرے استفسار پر انہوں نے بتایا تھا کہ جناب چوہدری صاحب ضرور نہائیے اسی پانی کے ساتھ، کچھ نہیں کہتا، ٹھنڈا لگتا ہے لیکن بس پہلا مگ مشکل ہوتا ہے ـــــ میں تو صبح شام اِسی سے نہاتا ہوں ـــــ مجھے یقین تھا کہ اُلتر گلیشیئر کا یہ پانی میرے دماغ میں داخل ہو کر اُس کے خلیوں کو برف میں بدل چکا ہے کیونکہ وہاں سے کوئی جواب نہیں آ رہا تھا۔ کیا میرا سر موجود ہے؟ کیا مجھے ایک مگ اور ڈال کر اپنے غسل کو اختتام تک پہنچانا چاہیے؟ اور اگر میں وہ مگ اپنے اوپر انڈیلنے میں کامیاب ہو جاؤں تو کیا میں بچ جاؤں گا یا منجمد ہو کر ہنزہ میں رہ جاؤں گا؟

— بہر حال میں نے ایک بے حس اور ساکت سی کیفیت میں پتہ نہیں کیا کیا اور غسل خانے میں سے برآمدے میں اس طرح اکڑا ہوا چلتا آیا جیسے کوئی مصری ممّی زندہ ہو کر انتقام لینے کے لئے آگے بڑھتی ہے اُس شخص کی طرف جس نے اُسے ہزاروں برس پُرانے تابوت میں سے نکالنے کی جرأت کی تھی اور میں اسی طرح وارث صاحب کی طرف بڑھا۔

"کیوں جی آیا مزہ؟" وارث صاحب حسبِ معمول شلوار زیبِ نصف تن کئے برآمدے میں بیٹھے تھے۔

"میں نے کہا چوہدری صاحب طبیعت تو ٹھیک ہے — کیا بات ہے بول نہیں رہے —"

خوش قسمتی سے یعنی وارث صاحب کی خوش قسمتی سے میرے یخ بدن کو دھوپ نے ذرا گرمایا اور میں مصری ممّی کی طرح اُن کا گلا دبا دینے سے باز رہا۔

"بیٹھ جاؤ اور فوری طور پر کچن میں سے کافی کا ایک گرم مگ لے کر آؤ"۔ میں ابھی تک ایک سرد پتھر تھا۔

تھوڑی دیر بعد پتھر قدرے نرم ہوا اور کپکپاہٹ طاری ہو گئی۔ راکاپوشی پر نظر پڑ جاتی تو کپکپاہٹ میں اضافہ ہو جاتا۔ جب حالاتِ بدن کچھ نارمل ہوئے تو میں نے وارث صاحب کو گھورا "اچھا ضرور نہاؤ اس پانی سے، کچھ نہیں کہتا؟"

وارث صاحب نے ناراض نظروں سے مجھے دیکھا "کیوں مزا نہیں آیا میں تو جرمن میں بھی ٹھنڈے پانی سے نہاتا ہوں — بے شک بڈھی سے پوچھ لو"

اور اُسی لمحے وارث صاحب کی بڈھی کمرے سے باہر آگئی۔ ظاہر ہے ایک نیک دل خاتون جنہوں نے وارث صاحب کے ساتھ دو بول پڑھوائے

تھے اور وارث صاحب بھی باہمت تھے کہ اُن کے ساتھ شادی کر جانے کا حوصلہ کیا تھا ــــ بُڈھی نے کاٹن کا ایک ہلکا پھُولدار فراک پہن رکھا تھا جس کے پھول شائد اُن کی قربت سے مرجھائے ہوئے لگتے تھے، پاؤں میں اُونچی ایڑھی کی جوتی، بھورے پریشان بال، چونکہ اُستانی تھیں اس لئے عینک پہنتی تھیں اور شائد چاکلیٹ زیادہ کھاتی تھیں اس لئے مسکرانے سے پرہیز کرتی تھیں ــــ بہرحال اُن کے ساتھ تفصیلی بات چیت نہ ہو سکی کیونکہ وہ انگریزی میں "تھینک یو" اور "گڈ بائے" کہتی تھیں اور میں جرمن میں "دانکا شون" اور "افیدہ زین" کہتا تھا اور ان کے علاوہ ہم دونوں کی ڈکشنری میں کوئی لفظ مشترک نہ تھا ــــ وارث صاحب اپنی پنجابی جرمن میں اُن سے بات کرتے اور پھر اپنی پنجابی پنجابی میں مجھ تک پہنچاتے اور بات کہیں سے کہیں نکل جاتی۔

"ذرا پہاڑوں پر چڑھنے کا پروگرام ہے" وارث صاحب کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں "میری بڈھی کو پہاڑ بڑے پسند ہیں، میں ذرا ٹی شرٹ پہن آؤں ــــ" وہ غڑاپ سے کمرے میں چلے گئے۔ اِس دوران اُن کی بڈھی حسرت آمیز نظروں سے راکاپوشی کو دیکھتی رہی۔ وارث صاحب جب باقاعدہ ڈریس اَپ ہو کر باہر نکلے اور اپنی سفید فام اہلیہ کو جو اہل تھیں یا نہیں لیکن اہلیہ تھیں راکاپوشی میں مستغرق پاکر مجھے کہنے لگے "اسے بُوٹے اور درخت بھی بڑے پسند ہیں۔ وہاں جرمن میں اچھا بھلا فلیٹ چھوڑ کر شہر سے بیس کلو میٹر دور ایک مکان صرف اس لئے لیا ہے کہ اُس کا ایک ــــ برابر بغیچہ بھی ہے۔ اُس میں چقندر اور دیگر پھل پھول اُگاتی ہے۔ اسی لئے یہاں بڑی خوش ہے، ہر طرف بغیچے ہی بغیچے ــــ" بڈھی صاحبہ راکاپوشی سے واپس آئیں تو وارث صاحب کو

سامنے پایا اور پھر اُن کے ساتھ اُسی زبان میں بات کی جو کہ وہ سمجھتے تھے اور دونوں میاں بیوی خوش خوش پہاڑوں پر چڑھنے کے لئے روانہ ہو گئے۔

سلجوق کافی کا مگ بنوا کر لایا تو کہنے لگا" یہ مسٹر اینڈ مسز وارث کہاں جا رہے ہیں؟"

"پہاڑوں پر چڑھنے"

"اونچی ایڑھی کی جوتی اور پشاوری چپل میں؟"

"تمہیں کیا اعتراض ہے؟"

"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں البتہ پہاڑوں کو ہو گا ۔۔۔" اُس نے متفق ہونے کی کوشش کی اور مگ مجھے تھما دیا۔

میرا زکام جو بقیہ بدن کے ساتھ منجمد ہوا تھا، دھوپ میں بیٹھنے سے رواں ہو گیا اور بخار کی حدت مجھے مزید گرم کرنے لگی۔ ایک ڈھلوان کھیت پر چند کسان چارہ کاٹ رہے تھے اور اُس کی سبز باس ہوا میں پھیلتی تھی۔ سلجوق ناشتہ کرنے کے لئے کچن میں چلا گیا اور میں کمرے آ کر بستر میں لیٹ گیا۔

گیارہ بجے کے قریب آئی بی صاحب تشریف لے آئے۔ اُن کے ہاتھ میں ایک پوٹلی تھی۔ مجھے پھندنے والی اونی ٹوپی اوڑھے شوں شوں کرتے بستر میں گھسے دیکھا تو کہنے لگے" باس کیا ہو گیا؟"

میں نے کہا، باس کو زکام ہو گیا ہے۔

انہوں نے پوٹلی میں سے ایک چھوٹا سا سُرخ سیب نکال کر میرے کمبل پر رکھ دیا" باس ہنزہ کا سیب ہے۔ یہ کھاؤ ٹھیک ہو جاؤ گے"

چار پانچ سیب کھانے کے بعد بھی زکام کی روانی میں فرق نہ آیا" خریدے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں باس۔ ہنزہ میں سیب صرف بیوقوف اور ٹورسٹ خریدتے ہیں۔ کسی باغ کے باہر کھڑے ہو کر مانگ لو مفت میں مل جائیں گے، میٹھے ہیں ناں؟"

"زبردست باس" سلجوق پہلی مرتبہ گویا ہوا کیونکہ وہ اُن پر مسلسل دانت تیز کر رہا تھا۔

"پھر آج اُلتر گلیشیئر پر جائے گا؟"

"نہیں جائے گا ــــــ" میں نے ناک میں زکام کی مخصوص چلبلاہٹ کے بلبلے پھوٹتے محسوس کئے "باس بیمار ہے اور اُدھر کا راستہ بھی خطرناک ہے، پتھر گرتے ہیں"

"پتھر گرتے ہیں؟" آئی بی گھبرا گیا "تمہیں کس نے بتایا باس؟"

"ہمارے دوست اطالوی جوڑے نے جو کل اُدھر کو گئے تھے ــــــ"

"سالا جھوٹ بولتا ہے"

"سالا جھوٹ نہیں بولتا۔ میں نے اُس سالے اور سالی کے ٹرپ کی وڈیو فلم دیکھی ہے اور اُس میں یہ بڑے بڑے پتھر لڑھکتے چلے آرہے تھے"

"سچ باس ــــــ" آئی بی باقاعدہ نروس ہو گیا۔

"میں نے بھی دیکھی ہے" سلجوق نے لقمہ دیا "اور اُدھر برف بہت نرم ہے، اُس پر پاؤں رکھو تو شڑاپ سے بندہ گہری کھائی میں ــــــ"

"جانے دو یار ــــــ" آئی بی ایک گھگھیائی ہوئی ہنسی ہنسا اور پھر کہنے لگا "باس دراصل مجھے بھی کچھ ٹھیک پتہ نہیں راستے کا۔ بچپن میں اُدھر گیا تھا پھر اُدھر کراچی چلا گیا۔ خیال تھا کہ تمہارے ساتھ ہم بھی اُلتر گلیشیئر دیکھ لے گا، دیکھیں تو سہی یہ سالا یورپین لوگ اُدھر بھاگ بھاگ کر کیوں جاتا ہے ــــــ پر آج رہنے دو کل میں اپنے کسی کزن کو ساتھ لے آؤں گا تو اُس کے ساتھ چلیں گے ــــــ لو سیب کھاؤ"

دوپہر کے کھانے کے بعد میری طبیعت قدرے سنبھل گئی اور ہم آئی بی کے ہمراہ ہوٹل سے باہر آ گئے۔

"باس یہ کریم آباد ہوٹل کے ساتھ جو قُل یعنی نہر بہہ رہی ہے ناں، جس میں یہ دکاندار لوگ کوکاکولا کی بوتلیں فریز کرتا ہے۔ ہم بچپن میں اس کے کنارے کنارے چلتے پورے بلتت کے گرد چکر لگا کر درّے میں پہنچ جاتے تھے ـــــ آج دیکھیں یہ سالا قُل اب بھی اُدھر ہی جاتا ہے کہ نہیں ـــــ آؤٹنگ ہو جائے گی"

ابراہیم بیگ عرف آئی بی دراصل ہمارے جیسا ہی ایک سیاح تھا۔ ہم نئی سرزمینوں کو دریافت کر رہے تھے اور وہ بچپن کے بھولے بسرے راستوں کی کھوج میں تھا۔ وہ اپنے ہنزہ کو کراچی میں گم کر آیا تھا اور اب ہمارے ناطے سے اُسے دوبارہ تلاش کرنا چاہتا تھا۔ قُل کے ساتھ اسی میں سے نکالی ہوئی ریت کے راستے پر آئی بی اپنے ململ کے کرتے میں ملبوس چلتا جا رہا تھا، اس کے پیچھے سلجوق تھا اور کچھ فاصلے پر پھُندنے والی ٹوپی کو کانوں تک کھینچے، موٹا سویٹر پہنے اور چھڑی کو ٹیکتا ہوا میں تھا۔ جس راستے پر ہم چل رہے تھے اُس کے بائیں ہاتھ پر قل تھی اور پہاڑی پر میر کے باغات تھے، دائیں ہاتھ پر کچھ بھی نہ تھا، جو کچھ تھا وہ نیچے تھا یعنی شاہراہِ ریشم کا فیتہ۔ دریائے ہنزہ کا پُل اور گنیش کا گاؤں۔ پاؤں پھسلنے پر انسان کے گرنے کی رفتار کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وہ گرے گا اور اور نیچے تک پورے دو کلومیٹر کا فاصلہ طے کرے گا۔

سلجوق اپنے بُوٹ سے ریت کو ٹھوکریں مارتا ہوا چل رہا تھا اور ریت نیچے گر رہی تھی ـــــ دریا کے پار نگر گلیشیئر اور برفانی چوٹیاں ہمارے پہلو بہ پہلو چل رہی تھیں جیسے ہم کسی ہیلی کوپٹر میں سوار ہو کر اُن کے کنارے کنارے پرواز کر رہے ہوں۔ ریت گرم ہو رہی تھی۔

"باس ـــــ" میں نے آئی بی کو پکارا "یہ تمہارے ملک میں اتنی گرمی کیوں ہے؟"

وہ رُک گیا "اِدھر تین مہینے سے بارش نہیں ہوئی بڑے بھائی ـــــ فصلیں اور باغ سوکھ رہے ہیں ـــــ ہر طرف گرد ہے"

"مجھے تو فضا بہت شفاف نظر آتی ہے"

"آپ نے ہنزہ کو بارش کے بعد نہیں دیکھا ناں اس لئے ـــــ اِس قُل میں پانی بھی اِسی لئے زیادہ ہے ـــــ تیز دُھوپ سے اُلتر پگھل رہا ہے"

"یہ اُلتر سے آ رہی ہے؟"

"برابر باس - ہنزہ کا سارا پانی اُلتر سے آتا ہے ـــــ تمہیں معلوم ہے ہنزہ کی ہریالی کہاں سے آتی ہے، اُلتر کے پانیوں میں سے ـــــ اُدھر پانچ نسل پہلے ہنزہ کے لوگوں نے اُلتر گلیشیر میں سے قُل نکالے - وہ لوگ شہتوت کی ٹہنیوں سے بنی ہوئی ٹوکری میں بیٹھتے تھے اور اُن کے ساتھی انہیں یاک کے بالوں سے بنے ہوئے رسّے سے باندھ کر چٹان کی چوٹی سے نیچے لٹکا دیتے تھے - وہ آسمان اور زمین کے درمیان لٹکے ہوئے مارخور کے سینگوں کے ساتھ چٹانوں کو کُرید کُرید کر نہریں بناتے تھے۔ باس تب بہت لوگ مرا ـــــ لیکن وہ پانی کو ادھر ہنزہ تک لے آئے اور پھر اُس قل میں سے چھوٹی چھوٹی کئی قُل نکال کر ہر کھیت اور ہر گھر میں لے گئے بہت پُرانا اور بہت بڑھیا سسٹم ہے باس ـــــ ہم لوگ اپنے قُل کی نگرانی اس طرح کرتے ہیں جیسے آپ لوگ شہروں میں اپنے گھر کی حفاظت کرتے ہیں۔ سب نے اپنے اپنے علاقے بانٹ رکھے ہیں جن میں سے گذرتی قُل کا دھیان رکھا جاتا ہے کہ کہیں سے پانی باہر تو نہیں آ رہا، کنارا تو نہیں ٹوٹ گیا، اگر اُس میں پتھر گر گئے ہیں تو اُن کو نکالو، ریت زیادہ ہو گئی ہے تو اُس کو نکالو ـــــ باس یہ سب کام ہم خود کرتے ہیں، کسی کے کہنے پر، حکومت کی وجہ سے نہیں کرتے بلکہ

اپنے ہنزہ کے لئے کرتے ہیں ـــــ اِدھر ہم باتیں نہیں کرتا، وعظ نہیں کرتا کام کرتا ہے ـــــ اُدھر دوسرے علاقوں میں لوگ مسجدوں میں لڑتے ہیں، فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے سے لڑتے ہیں ـــــ ہم قدرت کے ساتھ لڑتے ہیں اور اپنا حصّہ لیتے ہیں ـــــ"

میں نے اپنے گاؤں میں نہری نظام میں آئے دن کے تنازعات کے حوالے سے پوچھا کہ آئی بی جہاں پانی ہو وہاں جھگڑا ہوتا ہے ـــــ یہاں بھی ہوتا ہے؟

"معمولی ہوتا ہے باس ـــــ پرَ زیادہ نہیں ـــــ پانی خدا کا ہے۔ ہنزہ والا اُسے بازو کے زور سے یہاں تک لے آیا ہے ـــــ سب کو برابر ملتا ہے ـــــ جھگڑا کیا ہوگا ـــــ سب برابر کام کرتا ہے"

سلجوق بڑے انہماک سے آئی بی کی گفتگو سُن رہا تھا اور چلتا جا رہا تھا۔

"اِدھر اِس قُل کو صاف کرنا تو معمولی ہے لیکن اُدھر چٹانوں کے اندر جو قُل ہے بلندی پر وہ کئی جگہ تو کُھلی ہے اور کئی جگہ بالکل غار کے موافق ہے باس اُس کے اندر اُتر کر اندھیرے میں کام کرنا پڑتا ہے اور کبھی وہ اُوپر سے گر بھی جاتا ہے ـــــ"

"اور اُس میں کام کرنے والے لوگ؟"

"وہ تو دب جاتا ہے چٹانوں کے نیچے ـــــ ہوتا رہتا ہے۔ سال میں ایک دو مرتبہ ہو جاتا ہے"

"اور اِن نہروں کے الگ الگ نام بھی تو ہیں آئی بی" سلجوق نے پوچھا۔

وہ اپنی منگول آنکھیں بند کر کے سوچنے لگا "نہیں باس اس وقت یاد نہیں"

سلجوق نے اپنے تھیلے میں سے ڈائری نکالی اور پڑھنے لگا ــــــ "بڑا بڑا قل اُلتر گلیشیئر سے نکلتا ہے۔ پھر اُس سے چھوٹی چھوٹی شاخیں نکلتی ہے ــــ نام یہ ہیں ـــــ سکندر قُل۔ ثمر قند قُل دلبر ـــــ ملک دِلا اور کشر دِلا اُن لوگوں کے نام پر ہیں جنہوں نے انہیں کھودا ـــــ کریم یاری۔ رحیم یاری۔ امام یاری، مرکوک مورنگ دلا۔ شاباد دِلا۔ ہماپی اور جناب ـــــ بربر قُل جو سب سے بڑی اور وسط ایشیا کی سب سے مشہور قُل ہے، اِس کی لمبائی چھ میل ہے ـــــ ٹھیک ہے آئی بی؟"

آئی بی چکرا گیا اور اُس نے آنکھیں جھپکیں ــــ "ٹھیک ہی ہو گا باس ـــــ ہم تو صرف بربر قُل کو جانتا ہے ـــــ لیکن تمہیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا؟"

میں بھی سلجوق سے یہی پوچھنا چاہتا تھا۔

"ہنزہ اِن کا مسکین صورت مجھے بتاتا گیا اور میں لکھتا گیا ــــ" اُس نے ڈائری تھیلے میں ڈالی اور پھر چلنے لگا۔

ایک مقام پر قُل بلند ہونے لگی اور راستہ اُس سے بچھڑ کر نیچے جانے لگا۔ ہم سستانے کی خاطر ایک اُجاڑ باغ میں جا بیٹھے ـــــ یہاں سے علتت کا قصبہ نظر آ رہا تھا اور اُس کی چھتوں سے پرے ٹیلے پر وہ قلعہ تھا جسے ہم نے پھسو جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ بلتت کی نسبت علتت نشیب میں واقع تھا۔

"علتت یہاں سے کتنی دور ہے آئی بی؟"

"چار پانچ کلو میٹر ہو گا باس ـــــ کل اُدھر چلیں گے"

"کل تو اُلتر نہیں جانا؟"

"ہاں ـــــ وہ ـــــ بہر حال پرسوں چلیں گے"

ہمارے نیچے اُلترنالے کے پار پہاڑ کی ڈھلوان کے ساتھ ایک چھوٹا سا گھر اور

اس کا چوکور، باغ ماں کے کوہے پر معلق ایک بچے کی طرح چمٹا ہوا تھا۔ ہاتھ میں کُدال تھامے اپنے مخصوص اور پُروقار لباس میں ہنزہ کی ایک خوبصورت خاتون درختوں کو سیراب کرنے والی چھوٹی نالیوں میں سے ریت نکال رہی تھی۔ خوبانی کے درخت خالی تھے اور سیب کے درختوں کی گود بھری ہوئی تھی۔

"آنٹی بی میں نے سُنا ہے کہ ہنزہ کی عورت صرف اُس جگہ رہ سکتی ہے جہاں خوبانی کے درخت ہوں ——— کیا یہ درست ہے؟"

"کسی حد تک ——— چونکہ ہم سب آپس میں شادیاں کرتے ہیں اس لئے دُلہن جہاں بھی جائے گی وہاں خوبانی کا باغ ضرور ہوگا اور اگر نہیں ہوگا تو وہ میکے سے چند پودے لے جا کر اپنے صحن میں لگائے گی ———"

"آنٹی بی کیا کراچی میں بھی خوبانی کے درخت ہیں؟"

"نہیں باس کراچی میں کہاں"

"تو پھر تمہاری خاتونِ خانہ وہاں کیسے رہ لیتی ہے؟"

"باس وہ ٹیلی ویژن دیکھتی ہے۔ الفی میں شاپنگ کرتی ہے اور اپنے فلیٹ میں خوش ہے"

وہ خوبانی کے درختوں کو بھول چکی ہے"

ہمارے دیکھتے دیکھتے وہ عورت اپنے باغ میں سے نکلی اور ایک عمودی چٹان پر چڑھنے لگی، اُوپر سے دو انتہائی عمر رسیدہ مائیاں بڑے اطمینان سے چھم چھم کرتی نیچے چلی آ رہی تھیں ——— ایک سیاح نے مقامی باشندوں کو اتنی ترچھی بلندیوں پر چہل قدمی کرتے ہوئے دیکھ کر کہا تھا کہ ہنزہ یقیناً جنوں اور بھوتوں کی سرزمین ہے، انسان تو ایسی بلند اور خطرناک ڈھلوانوں پر سیر سپاٹا نہیں کر سکتا ——— تھوڑی دیر سستانے کے بعد ہم واپس راستے پر آ گئے۔ بلتت اب پہاڑ کی اوٹ میں تھا

اور ہم اُسے دیکھ نہیں سکتے تھے۔ راستہ مزید نیچے ہوا اور اُلتر نالے کا شور اور قریب ہوا۔ ایک موڑ پر اُس کا بے رنگ پانی دکھائی دینے لگا۔

"ہم کدھر جا رہے ہیں؟" میں نے آئی بی سے دریافت کیا۔

"آپ چلے آؤ میں راستہ جانتا ہوں"

میں نے گلیشیئر کے قریب سانس لیتی ایک عمارت کو سر اُٹھا کر دیکھا۔" وہ دوسرے پہاڑ کی چوٹی کے قریب کس کا گھر ہے؟"

"جماعت خانہ ہے باس!"

"کونسی جماعت کا؟" سلجوق نے بھولپن سے دریافت کیا۔

"ہماری جماعت کا ــــ آپ کو معلوم تو ہو گا کہ ہم اسماعیلی فرقے سے تعلق رکھتے ہیں ــــ جماعت خانہ، عبادت گاہ اور پنچائت گھر کے طور پر استعمال ہوتا ہے"

"آئی بی ہنزہ میں میری نظام تو ختم ہو چکا، تمہارا کیا خیال ہے اچھا ہوا یا بُرا؟"

"اچھا ہوا" وہ مسکرایا۔" لیکن میر تو اب بھی میر ہیں، باغ اُن کے اندر ہیں اُن کی صرف کاغذ پہ اُن کا نام نہیں آتا ــــ اُن کا محل بھی ہم نے بنایا تھا"

"تم نے؟"

"ہنزہ کے عوام نے ــــ باس ادھر بیگار بھی لیا جاتا تھا"

"ڈرائنگ روم میں بیٹھنے والے بوڑھے تو میری نظام کے بے حد مداح تھے اور اس کے خاتمے پر رنجیدہ تھے"

"ہاں وہ بھی ٹھیک کہتے ہیں ــــ پہلے سارے جھگڑے مقامی طور پر میر صاحب ہی طے کر دیتے تھے۔ اب پولیس آگئی ہے، عدالتیں آگئی ہیں اور آپ کو پتہ ہے پولیس ہنزہ میں آکر بھی پولیس ہی رہتی ہے ــــ لیکن نئی نسل

بہت مطمئن ہے ـــــ وہ میری نظام کی شدید مخالف ہے ـــــ میروں اور شاہوں کے آگے اب کون جھکنا پسند کرتا ہے ـــــ آپ میر سے ملے ہو؟"

"آج سے بیس بائیس برس پیشتر تو اُس وقت کے میر صاحب نے مجھے ذاتی طور پر ہنزہ آنے کی دعوت دی تھی آئی بی"

"تو ٹھیک ہے باس ـــــ" آئی بی نے آنکھیں میچ کر قہقہہ لگایا "تم موجودہ میر کو جا کر بولو کہ ہم کو آپ کے والد صاحب نے بلایا تھا لیکن ہمیں آتے آتے ذرا دیر ہو گئی ـــــ"

"ویسے موجودہ میر کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"ٹھیک ہے ـــــ وہ اپنے محل میں خوش اور ہم اپنی مرضی سے اِدھر خوش ـــــ ویسے وہ پچھلے دنوں کونسلر کا الیکشن لڑا تھا۔"

مجھے یہ بات کچھ عجیب سی لگی ـــــ کہا جاتا ہے کہ لندن میں میر آف ہنزہ کا استقبال "کِنگ آف یوٹوپیا" یعنی خوابوں کی جنت کے بادشاہ کے طور پر کیا گیا تھا ـــــ کہاں کِنگ آف یوٹوپیا اور کہاں صفائی کے محکمے کی کونسلری ـــــ بہرحال جدید حقائق کا تو سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔

ہم اُلتر نالے کے کنارے پر اُترے تو وہاں بے پناہ شور تھا۔ گلیشیر کی جانب سے بڑے بڑے پتھر اس کے پانیوں میں گھومتے ہوئے نیچے چلے آ رہے تھے۔ تھوڑی دور تو ہم اس کے ساتھ ساتھ چلتے رہے، اگرچہ پاؤں گیلے پتھروں پر پھسلتے تھے اور پھر آئی بی کے کہنے پر ہم کانٹے دار جھاڑیوں سے اٹی ہوئی ایک خطرناک ڈھلوان پر چڑھنے لگے ـــــ ایک بڑے پتھر نے ہمارا راستہ روک لیا۔ نیچے اُترنے کی بھی گنجائش نہ تھی۔ ہم جہاں تھے وہیں دم روک کر کھڑے ہو گئے۔ آئی بی کا اصرار تھا کہ اگر ہم ذرا ہمت سے کام لیں، گھبراہٹ سے کام نہ لیں تو گمشدہ راستہ تلاش

کر سکتے ہیں ورنہ ساری عمر یہیں کھڑے رہیں گے ـــــ لیکن ہم تو جہاں کھڑے تھے وہاں بھی بمشکل کھڑے تھے، اوپر پتھر جھکا ہوا تھا اور نیچے اُلترنالے کے منہ زور پانی پھنکار رہے تھے۔

"بھائی آئی بی سچ بتانا آپ کبھی ادھر آئے ہو؟"

"بچپن میں آیا تھا باس ـــــ لیکن آپ ٹھہرو میں راستہ تلاش کرتا ہوں۔"

چونکہ آئی بی ہم سے بہتر جگہ پر کھڑا تھا اس لیئے وہ اپنے آپ کو سنبھالتا ڈگمگاتے قدموں سے جھکا ہوا اُوپر جانے کی کوشش کرنے لگا ـــــ میں نے ایک ہاتھ سے سلجوق کو تھام رکھا تھا اور دوسرے میں چھڑی تھی جس کے سہارے اپنے آپ کو اس ڈھلوان پر قائم رکھنے کی تگ و دو کر رہا تھا ـــــ اور یہ صورتِ حال زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے آئی بی کی آواز سُنی۔ وہ ہم سے اُوپر ایک بلند جگہ پر کھڑا دونوں ہاتھ ہلا ہلا کر ہمیں اوپر آنے کو کہہ رہا تھا۔ پانی کے شور میں اُس کے کچھ لفظ ڈوبتے کچھ تیرتے ہم تک پہنچ رہے تھے ـــــ باس ـــــ راستہ ـــــ آؤ ـــــ ہم اُس کی طرف دیکھ رہے تھے اور وہ ہمیں نظر آ رہا تھا اور یکدم وہ وہاں نہیں تھا غائب ہو چکا تھا۔

"ابو" سلجوق نے میرا کندھا پکڑ لیا "آئی بی گیا"

"کہاں گیا؟" میں نے نروس ہو کر کہا۔

"بس گیا۔ وہ یقیناً پھسل کر دوسری جانب کھائی میں گیا"

میرے ذہن میں اب صرف خدشے تھے ـــــ بے چارہ آئی بی ـــــ اُس نے ہم پر ثابت کرنا چاہا تھا کہ کراچی میں رہنے کے باوجود اُس کا ہنزہ خون ابھی سرد نہیں ہوا اور وہ اپنے دوسرے ہم وطنوں کی مانند پہاڑوں میں اب بھی اُچھل کود سکتا ہے۔ اُس کا سانس پھول جاتا تھا لیکن ہم پر ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا ـــــ

بے چارہ ابراہیم بیگ ___ باس اب ہم تمہیں کہاں اور کیسے تلاش کریں ___ نہ صرف تم گئے بلکہ ہم بھی گئے۔

"لیکن ابّو ___" سلجوق اِدھر اُدھر دیکھ کر کہنے لگا۔" اگر آئی بی گرتا تو اِدھر ہمارے اُوپر آگرتا ___ اُدھر کس طرح چلا گیا؟"

"مجھے کیا پتہ کس طرح چلا گیا"

اُسی لمحے آئی بی کی دلدوز آواز سنائی دی ___ باس ___ باس ___ میں یہاں ہوں!

ہم نے دیکھا کہ وہ پہلی پوزیشن سے تقریباً پندرہ بیس میٹر کے فاصلے پر اُسی بلندی پر کھڑا ڈگمگا رہا ہے ___ ململ کا کُرتہ جسم سے چپکا ہوا ہے، پانی میں شرابور ہے اور ___ ماتھے سے خون نچڑ رہا ہے۔

"آؤ سلجوق" میں نے سلجوق کا ہاتھ پکڑا اور لاپرواہ ہو کر اندھا دُھند اُوپر چڑھنا شروع کر دیا۔ پھسلتے، گرتے، جھاڑیوں سے اُلجھتے کئی مرتبہ انہی قدموں پر کئی فٹ واپس کھسکتے ہم بالآخر آئی بی کے پاس جا پہنچے۔

"کیا ہوا؟"

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں باس ___" وہ اپنا ہاتھ سامنے لا کر بولا ___ ہتھیلی کے درمیان میں ایک گہرا گھاؤ تھا اور اُس میں سے متواتر رِستا خون اُس چھوٹی قُل میں گر رہا تھا۔ جس کے کنارے پر کھڑا وہ ٹھٹھر رہا تھا۔" یہ سالا قُل نہیں ہے ___ اُدھر جب ہم آپ کو اُوپر بلا رہا تھا تو پاؤں پھسل گیا ناں اور ہم سالا قُل کے اندر ___ پانی بہت تیز تھا، ساتھ لے گیا، ایک چھوٹی سی غار میں سے بہتا ہوا اُدھر آنکلا ___ اِدھر آگے میرا ہاتھ جھاڑی کو پڑ گیا تو نکل آیا ___ کچھ نہیں ہے باس

آپ فکر نہ کرو۔۔۔۔۔"

"میں تو فکر نہیں کر رہا تم اپنے ماتھے کی فکر کرو وہاں بھی ایک گہرا زخم ہے۔"
آئی بی کا ہاتھ ماتھے تک گیا اور اُسے چھوتے ہی تکلیف کی شدت سے اُس کا بدن دوہرا ہو گیا۔ "کچھ نہیں۔ معمولی زخم ہے باس۔۔۔ ہم ہُنزہ کے لوگ تو۔۔" وہ اپنے آپ کو سخت جان ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا۔ ہمارے اصرار کرنے پر اُس اپنے زخموں کو دھویا اور پھر اپنی بنیان کو پھاڑ کر اُن پر پٹیاں کس دیں۔
"میرا خیال ہے واپس چلیں۔"
"کیوں باس؟"
"تمہارا چیک اپ کروانے کے لئے ہسپتال میں۔۔۔۔"
"نہیں باس۔۔۔" وہ تکلیف کی شدت کو دباتے ہوئے مسکرایا۔ "یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا، آؤ چلو۔" ہم قُل کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ کچھ فاصلے پر ایک پن چکی تھی جہاں ہم رُکے اور آئی بی کے زخموں کا خصوصی مطالعہ کیا۔ اس کا ماتھا سُوج رہا تھا اور اُس پر بندھی پٹی پر سرخی پھیل رہی تھی۔ آنکھ کے نیچے بھی ایک گہرا گھاؤ تھا جسے بند کرنے کے لئے سلجوق نے تھیلے میں سے چپکنے والا پلاسٹر نکال کر آئی بی کو دیا۔۔۔۔ قُل میں بہتے ہوئے آئی بی کا بے اختیار جسم پتھروں سے ٹکراتا رہا تھا۔۔۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اگر آئی بی اُس مقام پر ہاتھ بڑھا کر جھاڑی کو نہ پکڑ لیتا تو آگے ایک طویل اور تنگ سرنگ تھی جس کے اندر جا کر دوسری جانب سے آئی بی کا کُرتہ اور جین ہی باہر آتے اور کہتے "ہیلو باس۔۔۔ باس تو اندر ہی رہ گیا"

اب پھر عمودی چڑھائی تھی اور ہم بار بار آئی بی کی خیریت دریافت کرتے اُسے سہارا دینے کی کوشش کر رہے تھے لیکن وہ اب بھی بظاہر لاپروائی کا اظہار کر رہا

تھا۔ راستہ بلند ہوتا چلا گیا اور کئی مقامات پر ہمیں چٹان کے ساتھ لگ کر اُس میں انگلیاں پھنسا پھنسا کر آہستہ آہستہ رینگنا پڑا ــــــ ایک بڑی امّاں خاصی دیر سے ہمارے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھیں اور چلی ہی آ رہی تھیں۔ کئی مرتبہ سانس دُرست کرنے کے لئے رُکنے کا خیال آیا تو امّاں جی کو اطمینان سے پیچھے آتا دیکھ کر جی کڑا کر لیا کہ نہیں ابھی تو ہم جوان ہیں ــــــ ایک موڑ پر امّاں ایک دم ہمارے اُوپر آ دھمکیں ہمیں چٹان کے ساتھ دھکیلا اور چابی کی گڑیا کی طرح ننھے تُلے قدم رکھتیں ہم سے کہیں آگے نکل گئیں۔

بالآخر ہم اُس مقام پر آ نکلے جہاں سے پچھلی شب تاریکی کی وجہ سے واپسی ہو گئی تھی۔ نیچے اُلتر کا درّہ تھا جس کے درمیان میں اُلتر نالہ پُرشور کروٹیں بدلتا بہتا آ رہا تھا۔

"کیوں بابو میں نہ کہتا تھا کہ قلعے کے ساتھ یہ راستہ پورے بلتت کے گرد گھوم کر درّے کے پاس آ نکلے گا" آئی بی بے حد خوش تھا"

ہم اپنے سروں کو نوکیلی چٹانوں سے بچاتے، قدموں کو کھائی کی طرف کھسکنے سے روکتے آہستہ آہستہ نیچے اُترے اور ہمارے گرد ہیبت ناک چٹانیں اور پانی کا شور بلند ہو گیا۔ تیز یخ بستہ ہوا اُلتر گلیشیئر کے تنگ درّے کی نیم تاریکی میں پُرہول طریقے سے گونج رہی تھی۔ یہاں اُلتر نالے کے پانی پتھروں اور چھوٹی چھوٹی چٹانوں کی وجہ سے شاخوں میں بٹے ہوئے تھے اور اُنہیں باآسانی پھلانگا جا سکتا تھا۔ ہمارے آس پاس اور اُوپر جھکی ہوئی ننگی چٹانیں اتنی بلند تھیں کہ ہم اُن کے مقابلے میں للی پٹین لگ رہے تھے، حقیر اور بے مصرف بونے ــــــ درّے میں سے گذرتی ہوا اور گونج کا دباؤ اس قدر شدید تھا کہ ہم بالکل سیدھے نہیں کھڑے ہو سکتے تھے بلکہ قدرے جھکنا پڑتا تھا۔ انسان کا بس چلتا ہے تو فطرت

کو جھکا دیتا ہے لیکن یہاں فطرت کا بس چل رہا تھا۔ اُوپر دیکھنے سے بھی خوف محسوس ہوتا تھا کیونکہ آسمان کہیں بہت دور تھا اور سیاہ چٹانوں کا حجم بہت قریب، عین ہمارے سروں پر ٹھہرا ہوا۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے اُلتر نالے کا پانی رنگ بدلنے لگا، وہ مٹیالا ہو گیا —— آئی بی کا سفید چہرہ بھی جیسے مٹیالا ہو گیا۔"

باس اُوپر کچھ گڑبڑ ہوئی ہے —— نالے کے پانی میں قُل کا پانی ملا ہوا ہے۔"

"کیا گڑبڑ ہو سکتی ہے؟" میں نے اُس تنگ گھاٹی کی جانب دیکھا جدھر اُلتر گلیشیئر تھا اور جہاں سے یہ نالہ درّے میں اُتر رہا تھا۔

"پتہ نہیں —— لیکن کچھ گڑبڑ ہوئی ہے۔"

"ابو یہاں سے چلیں۔" سلجوق درّے کی پُرشور ہیبت سے سہما ہوا تھا۔

"باس ابھی نہیں" آئی بی نے اپنی زخمی ہتھیلی پھیلا کر کہا۔ "ابھی ہم اِدھر سے تم کو گارنیٹ ڈھونڈھ کر دے گا ——"

"یاقوت ——" سلجوق کی مسرت درّے کی ہیبت پر غالب آئی۔

آئی بی —— اِدھر ملتے ہیں؟"

"ہاں —— تم جھکو —— اِن پتھروں کو غور سے دیکھو —— ان میں ملیں گے۔"

ہم تینوں درّے کے سیاہ خوف اور برفیلی ہوا کے شور کو بھول کر سندباد جہازی کے کسی جزیرے میں اُتر کر قیمتی پتھر تلاش کرنے لگے۔ عجیب اور پُرحیرت رنگوں اور نقشوں کے پتھر تھے اور اُن کے عجائب اور حیرت اور نقشے ہمارے چہروں پر عکس ہو رہے تھے —— ہم بے حد متجسس اور ایکسائٹڈ تھے چھوٹے بچوں کی طرح جو خزانے کی تلاش میں مگن ہوتے ہیں اور چھوٹا بچہ تو نہ جانے کیا محسوس کر رہا تھا۔ جس پتھر پہ جُھکتے اُس میں یاقوت جگمگاتے ہوئے

دکھائی دیتے، اُسے اُٹھا کر آئی بی کے سامنے پیش کیا جاتا تو وہ سر ہلاتا "نہیں باس یہ عام قسم کا پتھر ہے ——— اِس میں مائیکا کے ذرّے ہیں اس لئے چمکتا ہے"۔ بالآخر سلجوق نے پتھر کا ایک ایسا ٹکڑا اُٹھایا جس میں یاقوت کے چھوٹے چھوٹے بے شمار ٹکڑے تھے ——— وہ اُس میں سے علیحدہ نہیں کئے جا سکتے تھے، بس جڑے ہوئے تھے ——— پھر مزید پتھر ملے اور سلجوق کا تھیلا بھاری ہونے لگا ——— پتھروں پر جھکے جھکے خاصی دیر ہو گئی اور جب انہیں دیکھنے کے لئے پاؤں تک جھکنا پڑا تو احساس ہوا کہ تاریکی بڑھ گئی ہے۔

ہم پتھروں کی دولت سمیٹ رہے تھے کہ اُلتر گلیشیر کی جانب چٹانوں پر حرکت ہوئی ——— کچھ لوگ نیچے آ رہے تھے ——— ہم اُن کا انتظار کرنے لگے ——— دو جرمن سیاح ایک موٹا درمیانی عمر کا چیک شرٹ اور جین پہنے ہوئے اور دوسرا یونانی مجسموں ایسے نازک اور ترشے ہوئے خدوخال والا نوجوان جو بلند قامت ہونے کے باوجود بچپنے کا بھولپن اور معصومیت چہرے پر لئے ہوئے تھا۔ اُن کے ہمراہ ہنزہ کا ایک نوجوان گائڈ تھا۔ قریب آتے ہی جرمن اور گائیڈ بیک زبان بولنے لگے۔ پھر جرمن چُپ ہو گیا اور اُن کے گائیڈ نے ہمیں بتایا کہ آج صبح وہ اِن سیاحوں کو لے کر اُلتر گلیشیر کو گیا تھا۔ واپسی پر اُن کے سر کے عین اُوپر چٹان میں جو قُل چل رہی تھی وہ بیٹھ گئی اور اُس کے پتھر اُن پر گرنے لگے۔ قُل کا پانی بھی ایک آبشار کی صورت تیزی سے نیچے آیا اور وہ بمشکل اپنی جان بچا کر وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ قُل کی صفائی کی جا رہی تھی اور اُس وقت اُس کے اندر کچھ لوگ کام کر رہے تھے۔ اُن کے بارے میں کچھ پتہ نہ تھا کہ وہ بچ گئے یا پتھروں کے ساتھ نیچے گر گئے ——— جرمن جس کا نام ہانز تھا ابھی تک سراسیمہ تھا اور بار بار کہتا تھا کہ تم یقین نہیں کر سکتے کہ ہم کیسے زندہ بچے ——— بہت

ہی خطرناک ——چند چھوٹے پتھر مجھے بھی لگے لیکن میں بچ گیا —— اُدھر نہیں جانا چاہیئے —— اِدھر اس درّے میں وارننگ بورڈ ہونا چاہیئے کہ اُلترکا راستہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ کوئی نہیں بتاتا اور ہم ایسے ہی چلے گئے —— میرا بچہ میرے ساتھ تھا۔ تھینک گاڈ کہ ہم بچ گئے —— اور بچہ بالکل نہیں بول رہا تھا، سہما ہوا کھڑا تھا اور اُس کے رخسار سُرخ ہو رہے تھے —— وہ جلد از جلد ہوٹل پہنچ کر اپنی خراشوں پر دوائی لگانا چاہتے تھے اس لئے بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔

"بہت اچھا ہوا بابا کہ ہم نہیں گئے" آئی بی اُس جرمن سے بھی زیادہ سراسیمہ تھا" قُل کے گرنے کی وجہ سے اُلترنالے کا رنگ بدلا تھا —— اُس میں قُل کا پانی گرا تھا"

"اُدھر کونسی قُل ہے؟"

"یہی جو ہمارے سر کے عین اوپر چٹانوں میں سے گذر کر بلتت جاری ہے"

اُوپر نیم تاریکی میں چٹان کے ساتھ ایک ہلکی سی لکیر پلٹی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ ظاہر ہے اگر اس میں شگاف پڑ جائے تو یہ ساری کی ساری درّے میں آن گرے گی۔

"واپس چلتے ہیں ——"

ہم نے اپنے پتھر سمیٹے اور اُلترنالے کے مٹیالے پانیوں کو عبور کر کے اُس راستے پر آ گئے جو بلتت کو جا رہا تھا۔ یہاں سے وہ پوری چٹان بھی نظر آ رہی تھی جس پر بلتت کا قلعہ ہنوز قائم تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم سیبوں کے اُس باغ تک پہنچ چکے تھے جہاں سے قصبے کا آغاز ہوتا تھا۔ پن چکی کے ساتھ ڈرائنگ روم تھا اور ہمارے وہاں پہنچنے سے پیشتر قُل کے گرنے کی خبر وہاں پہنچ

چکی تھی۔ اُس میں کام کرنے والوں کی مدد کے لیئے درجنوں نوجوان اُدھر جا چکے تھے اور اب بڑے بوڑھے کسی خبر کے منتظر تھے ـــــ سبھی چپ تھے، کوئی بولتا نہ تھا۔ آئی بی اور ہم دونوں اُن کے ہمراہ پتھروں پر بیٹھ گئے اور انتظار کرنے لگے۔ اُن سب کے چہروں پر دکھ اور تشویش برابر کی تھی۔ یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ کس کا بیٹا یا کس کا بھائی اِس سانحے کا شکار ہوا ہے ـــــ سب کے سب مغموم تھے اور انتظار کر رہے تھے ـــــ اور ہم دونوں خوفزدہ تو تھے لیکن اُن کی شدت سے اُن کا دُکھ محسوس نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ہم باہر کے لوگ تھے، صرف تماشائی دیکھنے والے اس لیئے تھوڑی دیر بعد میں نے آئی بی سے اجازت چاہی اور ہم ڈرائنگ روم سے نکل کر نیچے اُترنے لگے۔

"ہنزہ اِن" کے برآمدے میں وارث صاحب نے جاپانی کو گھیر رکھا تھا اور اُسے سکھوں کے لطیفے سنانے کی کوشش کر رہے تھے اور جاپانی سر ہلاتا ہوا مسکرائے چلا جا رہا تھا۔

"آؤ جی چوہدری صاحب ـــــ یہ جو جاپانی ہوتے ہیں ناں یہ پنجابی سمجھتے ہیں ـــــ آہو ـــــ لو جی میں جو بھی لطیفہ سناتا ہوں یہ ہنستا ہے ـــــ ہاں ہاں بیشک ٹرائی کر لو ـــــ میرا خیال ہے جاپانی اور پنجابی ملتی جلتی ہے ـــــ ملتی جُلتی ہے؟"

"پتہ نہیں"

"آج کدھر کی سیریں ہوئیں؟"

میں نے بتایا اور پھر پوچھا کہ آپ کونسے پہاڑ پر چڑھ کر آئے ہیں تو کہنے لگے۔

"بس جی بڈھی کو شوق تھا، پر ہوٹل سے نکلتے ہی اُس کی گرگابی کی ایڑھی پھر ٹوٹ گئی ـــــ تو پھر ہم اُوپر کہیں جانے کی بجائے اُدھر نیچے چلے گئے دریائے ہنزہ کے کنارے ـــــ لو جی یہاں سے تو یہ چھوٹی سی نالی ہی لگتا ہے ناں ـــــ پر جی قریب

جا کر دیکھو تو بہت بڑا دریا ہے ـــــ اوئے ہوئے کوئی پانی ہے، کوئی خطرہ ہے آپ گئے ہوئے اِس کے نزدیک ـــــ اچھا ـــــ ویسے بڑا لطف آیا صحیح معنوں میں ـــــ پر یہاں سے تو پتہ نہیں چلتا ـــــ اوئے ہوئے کوئی دریا ہے ـــــ" خوش قسمتی سے اُس وقت ان کے کمرے میں سے کچھ احکام باہر آئے اور وہ اندر چلے گئے۔

جاپانی اُسی طرح بیٹھا رہا۔ اُس کی مسکراہٹ ختم ہوگئی ـــــ میں نے اشاروں کنایوں سے پوچھا کہ تمہارے دوست کا کیا ہوا ـــــ اُس نے انگریزی کے چند ٹوٹے پھوٹے لفظوں کی مدد سے اور ہاتھ اور سر ہلا ہلا کر بتایا کہ وہ اُسے آج صبح ایک جیپ پر ڈال کر گلگت لے گیا تھا ـــــ وہاں فوجی ہسپتال میں داخل ہے، نیم بیہوش ہے، ڈاکٹر کہتا ہے کہ شاید ٹھیک ہو جائے لیکن پتہ نہیں ـــــ میں نے پوچھا ـــــ تم؟ ـــــ واپس کیوں آگئے؟ کہنے لگا، جیپ پر صرف ایک موٹر سائیکل رکھا جا سکتا تھا۔ میں دوسرے پر بیٹھ کر اُسے بھی گلگت لے جانے کے لئے آیا ہوں ـــــ ہمارا ٹور بہت بدقسمت رہا۔ کلکتہ تک ہم دونوں ساتھی بحری جہاز پر آئے۔ وہاں سے دہلی تک موٹر سائیکلوں پر۔ اُس کے بعد ہم پاکستان آنا چاہتے تھے۔ لیکن مشرقی پنجاب میں حالات اتنے خراب تھے کہ بائی روڈ سفر کرنے کی اجازت نہ ملی چنانچہ موٹر سائیکلوں کو ہوائی جہاز میں رکھا اور کراچی چلے گئے۔ کراچی سے لاہور، اسلام آباد، گلگت اور ہنزہ تک آئے تھے کہ ساتھی بیمار ہو گیا۔ یہاں سے ہم خنجراب جانا چاہتے تھے۔ میرا ساتھی پیشے کے لحاظ سے مکینک ہے اور میں سکول میں پڑھاتا ہوں۔ موٹر سائیکل یاماہا کمپنی نے تحفے کے طور پر دیے تھے اور سفر کے بقیہ اخراجات ہم خود برداشت کر رہے ہیں ـــــ لیکن اب وہ بیمار پڑ گیا ہے اور مجھے بہت فکر ہے، ہم کیا کریں گے ـــــ

سلجوق اُس سے جاپان کے بارے میں پوچھتا رہا —— کاریں، کیمرے، روباٹ کمپیوٹر ——

اُس نے سلجوق سے دریافت کیا، کونسی جماعت میں پڑھتے ہو؟

سلجوق نے بتایا کہ آٹھویں جماعت میں اِس پر جاپانی کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں اور جاپانیوں کی آنکھیں یوں بھی صرف حیرت سے ہی کھلتی ہیں ورنہ بند ہی لگتی ہیں "—— آٹھویں جماعت —— بس —— اتنا لمبا لڑکا اور صرف آٹھویں جماعت میں پڑھتا ہے —— کیا فیل ہوتا رہا ہے؟"

میں نے اُسے بتایا کہ بھائی ہمارے ہاں آٹھویں جماعت میں پڑھنے والے بچے عام طور پر اِسی قد کے ہوتے ہیں۔ خواہ مخواہ نظر نہ لگا دینا —— پاکستانی بچہ ہے جاپانی بچہ نہیں ہے —— لیکن وہ کافر جاپانی سلجوق کے قد کو بار بار دیکھتا تھا اور بار بار کہتا تھا —— صرف آٹھویں جماعت —— او ہو —— او ہو —— اتنا لمبا۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں اور سلجوق اندر کمرے میں جانے کی بجائے برآمدے میں ہی بیٹھے رہے اور قلِ میں ہونے والے حادثے کے بارے میں قیاس آرائیاں کرتے رہے —— جاپانی ہم سے پرے میز پر کہنیاں ٹکائے چپ چاپ راکاپوشی کی جانب دیکھ رہا تھا —— لالٹین کی روشنی اُس کے چہرے پر پھیلتی تھی اور شائد اُس کی مہین آنکھوں میں نمی کا شائبہ تھا —— وہ شائد اپنے گھر کے بارے میں سوچ رہا تھا، اپنے ساتھی کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اس وقت گلگت کے فوجی ہسپتال میں اکیلا پڑا اُکھڑی اُکھڑی سانسیں لے رہا تھا —— جہاں وہ —— بے زبان پڑا تھا کیونکہ وہاں اُس کی زبان کون سمجھتا تھا —— ہم اس جاپانی کا دکھ بھی نہیں بانٹ سکتے تھے۔ وہ ایک جزیرہ تھا سب سے کٹا ہوا —— مجھے اُس پر بڑا ترس آیا لیکن میں کیا کر سکتا تھا، خانہ بدوشی اور سیاحت کی قیمت



کبھی نہ کبھی ادا کرنا پڑتی ہے ــــ گھر سے دور ہنزہ کی اس دنیا جہان سے الگ تھلگ بلند وادی میں ــــ کہیں نہ کہیں ادا کرنا پڑتی ہے ــــ اُس کی میز پر رکھی لالٹین ہمارے کمرے کی تھی مگر میں اُسے اُس کے سامنے سے اُٹھانا نہیں چاہتا تھا، شاید یہ واحد روشنی تھی جو اُس کے سامنے تھی ــــ میں نے سلجوق کو اشارہ کیا اور ہم اُٹھ کھڑے ہوئے ــــ آہٹ سُن کر اُس نے ہماری طرف دیکھا اور مسکرانے لگا۔ اُس نے لالٹین اُٹھائی اور ہمارے پاس آگیا۔ کمر تک جُھک جُھک کر شکریہ ادا کیا اور لالٹین ہمارے حوالے کر دی۔ ہم کمرے میں آگئے ــــ وہ وہیں بیٹھا رہا، تاریکی میں، راکاپوشی پر نظریں جمائے ــــ جانے اُس کے دل میں کیا تھا ــــ شاید یہ کہ اُس کا ساتھی اس وقت گلگت کے ہسپتال میں آخری سانس لے رہا ہے اور وہاں اُس کی زبان کوئی نہیں سمجھتا ــــ



آئیے علتت چلیں ... اور غشپ پرندے

"پھر صاحب ؟ کل صبح جیپ لے آؤں ؟"

"نہیں بھائی کرایہ بہت زیادہ ہے"

"تیرہ سو روپے زیادہ ہے ؟"

"بہت زیادہ ــــ اتنی رقم میں تو بنکاک کا ٹکٹ مل جاتا ہے"

"صاحب آپ دونوں ہوں گے۔ باقی راستے میں جو سواری بٹھائیں گے اُس کا رقم آپ رکھنا ــــ یہاں سے پھسو، سُوست اور خُن جراب ــــ ایک گھنٹہ خُن جراب میں اور پھر واپس ــــ تیرہ سو روپے زیادہ ہیں ؟"

"چھوڑیں ابّو ہم پھسو تک تو ہو آئے ہیں وہاں سے چینی سرحد پر واقع خنجراب تو صرف چند کلو میٹر کے فاصلے پر تھا ــــ ویسے میرا جی چاہتا ہے دیکھنے کو ــــ"

خنجراب ہمارے پروگرام میں شامل تھا۔ گلگت میں کوشش کی تو دو ہزار روپے ــــ پھسو میں ہم بالکل قریب تھے لیکن وہاں پھنس جانے کے خوف سے ہراساں ہوئے اور اُدھر کی بجائے اِدھر چلے آئے۔ اب پچھلے دو تین روز

سے ہم کسی ایسے جیپ والے کی تلاش میں تھے جو ہمیں اس بلند اور برفپوش درّے تک لے جائے اور واپس بھی لے آئے ــــ ایسا جیپ والا تو مل گیا لیکن کرائے کے بارے میں ہمارے نظریات نہیں مل رہے تھے۔

"ہیلو ــــ ہیلو" ہل ٹاپ ہوٹل کی گھاٹی سے چیک شرٹ والا موٹا جرمن سیاح اُترتا آرہا تھا۔

"ہیلو" سلجوق نے ہاتھ ہلایا۔

اُس نے قریب آکر ہم دونوں کو بڑے غور سے دیکھا پھر جیپ اور اُس کے ڈرائیور کو مزید غور سے دیکھا اور میرا بازو پکڑ کر ایک طرف لے جاتے ہوئے بولا "اِس جیپ والے سے کیا گفتگو کر رہے تھے؟"

میں نے بتایا کہ خنجراب کے لئے گفت و شنید ہو رہی تھی۔

"آہم ــــ" اُس نے عینک کے اُوپر سے جیپ کو دیکھا جہاں سلجوق ابھی تک مذکرات میں مصروف تھا "اس جیپ پر ــــ نہیں نہیں ــــ اِس پر مت بیٹھنا ــــ میں آج صبح یہاں سے گذرا تو یہ انجن کھولے بیٹھا تھا اور میرے سامنے اِس نے پرزوں کو دھاگے سے باندھ کر دوبارہ فِٹ کیا تھا ــــ نونو"

"آہنی تار ہوگی دھاگے سے بھی کہیں پرزے جوڑے جا سکتے ہیں؟"

"بالکل ــــ میں قسم کھاتا ہوں میں نے خود دیکھا تھا اپنی آنکھوں سے ــــ دھاگے سے باندھ کر فٹنگ کر رہا تھا ــــ"

میں نے فوراً سلجوق کو اپنے پاس بلا لیا۔

"اور آپ کا بیٹا کہاں ہے؟"

"وہ ــــ ہو ہو ــــ بُرا معدہ اور بخار ــــ اور کل کا خوفناک تجربہ ــــ اوہ مائی گاڈ تم کو وہ بڑے بڑے پتھر دیکھنے چاہئیے تھے جو ہم پر گر رہے تھے ــــ

اُف اُف ــــ وہ اب بستر میں لیٹا ہے ــــ اور آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟"

"علتت"

"اور وہ کہاں ہے؟"

"ہل ٹاپ کے سامنے دیوار میں جو بڑا چوبی پھاٹک ہے وہاں سے علتت کو راستہ جاتا ہے ــــ ساڑھے چھ کلومیٹر ــــ"

"دلچسپ جگہ ہے؟"

"پتہ نہیں ــــ جا کر دیکھیں گے۔ وہاں بھی ایک قلعہ ہے"

"گُڈ فورٹ؟"

"پتہ نہیں ــــ"

"ہوں ــــ" اس نے ٹھوڑھی کھجائی "ــــ دیکھو اگر تمہیں ناگوار نہ گزرے تو ــــ اور تم انکار بھی کر سکتے ہو میں بھی اُدھر آپ کے ساتھ چلا چلوں ــــ مجھے آج کوئی کام نہیں۔ بیٹا بیمار اور بیوی ــــ اُف بوڑھی بیوی ہنزہ میں بھی بوڑھی ہی رہتی ہے اس کا تم کیا کرو گے ــــ ہا ہا ــــ آپ انکار کر سکتے ہیں مجھے ساتھ لے جانے کے لئے ــــ میرا نام ہانز ہے"

"مسٹر ہانز آئیے علتت چلیں" میں نے اُس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام کر کہا "مجھے مستنصر کہتے ہیں"

"معاف کیجئے گا میں سمجھ نہیں سکا"

"مُسٹ آنسر"

"آ ــــ انگریزی نام ــــ گڈ گڈ ــــ اور آپ کا بیٹا؟"

"سلجوق"

"آ ــــ یہ نام جرمن لگتا ہے ــــ میرے پاس کچھ بسکٹ ہیں کھائیے گا؟"

ہم مسٹر ہانز کے بسکٹ چباتے چلنے لگے۔

"آپ کو شاید سردی بہت لگتی ہے، تبھی یہ پھندنے والی ٹوپی پہن رکھی ہے؟"

اُس نے مجھ سے پوچھا۔

"مجھے زکام ہے اور شاید بخار بھی۔"

"اوہ —— پھر تو تمہیں ریسٹ کرنا چاہیئے —— میرے پاس اسپرین بھی ہے ضرورت پڑنے پر مانگ لینا"

"ہنزہ کیسا ہے؟"

"ونڈرفل —— لیکن اِس کو سیاح تباہ کر رہے ہیں۔ ہنزہ ختم ہو جائے گا۔ اتنے زیادہ ٹورسٹ آتے رہے تو لوگ اپنا روائتی کام کاج چھوڑ کر اُن کے پیچھے لگ جائیں گے —— اور پھر ہم جیسے ٹورسٹ تو ٹھیک ہیں لیکن تم نے فرانسیسی سیاحوں کا وہ گروپ دیکھا تھا، مرد نیکروں میں گھوم رہے تھے، انہیں مقامی رواج کا احترام کرنا چاہیئے —— اور اُن کی عورتیں —— بائی گاڈ اُن کی عورتیں —— اُن کے لباس دیکھے تھے؟ —— ہا —— بلاؤز اور —— او ہو شرمناک —— بالکل —— وہ یہاں کا اخلاق تباہ کر دیں گی —— فرانسیسی ہوتے ہی ایسے ہیں۔"

مسٹر ہانز جرمن فرانسیسی دشمنی کو ہنزہ تک لے آئے تھے۔

چوبی پھاٹک سے ایک ڈھلوان سڑک نیچے اُلترنالے تک جاتی تھی بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ گرتی تھی —— سلجوق مسٹر ہانز پر اپنی انگریزی آزمانے لگا اور اُنہیں اپنی زباندانی سے خاصا متاثر کیا۔

"تم کو جرمن سیکھنی چاہیئے مسٹر سَل جُق —— انگریزی سے زیادہ سویٹ زبان ہے —— ایک اور بسکٹ؟"

اُلترنالے کے پانی کا رنگ اب نارمل ہو چکا تھا۔ ہم اس پر ایستادہ لکڑی کے

پرانے پُل پر سے گذر کر دوسری جانب چلے گئے۔ ایک بوڑھا پتھر کی دیوار سے ٹیک لگائے سستا رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اُٹھا ——— "اسلام وعلیکم"، ہاتھ ملایا اور پھر بیٹھ گیا۔

"آرام ہو رہا ہے بابا جی" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ چار گھنٹے پتھر اُٹھاتا ہوں اور پھر ایک گھنٹہ آرام کرتا ہوں"

"کونسے پتھر؟"

"یہ جو میرے پاس پڑے ہیں" وہ پتھر بلا مبالغہ تیس تیس کلو کے تو ہوں گے۔ میں نے ہانز کو بتایا کہ یہ اولڈ مین یہ پتھر اُٹھاتا ہے۔

"ناممکن"۔ ہانز نے سر ہلایا "یہ اولڈ مین بہت زیادہ اولڈ ہے"

میں نے بوڑھے کو بتایا کہ یہ انگریز کہتا ہے کہ تم یہ پتھر نہیں اُٹھا سکتے۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھا، ایک پتھر کو اُٹھا کر اِس طرح گود میں لیا جیسے چوزہ ہو اور اُسے دیوار کے اُوپر رکھ دیا ——— پھر دوسرا ——— پھر تیسرا ——— ہانز کا منہ کھُل گیا "مائی گاڈ ——— اِس سے پوچھو کہ اس کی عمر کیا ہے؟"

میں نے پوچھا۔

"بیاسی سال ——— بیاسی ———"

"ہی اِز ایٹی ٹو"

"مائی گاڈ ——— میرے والد صاحب کی عمر کا ہے ——— اوہو بیاسی سال ——— اچھا اِس سے پوچھو کہ یہ اس عمر میں بھی ——— کچھ کر سکتا ہے ——— میرا مطلب ہے اپنی بیوی ——— خیر چھوڑو ہمارے ساتھ بچہ ہے"

"صاحب خدا نے ہمیں یہ زمین دیا کہ ہم اس پر محنت کریں۔ اس سے فائدہ اُٹھائیں ———" بوڑھا کہنے لگا "میں دس برس کا تھا جب میں نے دیوار بنانے کیلئے

پتھر اُٹھایا ___ پہلے آرام نہیں کرتا تھا اب چار گھنٹے کے بعد ایک گھنٹہ آرام کرنا پڑتا ہے ___" وہ چہرے سے اتنا صحت مند یا خوشحال نہیں لگتا تھا۔ جھریوں کا گرداب اُس کی بے جان سی آنکھیں ڈھکنے کو تھا۔ ہم نے ایک مرتبہ پھر اُس سے ہاتھ ملایا اور آگے چل دیئے۔

ہانز لمبے لمبے سانس کھینچتا، اپنے پیٹ کو تھپکتا بڑبڑاتا ہوا چلتا جا رہا تھا۔

"اوہ اٹ از گڈ ٹو بی ان ہنزہ" وہ یقیناً ہائی سپرٹس میں تھا۔

"مسٹر ہانز آپ کو ہنزہ میں کیا پسند آیا؟" سلجوق نے امریکی لہجے میں منہ ٹیڑھا کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہر چیز مائی بوائے ___ ہر چیز" وہ کھڑا ہو گیا۔" لوگ ___ محنتی اور ایماندار یو سی نو بیگرز ___ یہاں فقیر نہیں ہیں جو آپ کو دن رات پریشان کریں ___ وہ خود اپنے ہاتھ سے کماتے ہیں اور میں یہ چیز پسند کرتا ہوں ___ ہاں" اُس نے اپنی مُٹھی بھینچی "مرد کو دوسروں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلانا چاہیے ___ اور ہمارے گروپ کے کچھ سیاح شکائت کر رہے تھے کہ یہاں اچھی خوراک نہیں ملتی ___ باہ ___ وہ احمق ہیں ___ یقیناً یہاں جرمن اور امریکن خوراک نہیں ملتی ___ لیکن دیکھو یہاں تازہ سبزیاں ملتی ہیں ___ وہ ہمارے سامنے انہیں توڑتے ہیں اور پکاتے ہیں۔ تازہ پھل ملتا ہے تمہیں اور بہت سستا ___ اور کیا چاہیئے تمہیں؟ ___ مجھے بتاؤ اگر انسان کو تازہ سبزیاں اور پھل کھانے کو ملیں تو اور کیا چاہیئے۔ گوشت تو ہم جرمنی میں بھی بہت کھاتے ہیں ___ یہ بیوقوف لوگ ڈبوں میں بند خوراکوں کے عادی ہو چکے ہیں، اس لئے تازہ سبزیاں ___"

"مسٹر ہانز علتت ابھی کافی دُور ہے اگر ہم یہاں کھڑے رہے تو ___"

"ہا ___" اُس نے کندھے جھٹکے "ہمیں چلنا چاہیئے ___ ایک اور بسکٹ؟"

"نو تھینک یُو"

"نہیں ضرور لو ـــــ یہ عام بسکٹ نہیں ہیں بلکہ خاص طور پر بلندیوں کے لئے بنائے گئے ہیں۔ اِن سے پیٹ ٹھیک رہتا ہے ـــــ"

میں نے ایک اور بسکٹ لے لیا ـــــ

یہاں برفوں کی آخری حد پر رکا ہوا وہ خوبصورت جماعت خانہ عین ہمارے سروں کے اُوپر تھا جسے ہم نے آئی پی کے ہمراہ بلتت کے گرد چکر لگاتے ہوئے دیکھا تھا۔ حسبِ معمول ایک سرسراتی کُل راستے کے ساتھ ساتھ بہہ رہی تھی اور اس میں سے نکلتی ہوئی شاخیں کھیتوں اور گھروں میں گر رہی تھیں۔

علتت سکول میں شائد ابھی چھٹی ہوئی تھی۔ صاف سفید بچیوں کا ایک غول کتابیں اُٹھائے ہماری جانب آرہا تھا۔ قریب آنے پر انہوں نے گہری توجہ سے میرا مطالعہ کیا اور کھلکھلا کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوتی گذر گئیں۔

"تم میں کیا شے ہے جس کی وجہ سے یہ لڑکیاں تمہیں دیکھ کر ہنسے چلی جا رہی تھیں؟" ہانز نے پوچھا۔

"میں ایک چھوٹا موٹا ٹیلی ویژن سٹار ہوں شائد انہوں نے مجھے پہچان لیا ہے"

"ہا" ہانز بے حد مرعوب ہوا۔

"ابو" سلجوق آہستہ سے بولا "یہاں ٹیلیویژن نہیں ہے۔ وہ دراصل آپ کی پُھندنے والی ٹوپی دیکھ کر ہنس رہی تھیں، آپ کچھ عجیب سے لگ رہے ہیں ـــــ"

میں نے ہانز کو یہ اطلاع دینا مناسب نہ سمجھا، خوامخواہ بنا بنایا امیج خراب ہوجاتا۔

علتت کا آغاز پولو گراؤنڈ سے ہوا جو ویران پڑی تھی۔ دائیں ہاتھ پر پہاڑی کے دامن

میں ایک باغ تھا اور اُس باغ میں میں نے دو پرندے دیکھے، لمبی دُموں والے جو موروں کی طرح چہل قدمی کر رہے تھے ـــــ میں رُک گیا۔

"کیا تم تھک گئے ہو؟" ہانز نے پیچھے مُڑ کر دیکھا۔

"اس باغ میں عجیب و غریب پرندے ہیں ـــــ" میں نے دوبارہ دیکھا تو وہ غائب ہو چکے تھے "ابھی تو تھے پتہ نہیں کہاں چلے گئے ہیں"

"آؤ چلو ـــــ میرا خیال ہے پرندے تمہیں نہیں پہچانیں گے کیونکہ وہ ٹیلیویژن نہیں دیکھتے ـــــ ہا ہا ہا ـــــ" ہانز نے خوش دلی سے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

چند قدم چلنے کے بعد ہانز رُک گیا۔ اُس کی نظریں باغ کے ایک تاریک کونے میں بھٹک رہی تھیں "تم درست کہتے تھے، میں نے بھی کچھ دیکھا ہے"

ہم تینوں وہاں کھڑے ہو کر باغ کو گھورنے لگے ـــــ تھوڑی دیر بعد ایک پرندہ نظر آیا ـــــ اُس نے زمین پر چونچ ماری اور پھر خوبصورت اور شاہانہ اُڑان کے ساتھ سیب کے درختوں میں غائب ہو گیا۔ اُس کی دُم اتنی طویل تھی کہ اصلی معلوم نہیں ہوتی تھی۔

"تم نے دیکھا؟" ہانز کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔

"ہاں میں نے دیکھا"

"جرمنی میں بھی ایسے پرندے ہوا کرتے تھے لیکن بہت عرصہ پہلے ـــــ میں نے اِس سے قبل اِسے صرف تصویروں میں دیکھا تھا ـــــ ہُنزہ کو پسند کرنے کی ایک اور وجہ ـــــ ہم جو کچھ کتابوں میں پڑھتے ہیں وہ سب کچھ ابھی ہنزہ میں زندہ ہے"

پولو گراؤنڈ کے اختتام پر چند دکانیں تھیں جن کے باہر نمک کے بڑے بڑے ڈھیلے رکھے ہوئے تھے۔

"کتنے خوبصورت پتھر ہیں ـــ" ہانز بے اختیار اُن کی جانب گیا۔ "مائی گاڈ تم ان کے آر پار دیکھ سکتے ہو ـــ اِس آدمی سے پوچھو کہ اِس پتھر کا نام کیا ہے؟"

"اِسے نمک کہتے ہیں مسٹر ہانز"

"سالٹ؟ ـــ نہیں ـــ واقعی؟" اُس نے اپنے مختصر کیمرے کو آنکھ سے لگا کر بٹن دبا دیا "ہنزہ یقیناً ایک طلسماتی وادی ہے جہاں نمک خوبصورت پتھروں کی صورت میں ملتا ہے"

میں نے مسٹر ہانز کو بتایا کہ یہ والا پتھر کیوڑہ سے لایا جاتا ہے جو پنجاب میں ہے اور ہنزہ میں نمک بالکل نہیں ہوتا۔

"ہا ـــ ہنزہ کو پسند کرنے کی ایک اور وجہ ـــ یہاں نمک بالکل نہیں ہوتا نمک تمہارے دل کے لئے اور بلڈ پریشر کے لئے بے حد نقصان دہ ہے ـــ ویسے مسٹ آنسر، زندگی میں تھوڑا بہت رومانس تو ہونا چاہیے ـــ میں جرمنی میں اپنے دوستوں کو یہی بتاؤں گا کہ خوبصورت رنگ کے یہ پتھر صرف ہنزہ کی پُراسرار وادی میں ہی ملتے ہیں اور اتنے شفاف ہوتے ہیں کہ انسان ان کے آرپار دیکھ سکتا ہے ـــ"

"ہاں اتنی سی غلط بیانی جائز ہے"

"لوگوں کو خوش کرنے کے لئے ہر چیز جائز ہے"

میں نے دکاندار سے جو ہانز کی حرکتوں پر مسکرا رہا تھا۔ بسکٹوں کا ایک ڈبہ خریدا کیونکہ ہم اس جرمن کا ذخیرہ تو ختم کر چکے تھے ـــ میں نے اُس سے قلعے کے بارے میں دریافت کیا۔

"صاحب سیدھے چلے جاؤ۔ پہلے جماعت خانہ آئے گا۔ پھر ایک چوک آئے گا۔ اور اُدھر قلعے کے نیچے ایک باغ ہے۔

اُس میں رکھوالا رہتا ہے، وہ آپ کو چابی دے دے گا۔"

"اِسے اُس پرندے کے بارے میں پوچھو جو سیب کے باغ میں پھُدک رہا تھا۔" ہانز نے جلدی سے کہا۔

"وہ ــــ وہ غشپ ہے صاحب ــــ" دکاندار نے بتایا "یہ کوّے کی نسل کا ہے، حرام ہے اس لئے ہم اِسے نہیں کھاتے، اِدھر بہت ہوتا ہے۔"

"نہیں کوّا نہیں ہو سکتا۔" ہانز سر ہلانے لگا۔" مائی گاڈ اتنا خوبصورت پرندہ کوّا کیسے ہو سکتا ہے ــــ اور اچھا ہے کہ لوگ اسے حرام سمجھ کر نہیں کھاتے ــــ اور کیا ہی اچھا ہو کہ دنیا کے سارے پرندے حرام ہو جائیں اور وہ ہمارے پاس چہچہاتے رہیں بجائے اس کے کہ ہم انہیں بھُون کر کھا جائیں اور دنیا میں نغمے ختم ہو جائیں ــــ اِس نے کیا کہا؟ ــــ غشپ ــــ نام بھی جرمن لگتا ہے۔"

علتت اپنے جڑواں قصبے بلتت کی نسبت پسماندہ دکھائی دے رہا تھا۔ ہنزہ کے بیشتر گھروں کی طرح پتھر اور گارے سے بنے ہوئے چوکور مکان جن میں صرف ایک روشندان نما کھڑکی ہوتی ہے۔ ایک گلی میں سے قلعے کا چوکور بُرج اور اُس پر ایستادہ مارخور کا مجسمہ دکھائی دیا ــــ آگے چل کر جماعت خانے کے پاس گاؤں کا چھوٹا سا بازار تھا، ایک جوہڑ تھا۔ جس میں بطخیں تیر رہی تھیں ــــ یہاں پر ایک طویل قامت اور خوش شکل غیر ملکی نوجوان مقامی باشندوں کے غول میں کھڑا اُن کی طرف دیکھ کر مُسکرا رہا تھا۔ اُس کے لامبے بالوں اور گھنی داڑھی میں سفید لکیریں تھیں، بھُوری جیکٹ، فُل بوٹس اور گلے میں سکارف باندھے وہ کسی کاؤبوائے فلم کا رَف ٹَف ہیرو لگتا تھا۔

"لُوسی ــــ" ہانز نے سلجوق پر جھکتے ہوئے کہا "جرمن کتنے خوش شکل ہوتے ہیں ــــ وہ سب میرے جیسے نہیں ہوتے"

"آپ کو کیسے پتہ ہے کہ یہ جرمن ہے؟
"ہاں ــــ ایک جرمن دس کلومیٹر دُور سے بھی پہچانا جاتا ہے ــــ" ہانز آگے بڑھا اور اپنے ہم وطن کے ساتھ ایک زبردست ہینڈ شیک کے بعد ہمیں پاس بُلا لیا۔

"یہ آخم ہے۔"
"میں اپنی بیوی کا انتظار کر رہا ہوں ــــ" وہ کہہ رہا تھا۔ "وہ ہنزہ کا ایک گھر دیکھنا چاہتی تھی۔ چنانچہ ہم نے اِن لوگوں سے پوچھا۔ یہ کہنے لگے کہ صرف تمہاری بیوی اندر جا سکتی ہے ــــ اب وہ بہت دیر سے اندر گئی ہوئی ہے۔" اُس نے اپنے بھورے اور سفید بالوں کو ہتھیلی سے تھپکا۔" مجھے اُمید ہے کہ وہ اندر کسی مصیبت میں گرفتار نہیں ہوگی۔"
"اگر ایسا ہوتا۔" ہانز مسکرایا" تو اُس کی چیخیں تم تک ضرور پہنچ جاتیں ــــ ویسے ہنزہ میں تمہاری دولت اور بیوی دونوں محفوظ ہیں ــــ بہت اچھے لوگ ہیں"

تھوڑی دیر بعد آخم کی اہلیہ محترمہ کسی پوشیدہ خاتون کا شکریہ ادا کرتیں ایک گھر کی چوکھٹ میں سے جھک کر باہر نکل آئیں۔
"اوہ اندر سے یہ بہت اچھے گھر ہیں آخم۔" اُس نے اپنے خاوند سے مخاطب ہو کر کہا اور پھر ہمیں ایک گرم جوش "ہیلو" سے نوازا ــــ بیگم آخم پہاڑی بوٹوں کے علاوہ ایک نیلی اور بہت ہی تنگ جین اور ایک سفید بہت ہی کھلے کُرتے میں تھیں اور بہت خوب تھیں۔ البتہ اُن کا چہرہ جوان ہونے کے باوجود پُرانے موسموں کی مار کھائے ہوئے چمڑے کی طرح بے جان اور سلوٹوں سے بھرپور تھا ــــ اطالوی میاں بیوی کی طرح ان دونوں کو بھی پہاڑوں اور بلندیوں کے عشق نے ڈسا ہوا تھا۔

دنیا میں جہاں بھی پہاڑ تھے اور بلند تھے وہ وہاں کبھی نہ کبھی ضرور تھے۔ جنوبی امریکہ کے کوہ اینڈنیر۔ یورپ کے الپس، افریقہ کے اٹلس پہاڑ اور کلی منجارد ۔۔۔ نیپال، ہندوستان اُن کے قدم مقام پر پہنچے تھے ۔۔۔ اُن کا خاص جنون گلیشیئر تھے اور دنیا کے بیشتر بڑے اور طویل گلیشیئر پاکستان کے شمالی علاقوں میں واقع ہیں۔ بالتورو اٹھاون کلومیٹر طویل ہے اور پولر علاقے سے باہر دنیا کا طویل ترین گلیشیئر ہے۔ بتورہ جو کریم آباد اور پھسو کے درمیان پڑتا ہے۔ ہیسپر گلیشیئر تو ہمارے ہوٹل کے برآمدے میں سے بھی نظر آتا تھا۔ نگر کے درّے سے جھانکتا ہوا یہ گلیشیئر جب درّہ ہیسپر میں بیافو گلیشیئر کے ساتھ جا ملتا ہے تو پولر علاقے کے علاوہ دنیا میں برف کا عظیم ترین اجتماع بن جاتا ہے ۔۔۔ سیاچین۔ چوگو منگ لا۔ گوندو کورو۔ بار پو خلخال۔ خوردپن۔ پسان۔ یازگل اور بے شمار ایسے گلیشیئر جن کے ابھی تک نقشے نہیں بنے اور وہ بے نام ہیں۔ منجمد دریاؤں کی اس سرزمین پر آخم اور اُس کی بیوی ہیسپر گلیشیئر کی وجہ سے آئے تھے ۔۔۔ اس گلیشیئر پر سفر کرنے کا تجربہ اتنا خوشگوار ثابت نہیں ہوا تھا کیونکہ راستے میں مقامی مزدوروں اور گائڈ نے انہیں بے حد تنگ کیا تھا، ایک مقام پر رات کے وقت اُن کے خیموں کے رسّے کاٹ دیئے گئے۔ وہ صرف ایک روز پیشتر نگر کے راستے ہنزہ پہنچے تھے اور پُر دشوار سفر کے باعث بے حد تھکے ہوئے تھے ۔۔۔ بیگم آخم کا چہرہ برفوں کی چمک اور تاب کار شعاعوں کی زد میں رہا تھا اور اسی لئے اُس کی جلد پر ہلکے بھورے چمڑے کا گمان ہوتا تھا۔

دونوں میاں بیوی ہماری طرح علتت کے قلعے کی طرف جا رہے تھے۔

ایک قُل کے کنارے لکڑی کے تختوں سے بنا ہوا ایک پھاٹک تھا جس پر تالا پڑا ہوا تھا۔ پھاٹک کے اندر ایک وسیع باغ تھا اور ہر درخت تک ایک چھوٹی سی نالی پانی پہنچا رہی تھی۔ اس باغ میں کہیں قلعے کے رکھوالے کا گھر تھا اور اُس کے

پاس کنجی تھی، پھاٹک کی بھی اور قلعے کی بھی۔ ایک بچے نے پھاٹک پھلانگا اور باغ میں گم ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک عمر رسیدہ مگر معتبر قسم کا شخص اس کے ہمراہ آتا دکھائی دیا۔ اس نے تالے میں چابی گھمائی اور پھاٹک کو دھکیل کر کھول دیا ـــــ یہ اس کا ذاتی باغ تھا جس کے اختتام پر وہ ایک خاصے جدید وضع کے آرامدہ مکان میں رہتا تھا۔ اس مکان کے عین سامنے ایک چھوٹے سے تالاب پر سیبوں سے لدی شاخیں پانی کو چھو رہی تھیں۔ چند بطخیں ہماری موجودگی سے لاپرواہ پانی میں یوں ساکت تھیں جیسے برف کی بنی ہوں اور منجمد ہوں۔ گھر سے باہر ایک بڑے سے پتھر پہ خوبانی کی گٹھلیوں کا ڈھیر لگائے ایک معمر خاتون انہیں توڑ کر ان میں سے گریاں نکال رہی تھی۔ اس کے ہاتھ اتنی تیزی سے حرکت کر رہے تھے کہ انگلیوں میں بھینچے پتھر کی زد میں آتی گٹھلی تو دکھائی نہ دیتی صرف اس کی گری ایک جانب گرتی ہوئی نظر آ جاتی۔ رکھوالا گھر کے اندر گیا اور پھر پانچ روپے فی کس فیس داخلہ وصول کرنے کے بعد قلعے کی کنجی ہمارے حوالے کر دی۔

"اس سے پوچھو یہ ہمارے ساتھ نہیں چلے گا؟" ہانز نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے پوچھا تو کہنے لگا "میرے گھٹنوں میں درد ہے۔ اکیلے ہی چلے جاؤ اور ہاں ان غیرملکیوں سے کہنا ادھر ادھر تانک جھانک نہ کریں ورنہ سیدھے دریائے ہنزہ میں جا گریں گے ـــــ گرا تھا ایک"۔

چونکہ اب میں کنجی بردار تھا اس لئے بقیہ حضرات میرے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ باغ کے ساتھ ہی ایک بلند ٹیلے پر علتت کا قلعہ واقع تھا۔

"ہمارے ساتھ کوئی گائیڈ ہونا چاہئیے تھا جو ہمیں اس عمارت کے بارے میں کچھ بتاتا" بیگم آخم نے اپنے چمڑے کے رخساروں پر ہتھیلی سے پالش کرتے ہوئے کہا "کیا تم کچھ جانتے ہو؟"

"یہیں ؟" ——— مجھے تو ہنزہ میں آکر معلوم ہوا تھا کہ ایک قصبہ علتت نام کا بھی ہے اور اس کے قلعے کو پھسو جاتے ہوئے صرف ایک نظر دیکھا تھا ——— لیکن میں نے انہیں مایوس کرنا مناسب نہ سمجھا اور کھنکار کر بلند آواز میں کہا "خاتون و حضرات آئیے میں آپ کو اس قلعے کی سیر کرواتا ہوں ——— میں آپ کا گائیڈ ہوں۔" لکڑی کا بوسیدہ دروازہ جس پر قفل ڈالنے کا صرف تکلف کیا گیا تھا میں نے کنجی سے کھولا، اُسے دھکیلا، ہم جھکے اور اندر داخل ہو گئے۔

بلتت اور علتت کے قلعوں کی کہانی ایک سی تھی ——— کچے فرش۔ لکڑی کی دیدہ زیب مگر لرزتی ہوئی بالکونیاں۔ سیاہ پڑتے ہوئے منقش دروازے، بڑے بڑے سالخوردہ شہتیر، تاریک کوٹھڑیاں، میر کا تخت پوش ——— بالکونی کے نیچے پھیلی ہوئی علتت کے گھروں کی ہموار چھتیں، اُن پر سوکھتے ہوئے پھل۔ صحنوں میں عورتیں کام کاج میں مصروف ——— علتت کا قلعہ۔

"تو خاتون و حضرات ذرا اپنے سروں کا دھیان رکھئے تاکہ وہ چھت سے ٹکرا کر پورے قلعے کو زمیں بوس نہ کر دیں۔ قدم احتیاط سے رکھئے کہ فرش لرزش میں ہیں ——— اِس دقیانوسی سے تخت پوش پر میر آف ہنزہ بیٹھتے تھے جو اُن دنوں "تھم"، کہلاتے تھے اور نیچے اُس راستے پر جہاں اب شاہراہ ریشم تعمیر کی گئی ہے یارقند۔ سمرقند۔ کاشغر۔ خوقند وغیرہ جانے والے قافلوں پر نظر رکھتے تھے اور اکثر اُن کو لوٹنے کا حکم بھی صادر فرماتے تھے ———"

"واقعی ؟" آخم متاثر ہو رہا تھا۔

اِدھر یہ کوٹھڑیاں چینی ریشم کمخواب اور ہیرے جواہرات سے بھری ہوئی تھیں اِدھر اس تاریکی میں جہاں سے جھانکیں تو عین نیچے قلعے کی دیوار کے ساتھ ہزاروں میٹر نیچے دریائے ہنزہ نظر آرہا ہے۔ یہاں دشمن سرداروں کو قید کیا جاتا تھا ———

اور بیگم آخم آپ نے شائد کسی قیدی کی کھوپڑی پر پاؤں رکھ دیا ہے ——"

بیگم آخم نے ایک خوفزدہ مگر جنسی قسم کی "ہا" کی۔

"اور یہاں اِس کمرے میں میر کا حرم ہوا کرتا تھا —— نوخیز لڑکیوں کو صرف ایک شب کے لئے لایا جاتا اور صبح سویرے اِس بالکونی سے نیچے دریا میں پھینک دیا جاتا"

"بہت ہی دلچسپ" ہانز نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"کہا جاتا ہے کہ اس قلعے کا رکھوالا بھی ایک زمانے میں خاصا وحشی ٹیڑا ہوا کرتا تھا، عمر کی وجہ سے وحشی نہیں رہا، ٹیڑا اب بھی ہے۔ قلعے کی طرف آنے والے سیاحوں کو اندر بھیج کر باہر سے دروازہ بند کر دیتا ہے اور ——"

"ہا —— اِسی لئے وہ ہمارے ساتھ نہیں آیا ——" بیگم آخم اُچھل پڑیں لیکن اُن کے شوہر نے اُنہیں سہارا دیا۔

"بہرحال خاتون و حضرات —— آپ ذرا چشمِ تصور سے اس عہد کو دیکھئے جب یہ قلعہ آباد تھا۔ کیسے کیسے نامی لوگوں نے یہاں قیام کیا۔ کتنے امیر کبیر اور میر تھے جو گمنام ہوئے۔ اب اُن کی دہشت کو گھُن لگا ہوا ہے —— وہ خاک ہوئے اِس خاک کی طرح جو ہمارے جوگر شوز پر جمع ہو رہی ہے ——"

"ابو مجھے بھوک لگی ہے" سلجوق یک دم بور ہو کر بولا۔

"اور اگر ہم سب نے فنا ہو جانا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس وقت ہم لنچ بھی نہ کھائیں —— گائڈڈ ٹور ختم ہوا"

"بہت اچھے۔ بہت اچھے" سب نے تالیاں بجائیں بلکہ بیگم آخم نے میری خدمات کے عوض مجھے ایک بڑا سارا پنیر سینڈوچ عطا کیا جو میں نے سلجوق کے حوالے کر دیا اور اس کے ساتھ ہی سب حضرات کی خدمت میں گذارش کی کہ میری

معروضات کو زیادہ سنجیدگی سے نہ لیا جائے کیونکہ یہ "تاریخی حقائق" میں نے ابھی ابھی گھڑے ہیں۔ اس پر سب نے یہی کہا کہ جناب سبھی گائیڈ یہی کرتے ہیں اور ہمیں وہی کچھ بتاتے ہیں جو ہم سننا چاہتے ہیں اور تم اُن سے مختلف نہیں ہو۔

بالکونی پر بیٹھ کر سب نے اپنے تھیلے کھولے اور حسبِ مقدور بسکٹ سینڈوچ۔ خشک پھل اور روٹیاں کھانے لگے۔ آخم اپنے کیمرے کے آگے لگے ٹیلی لینز کی مدد سے نیچے پھیلے گھروں میں تانک جھانک کرنے لگا۔

علتت کے لوگ یہاں سے بظاہر کتنے خوش اور مطمئن نظر آرہے تھے، ہماری طرح اور ہماری طرح ہی اُن کی بھی محرومیاں ہوں گی، دُکھ ہوں گے لیکن خوش قسمت ہیں کہ ایسی جگہ پر ناخوش ہیں جہاں فطرت کا حُسن اُن کا مہمان ہے ورنہ ہماری طرح ہی گوالمنڈی اور گلبرگ میں رہ کر بھی تو ناخوش ہو سکتے تھے۔

لنچ کے بعد سب لوگ قلعے کی چھت پر چلے گئے اور یہ ایک ایسی چھت تھی جس پر کھڑے رہنے کے لئے صرف حماقت درکار تھی ــــ آپ ذرا کنارے پر جا کر صرف جھانک لیں تو دریائے ہنزہ خود بخود آپ کو نیچے بُلا لے گا۔ یہاں سے بدھ عہد کی وہ چٹانیں بھی نظر آرہی تھیں جن کے قریب ہم پھسو جاتے ہوئے رُکے تھے۔ دائیں طرف بلتت کی پہاڑی اور اُس کے نیچے دریائے ہنزہ پر براجمان کمانداری پُل جو شاہراہِ ریشم کو دریا کے پار لے جاتا ہے اور وہ خشک چٹانوں میں بل کھاتی، بُدھ چٹانوں تک آکر پھسو کی طرف چلی جاتی ہے۔ چھت کی یہ بلندی اور حالت ایسی نہیں تھی کہ انسان اطمینان سے تصویریں اُتارتا ہے اور منظر سے لطف اندوز ہوتا ہے ــــ وہ لڑکھڑاتا ہوا کھڑا رہتا ہے اور دیکھتا رہتا ہے کہ آس پاس کچھ ہے۔ صرف زمین پر قدم رکھنے کے بعد اُسے یاد آتا ہے کہ وہاں اُس نے کیا دیکھا تھا۔

ہوا کی بوچھاڑ سے بوکھلائے ہوئے جب ہم نیچے اُترے اور قلعے کے دروازے

کو مقفل کر کے باہر آئے تو وہ معمّر خاتون ایک ابدی سکون کے ساتھ گھٹلیوں میں سے گریاں نکال رہی تھی۔ تالاب پر سیبوں کی ٹہنیاں جھُکی ہوئی تھیں اور بطخیں بالکل اسی جگہ پانی پر موجود تھیں ـــــ درختوں اور پانی کی ٹھنڈک تھی۔

میں نے قلعے کی چابی رکھوالے کے حوالے کرتے ہوئے پوچھا "یہ گریاں آپ فروخت بھی کرتے ہیں؟"

اُس نے جھک کر اپنی خاتونِ خانہ سے کچھ کہا جس نے پہلی مرتبہ سر اُٹھا کر ہم سب کی طرف ایک ناراض اور حقارت آمیز نگاہ سے دیکھا۔ بوڑھے نے پھر کچھ کہا شاید اصرار کیا اور پھر سیدھا ہو کر بولا "پچیس روپے کلو" آج اپنے گھر کی عافیت اور بُزدلی میں بیٹھے یہ گریاں کھاتے ہوئے مجھے علتت کا وہ باغ اور اُس میں بیٹھی ہوئی خاتون یاد آتی ہے۔



روم کے تریوی فوّارے کے پانی ... دریائے ہُنزہ کے پانی ..... اور سِکّے کس نے ڈالے ؟

ہم علتت سے باہر نکلے اور بہت دیر تک اُس باغ کے قریب کھڑے رہے جہاں ہم نے غشپ پرندوں کو پھُدکتے دیکھا تھا۔ لیکن وہاں اب کچھ بھی نہ تھا۔ (غشپ پرندوں کا ایک غول معلوم نہیں کیسے، شائد راستہ بھول کر لاہور کے جناح باغ کے ایک گھنے درخت میں اُترا تھا اور چند روز کے بعد چلا گیا تھا) واپسی پر ہانز اور آخم سر جھکائے آگے آگے تھے۔ میں درمیان میں چھڑی ٹیکتا قدموں کو گھسیٹتا اور میرے پیچھے بیگم آخم اور سلجوق جانے کیا باتیں کرتے چلے آرہے تھے اور اپنے آپ سے، علتت کی سیر سے، سرد ہوتی ہوا سے بے حد خوش تھے ...

اُلتر نالے کو عبور کرکے ہم بلتت کے آسمان ہوتے اونچے راستے پر چڑھنے لگے۔ میر کے محل کے ساتھ ایک بُلند سطح پر کچھ لوگ کھڑے تھے اور زمین کی جانب دیکھ رہے تھے، جانے وہ کیا دیکھ رہے تھے۔

ہل ٹاپ ہوٹل پہنچ کر ہانز نے ہمیں چائے کی دعوت دی جو ہم نے بخوشی قبول کرلی ___ اُس کی بیوی اور بیٹا اُس کے لئے متفکر تھے اور انتظار کر رہے تھے اور میں نے ہانز کے کان میں سرگوشی کی " ہانز ___ یہ ٹھیک ہے کہ بوڑھی عورت ہنزہ میں بھی بوڑھی ہی رہتی ہے اور اُس کا آدمی کیا کرے ___ لیکن وہ تمہارا ___

انتظار کرتی ہے، تمہارے لئے فکر مند رہتی ہے ___ کیا اتنا کافی نہیں ہے؟"___

ہانز نے اپنی بیوی کے بڑھاپے کو دیکھا لیکن مجھے یقین ہے کہ اُس وقت اُس نے اُس کی جوانی کو جو کبھی تھی دیکھا اور وہ مُسکرانے لگا ___ وہ دیر تک اپنے بیٹے کے کندھے تھپکتا رہا ___ اُن تینوں میں ایک رشتہ تھا جو یورپ میں ایک عرصے سے گم ہو چکا ہے۔

چائے کے دوران ہانز کے گروپ کا ایک اور سیاح ہماری میز پر آگیا۔ جونہی ہانز نے حسبِ عادت ہُنزہ کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے شروع کئے وہ پنجے جھاڑ کر اُس کے پیچھے پڑ گیا" اوہ بلڈی ہُنزہ ___ ہُنزہ از اے فراڈ ___ کیا ہے ہنزہ میں؟ ___ میں نے پانچ برس بیئر کم پی، کسی کام کے ریستوران میں نہیں گیا، تھیٹر جانا چھوڑ دیا صرف اس لئے کہ ہُنزہ کی آسمانی وادی دیکھنے کے لئے رقم جمع کروں ___ مائی فٹ ہُنزہ ___ یورپ میں سینکڑوں ایسی وادیاں ہیں جو اس سے کہیں خوبصورت ہیں" ___

"لیکن ساری دنیا ہنزہ کے حُسن کی تعریف کرتی ہے" ہانز رنجیدہ ہو کر بولا۔

"پتہ ہے کیوں؟ ___ ایک داستان بن جاتی ہے۔ کسی نہ کسی طرح ___ اور میں بے شمار مثالیں دے سکتا ہوں ___ اور پھر لوگ اُس جگہ کو صرف تخیل کی نگاہ سے دیکھتے ہیں وہ اپنے آپ کو ہپنوٹائز کر لیتے ہیں اور اُن میں اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ کھُل کر یہ کہہ سکیں کہ بھئی یہ تو کچھ بھی نہیں ___ تمہارا کیا خیال ہے میں جرمنی واپس جا کر اِس کی بد تعریفی کروں گا؟ نہیں بالکل نہیں میں لوگوں کو وہی سناؤں گا جو وہ سننا چاہتے ہیں کہ ہنزہ ڈریم لینڈ ہے، ہُنزہ پریوں کا دیس ہے ___ اور پھر وہ لوگ یہاں آئیں گے اور میری طرح ہی محسوس کریں گے لیکن اس کا اظہار نہیں کریں گے، اپنے آپ کو فریب دیں گے"

اِس جرمن سیاح کا اظہار قدرے تلخ ضرور تھا لیکن اِس میں حقیقت بھی تھی ـــــ ہنزہ کو باہر کی دنیا میں ایک داستانوی وادی کی حیثیت سے اتنا زیادہ اُچھالا گیا ہے، اس کے آسمانی روپ کو اتنی بلندیوں پر پہنچا یا گیا ہے کہ انسان کہانیوں اور داستانوں میں گم ہو کر یہاں آجائے تو بے حد مایوس ہوتا ہے ـــــ ہم نے متعدد ایسے سیاح دیکھے جو آئے، ایک شب قیام کیا اور "خدا حافظ ہنزہ" کہہ کر چلے گئے ـــــ ہنزہ جانے والوں کو چاہیے کہ وہ ایک صاف تختی لے کر ساتھ جائیں، انہیں وہاں اُس پر لکھنے کے لئے بہت کچھ ملے گا لیکن اگر وہ اِس تختی پر پہلے سے ہی بہت کچھ لکھ کر لے جائیں گے تو انہیں وہاں کچھ نہیں ملے گا۔

ہم دونوں ہل ٹاپ سے باہر آئے اور ہنزہ ان کی طرف اُترنے لگے۔ اُوپر سے اُس ٹیلے پر سے جہاں ہم نے لوگوں کو کھڑے دیکھا تھا، زمین کی طرف دیکھتے دیکھا تھا، وہی لوگ اُتر رہے تھے ـــــ اُن میں آئی بی شامل تھا۔

"ہیلو آئی بی ـــــ" سلجوق نے دُور سے نعرہ لگایا۔

وہ قریب آکر آہستہ سے بولا "ہیلو باس"

"یہ تم لوگ کہاں سے آ رہے ہو؟"

"کل جو حادثہ ہوا تھا ناں باس، اُلتر گلیشیر کے قریب، قُل کے اندر ـــــ ہمارا ایک آدمی مر گیا۔ ہم اُس کو دفن کر کے آ رہے ہیں ـــــ" آئی بی کی ہتھیلی کے گرد پٹی بندھی ہوئی تھی اور اُس کے ماتھے پر پلاسٹر لگا ہوا تھا اور اُس کا چہرہ خاصا سُوج چکا تھا۔

"وہ کون تھا آئی بی؟"

"نوجوان ہی تھا ـــــ آپ ٹھیک ہو باس؟"

"ہاں ـــــ تقریباً۔ آؤ ہوٹل چل کر چائے پئیں۔"

"نہیں باس کل آؤں گا ــــــ ابھی ہم اُس کے گھر جا رہے ہیں" ــــــ اور آئی بی اُس ہجوم میں شامل ہو گیا جو قبرستان سے آ رہا تھا، وہ اپنے ہنزہ میں شامل ہو گیا تھا۔

ہم ہوٹل پہنچے تو سورج ڈوبنے کو تھا۔ راستے سے اُوپر والے برآمدے میں فیو دورو اور اُس کی بیوی نقشوں پر جھکے ہوئے تھے۔ ہمیں دیکھ کر انہوں نے ہاتھ ہلایا۔ سیڑھیوں سے اُتر کر ہم اپنے برآمدے میں آئے، کمرے میں داخل ہوئے اور بستروں پر لیٹ گئے۔

"ابو میں ذرا اُن اطالویوں کے پاس جا رہا ہوں ــــــ" سلجوق میں وہی بے چینی تھی جو اُس کی عمر میں ہونی چاہیے۔ وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرنا چاہتا تھا، دیکھنا چاہتا تھا۔

اُس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد مینجر آیا "صاحب چائے لاؤں؟" اور میرے سر ہلانے پر چلا گیا۔ میں اُٹھا اور برآمدے میں آ بیٹھا۔ وارث صاحب کے کمرے پر تالا پڑا ہوا تھا۔

میں وہاں بہت بیٹھا رہا اور سامنے دیکھتا رہا ــــــ مجھے اِس منظر کی ایک ایک تفصیل یاد ہو چکی تھی۔ راکاپوشی کی برفوں میں کہاں کہاں دھبے ہیں ــــــ کس مقام کو کچھ دیر تک دیکھتے رہنے سے ماہی کی چاہتیں اور شباہتیں نظر آتی ہیں اور دور ہو جاتی ہیں، سُورج مکھی کا عکس کہاں کہاں دکھائی دیتا ہے۔ شاہراہِ ریشم سے اُوپر بلتت آنے والے راستے پر جب کسی جیپ کی لائٹس آن ہوتی ہیں تو اُس کی روشنی پہاڑوں پر کس زاویے سے اور کہاں کہاں پڑتی ہے، اُوپر اُٹھتی ہے، پھیلتی ہے اور کس موڑ پر کتنی دیر تک غائب ہوتی ہے اور پھر نظر آ جاتی ہے وادی کے کس مکان میں کل روشنی تھی اور آج اُس کے مکینوں کو تاریکی کا خیال

نہیں آیا ـــــ نگر کے درّے میں اُترتے ہیسپر گلیشیئر کا مٹیالا رنگ، دریائے ہنزہ کا شور ـــــ اور وہاں ایک مقام ایسا تھا جو مجھے اپنے اندر داخل نہیں ہونے دیتا تھا جہاں دریائے نگر دریائے ہنزہ میں آکر شامل ہوتا ہے اُس کے عین اُوپر کوہ میٹر ہارن کی شکل کی ایک قلعہ نما چٹان تھی جس کے پہلو میں سے ایک تاریک وادی کا سُراغ ملتا تھا۔ شام ڈھلے سورج کی آخری کرنیں اِس چٹان کو بقیہ منظر سے نمایاں کر دیتیں، اُس کی چوٹی اتنی دور اور اتنی بلند دکھائی دیتی کہ یہ باور کرنا مشکل ہو جاتا کہ وہاں کبھی کوئی انسان گیا ہے ـــــ میں اُسے دیکھ رہا تھا ـــــ

شاید یہ وہی چوٹی ہے جس

پر آج تک کوئی نہیں گیا اور اُس کے پہلو میں وہی وادی ہے جو ابھی تک انسانی پہنچ سے دور ہے ـــــ فطرت کا کنوارپن کہیں تو باقی رہنا چاہیے ـــــ کچھ چوٹیاں، کچھ وادیاں ایسی بھی ہونی چاہیں جہاں کوئی نہیں گیا تاکہ ہمارے بعد آنے والوں کے لئے کچھ باقی رہے ـــــ تلاش کرنے کے لئے ـــــ تجسس کی خاطر میں ٹانگیں سیدھی کر کے کرُسی پر نیم دراز ہو گیا اور اُسے دیکھتا رہا ـــــ غروبِ آفتاب کے وقت اُس پر بادل اس طرح تیرتے گذرے جیسے اُن میں آگ لگ گئی ہو ـــــ تاریکی گہری ہوئی تو دریائے ہنزہ کا شور قریب آ گیا، راکاپوشی مدھم ہونے لگی۔ کبھی کبھار ہوا رُخ بدلتی تو سلجوق کی آواز کا شائبہ سا سنائی دیتا اور پھر کوئی ہنستا۔ عینی اور سُمیرا اس وقت ٹیلیویژن دیکھ رہے ہوں گے۔

سیڑھیوں کی جانب سے برآمدے میں ایک لالٹین اُتری اور میری طرف بڑھنے لگی "صاحب آج بجلی نہیں آئے گی"۔ اُس نے لالٹین میز پر رکھ دی اور راکاپوشی۔ ہیسپر گلیشیئر اور دریائے ہنزہ کے موہوم ہیولے بھی غائب ہو گئے۔

اب صرف لالٹین میں بھڑکتی لَو تھی جو میری آنکھوں کو چندھیا رہی تھی۔

"اوئے ——" اُس نے اپنی زبان میں کچھ کہا۔ تاریک کیاری میں سے منہ کھولے وہی فاتر العقل لڑکا باہر آیا۔ اُس کے ہاتھ میں سلاد کے چند پتے تھے۔

"صاحب آپ کے لئے ڈاؤ ڈو سوپ بنا دوں گا ——" وہ دونوں چلے گئے۔

میرا خیال تھا کہ اختتام آن پہنچا۔ گرمیٔ دنیا کا انجام ہوا۔ اب اِس کے آگے گلیشیئر ہیں۔ جن پر سانسوں کے سرد ہونے تک ٹھٹھرنا ہے، صرف انتظار کرنا ہوگا اُس پھونک کا جو چراغ کو بالآخر بجھا دیتی ہے —— گلیشیئر تو ہیں، منجمد دریا ہیں جن پر کشتیٔ حیات رواں نہیں ہو سکتی صرف گھسیٹی جا سکتی ہے لیکن اِن چند دنوں میں گرمیٔ حیات کی گمشدہ حدت پھر سے محسوس ہوئی، بادبانوں میں ہوا آئی، برف پگھلی اور جمود ختم ہوا —— رائڈر ہیگرڈ کی "عائشہ" مقدس آگ میں جل کر دوبارہ جوان اور خوبصورت ہو جاتی تھی، ہنزہ کے آس پاس کی بلندیوں اور برفوں میں وہ طلسم تھا جس کی قربت میں پہنچ کر میں پھر سے جوان ہوا تھا، خوبصورت ہو گیا تھا —— سرد ہونے سے بچ گیا تھا۔ آخری تنہائی سے دُور ہو گیا تھا۔

سلجوق کے تڑپتے ہوئے قدم سیڑھیوں پر اُترے اور وہ لالٹین کی روشنی کی زد میں آکر میرے سامنے کھڑا ہو گیا —— "ابو آپ اکیلے بیٹھے ہوئے ہیں —— یہ دیکھئے انہوں نے مجھے تصویری پوسٹ کارڈ دیئے ہیں روم کے —— آپ روم گئے تھے ناں؟"

روم کے تریوی فوارے میں سکے پڑے رہتے ہیں، اُن خواہشوں کے جو دوبارہ روم آنا چاہتی ہیں —— اور سکے زنگ آلود ہو جاتے ہیں وقت گذرنے سے —— اور جو دوبارہ آجاتا ہے وہ یہی سمجھتا ہے کہ پچھلی مرتبہ تریوی میں پھینکے ہوئے سکوں کا کمال ہے اور جو نہیں آتا وہ انتظار کرتا ہے —— میں بھی بہت دیر سے انتظار کر رہا

تھا اور آخری تنہائی میرے قریب آتی چلی جاتی تھی —— اور پھر دریائے ہنزہ کے پانیوں نے مجھے بلا لیا جن میں پتہ نہیں کون میرے لئے سکے ڈال گیا تھا۔



تب وہ کھڑکی کھُلی... آپ نے ہمارا پانی پیا؟

سلجوق ہانزہ سے ملنے ہل ٹاپ ہوٹل جا چکا تھا۔ باہر بادل چھائے ہوئے تھے۔

میں بستر میں تھا۔ زکام اور ہلکا بخار میری طبیعت کو بوجھل کرتا تھا۔ میں تکیے سے ٹیک لگائے کھڑکی کے قریب نیم دراز تھا۔ سُست اور کم ہمت محسوس کر رہا تھا۔ کل گلگت واپسی کا ارادہ تھا ___ سیاحت کے دوران کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ میں طبیعت خراب ہونے کے باعث یا تھکاوٹ کی وجہ سے خیمے یا ہوٹل کے کمرے میں بستر کی راحت سے جُدا نہ ہو سکا ___ کبھی افغانستان میں لبنان، ترکی یا فرانس میں اور پھر بہت بعد میں چند برس گذرنے پر ہمیشہ خیال آتا کہ اگر اُس روز میں ہمت کر کے باہر چلا جاتا تو یقیناً اس وقت میرے پاس کچھ اور یادیں ہوتیں، مزید نقش ہوتے جو میں نے کھو دیئے صرف اپنی سُستی یا معمولی بیماری کی وجہ سے ___ ہنزہ اِن کے کمرے میں بیکار لیٹے ہوئے مجھے یہی خیال آیا کہ ایک ایسا وقت ضرور ہوتا ہے جب انسان ایک خاص مقام کو آخری مرتبہ دیکھ رہا ہوتا ہے، ہو سکتا ہے یہ وہی وقت ہو اور یہ وقت بستر میں ضائع ہو جائے ___ میں نے اپنے آپ پر جبر کر کے جاگر شوز پہنے، جیکٹ اور اُونی ٹوپی کو اپنی حفاظت بنایا اور چھڑی ٹیکتا ہوا باہر آ گیا۔

"صاحب میں نے ویگن والے کو کہہ دیا ہے کہ کل صبح آپ کو اُٹھا لے ___

چھ بجے" مینجر کچن کے دروازے میں کھڑا تھا ۔۔۔۔ میں نے سر ہلایا اور ہل ٹاپ کی جانب چڑھنے لگا۔ کسی مرکزی وزیر کی آمد پر لوگ میر کے محل کی جانب جا رہے تھے اور وہاں سے ڈھول اور نفیریوں کی آواز وادی میں پھیل رہی تھی۔ میں بھی اُس ہجوم میں شامل ہو کر محل کے باغ میں داخل ہو گیا ۔۔۔۔ محل کے سامنے ایک بلند جگہ پر حکومتی نمائندے کرسیوں پر تشریف فرما تھے اور میر صاحب کھڑے ہو کر خطبۂ استقبالیہ پڑھ رہے تھے ۔۔۔۔ جنابِ عالی ۔۔۔۔ سکول کے لئے ۔۔۔۔ فلاں راستہ اگر پختہ ہو جائے ۔۔۔۔ ہم آپ کے مشکور ہیں ۔۔۔۔ آپ نے قدم رنجہ فرمایا ۔۔۔۔ یہ ہماری خوش بختی ہے ۔۔۔۔ آپ ایسی شخصیت ۔۔۔۔ دو ڈھائی سو آدمی نیچے کھڑے انہیں دیکھ رہے تھے اور تالیاں بجا رہے تھے۔ بارش شروع ہو گئی۔ حکومتی نمائندوں کے عملے نے اُن کے سروں پر چھتریاں تان دیں البتہ میر صاحب بدستور تقریر کرتے رہے اور بھیگتے رہے ۔۔۔۔ میں ہجوم سے علیحدہ ہوا اور ہلکی بارش میں بھیگتا شُوں شُوں کرتا اُس راستے پر چلنے لگا جو قلعے کو بلند ہوتا تھا ۔۔۔۔ ایک تنگ گلی کے بعد پولو گراؤنڈ آیا اور پھر جماعت خانے کے پاس ہنزہ کا ڈرائنگ روم ۔۔۔۔ پتھر خالی پڑے تھے اور بھیگ رہے تھے۔ پن چکی میں مشقت کرتے ہوئے پانیوں کی آواز آ رہی تھی۔ پتھریلی دیواریں بارش میں سیاہ ہو رہی تھیں۔ گلی کے اُوپر دیدہ زیب منقش کمرہ شہتیروں اور پتھروں پر آرام کر رہا تھا۔

تب وہی کھڑکی کھُلی جو ایک جہاں گرد کے لئے کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی ضرور کھُلتی ہے۔ کبھی شہزادوں کے جزیرے میں ایک کائی زدہ اور خاموش فوارے کے اُوپر ۔۔۔۔ کبھی دمشق کے قدیم بازار میں سرِ شام ۔۔۔۔ لیکن اُس میں سے ایک ہی صورت جھانکتی ہے، خیال سے آگے خواہش کی حد تک خوبصورت۔ رنگ جیسے ناخن تلے ٹارچ جلائیں تو وہ دہکتا ہے ۔۔۔۔ نیم وا کھڑکی میں نیم پوشیدگی اور نیم وا ہونٹ ۔۔۔۔

لیکن مسکراہٹ عیاں سفید دانتوں پر سے ہٹتی ہوئی اور ہنزہ کا رنگ چہرے پر۔

"مستنصر صاحب —— آپ —— آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"—— میں آپ کا ملک دیکھنے آیا ہوں"

"پسند آیا؟"

"جی —— بہت"

"آپ نے ہمارا پانی پیا ہے؟"

"جی نہیں —— بہت گدلا ہے"

"صرف گدلا دکھائی دیتا ہے۔ ورنہ بالکل صاف ہے —— آپ پسند کریں گے"

میں پن چکی میں داخل ہوتی نَل پر جھکنے لگا۔

"ٹھہریئے —— میں گلاس بھجواتی ہوں"

گلاس آگیا۔ میں نے نَل میں سے پانی بھرا اور اس کی گدلاہٹ کو دیکھ کر ہچکچایا۔

"آپ یاد کیجئے گا —— پی لیجئے"

میں نے آنکھیں بند کر کے پانی پی لیا اور شکریئے کے ساتھ گلاس لوٹا دیا۔

کھڑکی بند ہوگئی۔

بارش سے میرا چہرہ بھیگنے لگا۔

منقش کمرے کے نیچے سے گزر کر میں اس دوراہے پر آیا جہاں سے ایک راستہ درے کو جاتا تھا اور دوسرا قلعے کی جانب بلند ہوتا تھا —— اور میں کہیں بھی نہیں جانا چاہتا تھا۔

میں ہنزہ اِن میں واپس آگیا۔

"باہر بارش ہو رہی ہے"

باہر وہ بارش ہو رہی تھی جس کیلئے اہلِ ہنزہ نے تین ماہ انتظار کیا تھا۔ اُن

کے باغ ہرے ہو رہے تھے۔

نیند میں دستک ہوئی ــــ "کون ہے؟"

"صاحب چھ بج گئے ہیں، گلگت کے لیے ویگن والا آگیا ہے۔"

"سلجوق ــــ جوقی ــــ"

"جی ابّو ــــ" وہ کہیں دور سے بولا۔

"ویگن آگئی ہے۔ اُٹھو۔"

"ابّو ابھی عید میں چار روز باقی ہیں ــــ" اُس کی آواز نوجوانی کی نیند سے بوجھل تھی "کل نہ چلے جائیں؟"

"ہم آج نہیں جائیں گے ــــ کل!" ــــ اور میں نے کمبل اپنے منہ پر کھینچ لیا ــــ برآمدے میں قدموں کی آواز دُور ہو گئی ــــ ایک ہلکی سی چمک کمرے کے اندر آئی اور پھر بادلوں کی بڑبڑاہٹ سنائی دی۔

وہ آرام کا دن تھا۔

بارش تھم چکی تھی لیکن بادلوں کی وجہ سے فضا میں نیم تاریکی تھی ــــ مجھے یکلخت اپنی بیماری سے خوف آنے لگا۔ میں اس سے زیادہ بیمار نہیں ہو سکتا تھا۔ گھر سے دور یہاں ہنزہ میں اور عید میں صرف تین روز باقی تھے ــــ عینی اور سمیر گھنٹی کی آواز سن کر دوڑتے ہوئے گیٹ تک جاتے ہوں گے اور منہ بسورے واپس آجاتے ہوں گے۔

ہم نے دوپہر کا کھانا بھی کمرے میں کھایا ــــ بلکہ صرف سلجوق نے کیونکہ متلی سی ہو رہی تھی اور بھوک کے باوجود کھانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

شام کو باہر نکلے تو فیودورو اور اُس کی بیوی یک جان ہو کر ٹہل رہے تھے۔

"او تم دونوں ابھی تک یہاں ہوں؟" فیودورو بولا "اور ہم دونوں بھی ابھی

یہاں ہیں"۔

آج صبح روانگی کا خیال تھا جو خیال ہی رہا ــــ انسان بار بار تو ہنزہ نہیں آتا"۔

"اور بارش کے بعد تو جیسے پوری وادی کسی گلیشیئر میں سے پھوٹ کر باہر آ گئی ہو، اتنی شفاف اور تازہ اِس میں سانس لینا کتنا اچھا لگتا ہے ــــ"، فیودورو کی بیوی دونو ہاتھ فضا میں بلند کر کے کہہ رہی تھی ــــ "اور خنکی بھی بڑھ گئی ہے ــــ میں نے پہلی مرتبہ سویٹر پہنا ہے"۔

"تم دونوں کہاں جا رہے تھے؟" فیودورو نے پوچھا۔

"کہیں بھی نہیں"۔

"ہم بھی" "کہیں بھی نہیں" جا رہے تھے ــــ آؤ اکٹھے چلتے ہیں"۔

ہم چاروں ہل ٹاپ کی طرف جانے کی بجائے قُل کے ساتھ بنے ہوئے راستے پر چلنے لگے جس کے ایک جانب بلتت تھا اور دوسری طرف وادی گہری ہوتی تھی۔ لکڑی چیرنے والے آرے کے باہر "RAFTS FOR SALE" کا بورڈ لگا ہوا تھا۔

"ابو جو مُہم جُو اِنڈس اور دریائے ہنزہ میں رافٹ یعنی شہتیروں کے گٹھے پر سفر کرتے ہوں گے وہ اِس جگہ سے رافٹ خریدتے ہوں گے"۔

فیودورو نے بورڈ کو غور سے پڑھا۔ شام ہو چکی تھی اس لئے وہ تصویر نہ اُتار سکا۔ "ہاؤ ایکسائٹنگ ــــ اگلی مرتبہ یہاں سے رافٹ بنوائیں گے اور دریائے ہنزہ کے پانیوں میں اُتر کر اُس خطرناک کیفیت کا بھی لطف اُٹھائیں گے ــــ اِن سے پوچھتے ہیں کہ کتنے کا بنتا ہے"۔

ہم آرے کے اندر چلے گئے۔ ایک صاحب جو لکڑی چیر رہے تھے ہمیں آتا دیکھ کر رُک گئے۔

"بھائی صاحب اگر ہمیں دریا میں سیر کرنے کے لئے رافٹ کی ضرورت

ہو تو آپ کتنے میں بنا دیں گے؟"

وہ بھائی صاحب کہنے لگے کہ صاحب ہم تو صندوق اور دروازے وغیرہ بناتے ہیں رافٹ نہیں بناتے ۔ میں نے کہا، آپ نے تو باہر RAFTS FOR SALE کا بورڈ لگا رکھا ہے، کہنے لگے، نہیں ـــــ میں نے کہا، باہر آکر دیکھ لیں ـــــ "یہ والا بورڈ ـــــ"

وہ صاحب ہنسنے لگے۔" دراصل یہ بورڈ تو وہ جو اوپر دکان ہے اُس کا ہے"۔

میں نے پوچھا، تو وہ رافٹ بناتے ہیں؟

"نہیں صاحب ـــــ یہ دراصل پہلے جو بورڈ تھا اس پر "HANDICRAFTS FOR SALE" لکھا ہوا تھا۔ پھر آندھی سے HADIC والا حصہ ٹوٹ کر گر گیا اور باقی RAFTS رہ گیا۔" ہم بے حد مایوس ہوئے۔

فیو دورد اور اُس کی بیگم ایک دوسرے کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر چلنے لگے ـــــ میں اور سلجوق چند قدم آگے گلگت اور وہاں سے راولپنڈی کے سفر کے بارے میں سوچتے اور باتیں کرتے قلُ کے ریتلے راستے پر قدم رکھتے گئے۔ قلُ کے کنارے پر کھڑے گھروں میں سے رات کے کھانے کی خوشبو تیرتی تھی۔ بچے کھڑکیوں میں سے سر نکالتے اور ہمیں سلام کرتے۔ ایک کھڑکی میں سے کسی بچے کی بجائے ایک بھیڑ نے سر نکالا اور ایک پُر مسرت "باآ" کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔

بائیں ہاتھ پہ واقع سیبوں کے ایک باغ میں سے ایک نوجوان راستے پر چڑھا اور ہمارے پاس آگیا۔" آپ ہمارے باغ کے سیب کھائیں"۔ اُس نے آٹھ دس سیب ہماری پھیلی ہوئی ہتھیلیوں پر رکھ دیئے اور ہم اُس کا شکریہ ادا کر کے سیبوں کی مٹھاس کو زبان سے آشنا کرتے چلے گئے۔

سامنے سے بھیڑوں کا ایک گلہ نمودار ہوا۔ اُن کے قد چھوٹے چھوٹے تھے لیکن سینگ انتہائی خوبصورت اور پیچدار تھے۔ گڈریا ہمیں دیکھ کر رکا اور فیودورد سے بڑی نفیس انگریزی میں کہنے لگا "ہاؤ ڈو یو لائک ہنزہ؟" فیودورد چکرا گیا اور دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر کے کہنے لگا "ماما، میا ــــ یہاں کے گڈریئے بھی انگریزی بولتے ہیں"

"گڈریا" دراصل ایک ریٹائرڈ سرکاری افسر تھا جو شہروں میں زندگی بسر کر کے اب اپنے سیبوں کے باغ اور بھیڑوں کی رکھوالی کرتا تھا اور زندگی سے بے حد مطمئن تھا۔ اُس نے اگلی صبح ہمیں اپنے باغ میں آنے کی دعوت دی۔ جو ہم نے بخوشی قبول کر لی۔ ہم اُسے یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ کل صبح ہم ہنزہ میں نہیں ہوں گے۔

بعض اوقات فیودورد اینڈ کمپنی جان بوجھ کر پیچھے رہ جاتے اور ہنزہ کی اس پُرفسوں شام کا ناجائز فائدہ اٹھانے لگتے ــــ ہم انہیں اپنے ساتھ نہ پا کر مُڑ کر دیکھتے میں سنجیدہ شکل بنا کر آگے چلنے لگتا اور سلجوق بھی بظاہر سنجیدہ شکل بنا کر سیب کھانے میں مشغول ہو جاتا۔

باغ ختم ہوئے تو ہنزہ کی وادی کا پورا منظر سامنے آ گیا۔ برآمدے کی نسبت یہاں سے راکاپوشی ایک مختلف زاویے سے نظر آتی تھی اور اپنے وجود کا زیادہ حصّہ ظاہر کرتی تھی۔ اُس کے نشیب و فراز میں بادلوں کے ٹکڑے معلق تھے ــــ

وہاں اس کی برفوں پر ابھی گلابی روشنی بچھی ہوئی تھی لیکن ہم پہاڑ کی اوٹ میں ہونے کی وجہ سے شام کی سیاہی میں گم ہو رہے تھے۔ ہنزہ میں قیام کے دوران راکاپوشی کا بیشتر حصّہ بادلوں میں روپوش رہتا تھا لیکن آج جب وادی میں بادل تھے تو راکاپوشی کا منظر نسبتاً صاف اور عیاں تھا۔

ایک عورت ہنڈیا اُٹھائے گھر سے باہر آئی اور کُل کے کنارے ایک چھوٹے

سے گڑھے میں رکھ کر اُسے تختے سے ڈھانپ دیا۔ یہ اُس کا ذاتی فرج تھا جو برفیلی قلّ کی یخ بستگی سے اُس کی خوراک کو تا دیر محفوظ رکھتا تھا۔ عورت نے ہمیں اپنی جانب متوجہ پا کر دوپٹہ منہ پر کھینچا اور تیزی سے اندر چلی گئی۔

تاریکی گہری ہوئی تو قلّ کے کنارے گھروں میں ایک ایک بلب روشن ہو گیا گھروں کے عین اُوپر وہ سنگلاخ چٹانیں تھیں جن میں غار نُما سوراخ نظر آ رہے تھے۔ یہ قیمتی پتھروں کی کانیں تھیں جو کسی تنازعہ کا شکار ہو کر بند پڑی تھیں۔ ہم ہنزہ ان سے خاصے دور آ چکے تھے بلکہ وادی کے جس سرے پر ہمارا ہوٹل تھا اب ہم اُس کے دوسرے سرے پر کھڑے اُسے پہچان سکتے تھے ـــــ راستے کی شناخت مشکل ہونے لگی تو ہم چند لمحوں کے لئے رُک گئے۔ میں نے ایک سگرٹ پیا، سلجوق نے ایک سیب کھایا اور اُن کافروں نے حسبِ عادت کفر کی چند حرکتیں کیں ادھر ہم اُسی راستے پر واپس ہو گئے۔

کریم آباد ہوٹل کے نیچے چند دکانوں میں روشنی تھی۔

"ابو یاک کی دُم کے بارے میں نہ پوچھ لیں؟" سلجوق بولا۔

"آپ کے پاس یاک کی دم ہے؟" یہ دکاندار ہمارے مینجر کا بھائی بند لگتا تھا، وہ مسکین لگتا تھا تو یہ عاجز دکھائی دیتا تھا۔

"نہیں صاحب آج کل یاک اُوپر گیا ہوا ہے"۔ وہ سنجیدگی سے کہنے لگا۔ شائد اُس کا خیال تھا کہ ہم یاک کی دُم صرف دیکھنا چاہتے ہیں ـــــ میں نے سوچا ہمیشہ یہ کہا جاتا ہے یاک اُوپر گیا ہوا ہے، یاک بہت اچھا ہے ـــــ کسی نے یہ کبھی نہیں کہا کہ یاک اُوپر گئی ہوئی ہے، یا یہ کہ یاک بہت اچھی ہے حالانکہ اُن میں مادہ بھی تو ہوں گے ورنہ یاک کا دودھ چہ معنی؟

"ہم نے یاک کی دُم خریدنی ہے؟"

"آپ اُس کا کیا کریں گے؟"

"میری امّی کی فرمائش ہے۔"

"اچھا" دکاندار نے سر ہلایا "اچھا —— میرے پاس یاک کے بال ہیں وہ اگر —— اچھا صرف یاک کی دم چاہیئے۔"

اِس متحمل مزاج اور عاجز قسم کے دکاندار کو بھی شدید زکام ہو رہا تھا حالانکہ فل ٹائم کمپاؤنڈر تھا ہسپتال میں اور یہاں پارٹ ٹائم ڈیوٹی دیتا تھا —— ہم نے اُس سے ہُنزہ میں بُنا ہوا گرم پٹو —— عینی کے لئے کشیدہ کاری والی رنگین ٹوپی ۔ لکڑی کے چمچے اور اپنے لئے اونی ٹوپیاں خریدیں —— شیلف پر زمانۂ دھات کے چند پتھریلے برتن رکھے ہوئے تھے۔

"یہ کیا چیزیں ہیں؟"

"صاحب یہ اُدھر پہاڑوں کے لوگ نرم پتھر کو کاٹ کر خود بناتے ہیں —— اپنے گھریلو استعمال کے لئے —— لیکن صاحب اب ترقی ہو رہی ہے اور اُن کو تام چینی اور تانبے کے برتن مل جاتے ہیں اس لئے ہم لوگ ٹورسٹوں کے لئے یہ اُن سے خرید لاتے ہیں —— یہ دیکھیں یہ دیئے ہیں تیل کے —— اور یہ پتھر کی ہنڈیا اور چمچے ہیں —— یہ کھانے کی پلیٹ ہے ——"

میں نے ایک چھوٹی سی ہنڈیا اُٹھائی جو بہت بھاری تھی اور مسلسل استعمال کی وجہ سے سیاہ ہو چکی تھی —— اِسے میں نے ایش ٹرے سمجھ کر خرید لیا ——

"صاحب یہ کچّا پتھر ہے، احتیاط سے استعمال کیجئے گا" دکاندار نے چلتے چلتے مشورہ دیا —— اہلِ ہنزہ کی اکثریت کی طرح اس کی آنکھوں میں بھی لالچ کا شائبہ تک نہ تھا —— وہ درست قیمت لے کر درست مشورہ دے رہا تھا۔

"ہُنزہ اِن" کے کچن سے ملحقہ کمرے میں روشنی تھی ۔ یہ ڈائننگ رُوم تھا ۔ ہم

اندر چلے گئے۔ دو برطانوی سیاح سر جھکائے مطالعے میں محو تھے۔

"صاحب آج کھانا اِدھر کھائیے گا؟" مسکین مینجر ہمیں وہاں دیکھ کر بے حد خوش ہوا۔

برطانوی سیاحوں کے قریب ایک چینی ناک نقشے والا نوجوان بلکہ صرف نقشے والا کیونکہ اس کی ناک ہمارے حساب سے تو تھی ہی نہیں اپنی دبیز جیکٹ میں ہاتھ ٹھونسے بیٹھا تھا ___ یہ اکبر شاہ تھا جو اپنا نام اتنی تیزی سے بتاتا کہ ہم کافی دیر تک اُسے "اکبشاہ" سمجھتے رہے۔ وہ گلگت کے کسی کالج میں زیرِ تعلیم تھا اور گرمیوں کی چھٹیوں میں اِس علاقے کے بیشتر نوجوانوں کی طرح غیر ملکی سیّاحوں کے ہمراہ گائڈ کے طور پر پہاڑوں اور دور دراز وادیوں میں سفر کرتا تھا۔ اِس وقت وہ ان برطانوی سیّاحوں کو بالتورو گلیشیئر کے ٹریک سے واپس لا رہا تھا۔ اُس نے ہمیں دعوت دی کہ ہم اگلے برس آئیں اور اس کے ہمراہ ٹریکنگ پر چلیں۔ وہ کوئی پیمائی کا تمام سامان مہیا کرے گا اور ایک دو پہاڑی مزدوروں کے ہمراہ ہمارے ساتھ بھی چلے گا۔ سلجوق نے مطلوبہ معلومات حاصل کیں اور اُنہیں فوراً ڈائری پر نوٹ کر لیا۔

کھانے کے بعد ہم اُٹھے، برطانوی سیّاح اپنی کتابوں میں مگن مسکرا رہے تھے اور شیر خان ہمیں اگلے برس آنے کی تاکید کر رہا تھا ___ اُسی لمحے دو امریکی بُرے حال اور بانکے دہاڑے کی صورت اندر داخل ہوئے، اپنا سامان فرش پر پھینکا اور خاص طور پر کسی سے مخاطب ہوئے بغیر اپنا حالِ زار سنانے لگے۔ ___ مَیں ہم چترال میں تھے اور وہاں پھنس گئے۔ ایئرپورٹ بند۔ راستے بند ___ پھر ہم نے ایک جیپ والے کے سامنے ڈالروں کے ڈھیر لگا دیئے کہ جتنے مرضی اُٹھا لو اور ہمیں یہاں سے نکال کر گلگت لے جاؤ۔ اُس نے چار سو ڈالر میں ہمیں گلگت پہنچایا اور مین کیا خوفناک سفر تھا ___ اور یہ گاڈیم ماؤنٹینز ___ اوہ بوائے ہم

مرتے مرتے بچے یا شاید مر گئے ___ اور گلگت سے اِدھر آتے ہوئے ویگن کا ٹائر برسٹ ہو گیا اور اوہ بوائے ہم ہنزہ دریا میں تھے کم از کم ہم نے یہی سمجھا کہ ہم دریا میں تھے ___ یہاں کون انچارج ہے؟ ___ ہمیں خوراک چاہیے گرم ___ سٹیک ہو گی؟ ___ نہیں۔ برگر ہو گا؟ ___ تو پھر کیا ہو گا ___ ساگ اور آلو ___ یُومین سپین اچ اینڈ پوٹیٹوز ___ وہی لے آؤ ___ بیئر ہو گی، نہیں۔ ہمیں آرامدہ اور گرم بستر ___" انہوں نے رُک کر سانس لیا اور پھر شرمندہ ہو کر کہنے لگے "سوری ایوری باڈی ___ لیکن ہم واقعی مرتے مرتے بچے ___ ہمارے پاس چاکلیٹ ہیں، کوئی کھائے گا؟ ___ اور چترال گلگت روڈ تو قاتل روڈ ہے ___ ایک مقام پر ___"

ہم اُن کی بقیہ داستانِ الم سُنے بغیر باہر نکل آئے۔

پچھلے چند دنوں سے ہم اندھیرے میں چلنے پھرنے کے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ اب ہمیں سب کچھ "دکھائی" دیتا تھا۔ ہم سیڑھیاں اُتر کر برآمدے میں آئے۔ وارث صاحب حسبِ عادت صرف شلوار میں ملبوس لمبی سُرکیاں لگاتے چائے پی رہے تھے۔

"او چوہدری صاحب آپ کہاں ہوتے ہو ___ سیریں ہی کرتے رہتے ہو ___ لاچیوں والی چائے پیؤ گے؟"

میں نے انہیں بتایا کہ ہم اگلی صبح جا رہے ہیں۔

"اچھا؟" وہ واقعی رنجیدہ ہو گئے

وارث صاحب قدرے "معصوم" تھے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ دراصل ایک تنہا اور گمشدہ انسان تھے جو رفاقت کی تلاش میں رہتا ہے۔ اُس نے اپنے اُوپر کوئی خول نہیں چڑھا رکھا۔ وہ زندگی سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے، خلقِ خدا سے میل جول

بڑھانا چاہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہنزہ میں مجھ پر کوئی ناگہانی افتاد پڑتی تو وارث صاحب فوراً میری مدد کو پہنچتے۔ وہ کچھ دیر چُپ رہے اور پھر کہنے لگے " چوہدری صاحب اچھا ٹائم پاس ہوا ــــ جانا تو ہم نے بھی تھا پر جی میری بُڈھی کہتی ہے کہ میں نے اور کہیں نہیں جانا، ایک ہفتہ اور یہیں رہنا ہے ــــ تو جی نظارے بھی ہیں اور روز کے صرف پچیس مارک جرمن کے ــــ پر آپ تو جرمن گئے ہو ــــ کبھی پھر جرمن آنا ہمارے پاس ــــ چائے پی کر آئے ہو تو بھی پیئو جی۔ جوان آدمی کو دو چائے کپ چائے کیا کہتی ہے اور پھر آپ جا بھی رہے ہو ــــ میں نے کہا چوہدری صاحب اچھا ٹائم پاس ہوا"

دریائے ہنزہ کے پانیوں کا شور آج زیادہ تھا ــــ شائد بادلوں کی وجہ سے ــــ اور رات بھی تھی۔ راکاپوشی سیاہی میں پوشیدہ تو تھی لیکن ہمیں دکھائی دیتی تھی ــــ اُس نے وہیں ہونا تھا جہاں وہ تھی البتہ ہم جہاں تھے وہاں نہ ہوں گے۔ انسان فطرت کو مسخر تو کر سکتا ہے لیکن اُس کا دائمی رفیق نہیں بن سکتا ــــ وہ سب کچھ رہتا ہے لیکن وہ خود نہیں رہتا ــــ البتہ اُس کی جگہ رہتی ہے ــــ جس طرح "ہنزہ اِن" کے اِس برآمدے میں یا جس جگہ یہ برآمدہ ہے وہاں اور لوگ آئیں گے آئندہ زمانوں میں، مختلف چہروں، مزاج اور مختلف نظروں والے اور وہ بھی ہماری طرح راکاپوشی کو دیکھیں گے اور انہیں بھی آخری شب اِسے چھوڑتے ہوئے اسی طور رنج ہو گا جس طرح اس وقت ہمیں ہو رہا تھا ــــ راکاپوشی کے سفید معبد کو پجاریوں کی کمی نہ ہو گی ــــ ہم جائیں گے تو اور آ جائیں گے۔



گلگت ایک جزیرہ ہے۔

میں ساری رات سو نہ سکا۔ پہلو بدلتا رہا۔ زکام اور بخار مجھ پر غالب آ چکے تھے اور بدن ان بریک ایبل گلاس کی طرح ٹوٹتا تھا اور ریزہ ریزہ ہوتا تھا۔

منہ اندھیرے ہم نے رُک سیک اٹھائے اور "ہنزہ ان" کے کچن کے قریب کھڑی ویگن میں سوار ہو گئے ـــــ صبح ہونے کو تھی اور بارش ریت میں بے آواز گرتی تھی۔ شیر خان اور اُس کے بڑھاکو سیّاح بھی ہمارے ہم سفر تھے۔ وہ پورے سفر میں گردنیں جھکائے پڑھتے رہے اور کسی منظر یا انسان کی جانب آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا ـــــ ویگن کریم آباد سے اُتر کر شاہراہِ ریشم پر آئی تو بھر چکی تھی اور اُس میں اہلِ ہنزہ ایک بڑے خاندان کی طرح چہچہا رہے تھے، ہنس رہے تھے، بچوں سے کھیل رہے تھے ـــــ میرا بدن بہت تھکا ہوا تھا اور بیماری نے مجھے لاغر کر رکھا تھا اور میں باقی مسافروں سے الگ ہو چکا تھا۔ سلجوق کی آنکھوں میں تشویش تھی، وہ بار بار پوچھتا "ابو اب طبیعت کیسی ہے؟"

ویگن سے باہر وہی منظر تھے جنہیں چند روز پیشتر ہم اشتیاق سے دیکھ رہے تھے ـــــ تب آنکھیں متجسس اور متلاشی تھیں اور اب تھکی ہوئی اور بوجھل ـــــ بس گھر پہنچنا ہے۔

"اب تو راکاپوشی" سلجوق نے اُس مقام پر جہاں یہ شہر سفید ہم کو پہلی مرتبہ نظر آیا تھا میرا بازو پکڑ کر کہا۔

"ہاں راکاپوشی ـــــ" میں نے اسے ایک نظر دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہا تمہیں پجاریوں کی کمی نہ ہوگی، ہم جائیں گے تو اور آجائیں گے۔

میں "چنار اِن" کے استقبالیہ کمرے میں قدم گھسیٹتا ہوا داخل ہوا۔ ریاض اور غازی صاحب وہاں موجود تھے۔

"ریاض صاحب میرا خیال ہے کہ میں ضرورت سے زیادہ بیمار ہوں۔ مجھے چلنے پھرنے میں بھی دشواری پیش آرہی ہے ـــــ ٹورازم والوں کی کوچ کل راولپنڈی جارہی ہے یا نہیں؟"

"بالکل جارہی ہے" غازی کے چہرے پر مجھے دوبارہ دیکھنے کی مسرت عیاں تھی "کل پنڈی سے جو کوچ چلی تھی وہ اِدھر سے بیس تیس کلومیٹر کے فاصلے پر خراب ہوگئی تھی۔ تمام مسافر رات گئے بڑی مشکل سے یہاں پہنچے۔ ہم نے ایک جیپ پر اپنے مکینک کو روانہ کردیا ہے۔ وہ انشاءاللہ ضروری مرمت کرکے اُسے آج دوپہر تک واپس لے آئے گا اور کل صبح آپ اُس پر پنڈی جا رہے ہوں گے۔"

"شکریہ" میں کرسی پر ڈھیر ہوگیا۔

سلجوق رُک سیک اُٹھائے اندر آیا "ہمیں وہی کمرہ مل سکتا ہے جس میں ہم ٹھہرے تھے؟"

"بالکل وہی کمرہ مل جائے گا سلجوق صاحب" ریاض نے کاؤنٹر سے چابی نکال کر ویٹر کو تھما دی "دونوں صاحبوں کا خیال رکھو" گرم پانی کے غسل نے مجھے قدرے آسودہ کردیا لیکن میں فکر مند تھا۔ میرا حال اچھا نہ تھا۔ بھوک تھی مگر کھانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ چند قدم چلنے سے ٹانگوں میں سے جیسے جان ختم ہو

جاتی تھی اور سردرد اور ہلکا بخار ــــ جانے کیا ہو گیا تھا ــــ سلجوق محسوس کر رہا تھا لیکن اظہار نہیں کرتا تھا۔

پچھلے پہر ہم گلگت کے بازار میں گئے۔ جی ایم بیگ صاحب سے ملاقات کی اُن کا شکریہ ادا کیا اور خدا حافظ کہا ــــ چینی سٹور بند تھا۔ حاجی کاشغری کی دکان سے دادی جان کے لئے چینی سلک کی چادر خریدی اور ہوٹل واپس آ گئے۔

ہوٹل میں خبر اچھی نہ تھی۔

مکینک واپس آ چکا تھا لیکن کوچ کے بغیر۔ جنگلوٹ کے قریب ایک زبردست لینڈ سلائڈ کی وجہ سے شاہراہِ ریشم مکمل طور پر بلاک ہو چکی تھی اور کوچ اسی لینڈ سلائڈ کے دوسری جانب کھڑی تھی چنانچہ ضروری مرمّت کے بعد اُسے گلگت کی بجائے وہیں سے واپس راولپنڈی روانہ کر دیا گیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ جنگلوٹ کے قریب سڑک بند ہو چکی تھی بلکہ بارشوں کے باعث دو تین مقامات پر ناقابلِ عبور ہو چکی تھی۔ بسیں اور جیپیں جہاں تھیں وہیں کھڑی تھیں اور مسافر کھلے آسمان تلے بے یار و مددگار پڑے تھے۔

"صاحب آپ فکر نہ کریں۔" ریاض صاحب نے تسلّی دی۔ "لینڈ سلائڈ کل تک ٹھیک ہو جائے گی۔ بُل ڈوزر جا چکے ہیں۔ اگر زیادہ پرابلم ہوئی تو ہم آپ کو جیپ پر جنگلوٹ چھوڑ آئیں گے اور وہاں سے آپ لینڈ سلائڈ کا علاقہ پیدل چل کر دوسری طرف چلے جائیے گا اور دوسری طرف کوئی نہ کوئی سواری مل جائے گی۔ آپ فکر نہ کریں۔"

لیکن میں فکر کر رہا تھا ــــ اس لئے کہ میں لاغر ہو رہا تھا ــــ تین روز بعد عید تھی ــــ ہم کیسے پہنچیں گے؟

میں کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ شام کے کھانے میں دُودھ اور ڈبل روٹی

نگلنے کی کوشش کی مگر وہ حلق سے اُترتی نہ تھی، متلی ہوتی تھی اور میں پھر نڈھال ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔

"ابو ڈاکٹر کو دکھا لیں؟"

"نہیں" میں نے ہراساں ہو کر کہا ــــ وہ پتہ نہیں کیا کہہ دے ۔۔۔

"لاہور پہنچیں گے تو دیکھا جائے گا۔"

وہ بھی اپنے بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔

رات دس بجے ویٹر نے دستک دی۔ کوئی صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔"

یہاں گلگت میں کون ہے جو مجھ سے ملنے آگیا ہے۔ میں مشقت کر کے اُٹھا اور بیمار قدم رکھتا ڈائننگ ہال میں چلا گیا۔ اس سے پیشتر کہ مجھے آس پاس کی کچھ خبر ہوتی ایک بلند قامت باریش صاحب مجھ سے بغلگیر ہو رہے تھے اور اُن کی گھنی داڑھی میرے گالوں پر بُرش کی طرح پھر رہی تھی۔ "آہا ــــ تارڑ صاحب ــــ آپ نے بتایا ہی نہیں ــــ مجھ غریب کو یاد کرتے ــــ مجھے تو ابھی اِسی وقت کسی نے بتایا کہ تارڑ صاحب گلگت میں ہیں اور چنار اِن میں قیام پذیر ہیں ــــ کیا حال ہیں؟" ــــ اور یہ ساری گفتگو انہوں نے بغلگیری کی حالت میں کی۔

میں نے بمشکل تمام اُن کو اپنے آپ سے علیحدہ کیا اور پوچھا کہ جناب کا اسم شریف؟ کِھلے ہوئے، مسکراتے ہوئے کہنے لگے "مجھے بیتاب کہتے ہیں۔" اور پھر باچھیں کِھلا کر بغل گیر ہو گئے۔

"آپ تو بہت ہی بیتاب ہیں۔" میں نے اُنہیں تقریباً دھکیلتے ہوئے کہا۔ "لیکن آپ ہیں کون؟"

انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "جناب میں گلگت کا ڈپٹی انفرمیشن آفیسر ہوں اور میرا کام ہی یہی ہے کہ کوئی بھی اہلِ قلم، اخبار نویس اِدھر آئے تو اُس کی خدمت

میں دل وجان سے حاضر ہو جاؤں ـــــ اور میں تو آپ کا قاری ہوں، مداح ہوں ـــــ واہ واہ طبیعت خوش ہو گئی ـــــ واہ واہ تارڑ صاحب"

بیتاب صاحب کی طبیعت واقعی خوش ہو گئی تھی اور گرمیٔ ملاقات میں اُن کے سرکاری فرائض کا شائبہ تک نہ تھا۔ میں نے اپنے سفر کی مختصر روئداد بیان کی اور گھڑی کی طرف دیکھا ـــــ وہ فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے ـــــ آپ کو زحمت دی اس وقت ـــــ لیکن مجھے ابھی اطلاع ملی تھی ـــــ آپ تھکے ہوں گے، آرام کیجیئے۔ مجھے بتائیے میں کل کس وقت حاضر ہو جاؤں ـــــ آپ کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے بتائیں اگر یہ ناچیز آپ کے لئے کچھ کر سکتا ہے، مجھے بے حد مسرّت ہوگی۔

بیتاب صاحب جو کچھ کہہ رہے تھے اور جس خلوص سے کہہ رہے تھے اُس نے مجھے موم کر دیا "بیتاب صاحب آپ میرے لئے یہ کر سکتے ہیں کہ مجھے کسی نہ کسی طرح گلگت سے نکال دیں ـــــ تین روز بعد عید ہے، میں خاصا بیمار ہوں اور اپنے بیٹے کے بارے میں فکر مند ہوں"

بیتاب صاحب کے چہرے پر تشویش ایک افواہ کی طرح پھیلی "خدانخواستہ تارڑ صاحب ـــــ کیا بیماری ہے! آپ نقاہت سے بولتے ہیں اب میں نے بھی نوٹ کیا ہے ـــــ ڈاکٹر کو دکھایا ـــــ نہیں نہیں آپ غفلت برت رہے ہیں اور جناب ـــــ" انہوں نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر کہا اور اُن کی پُر مسرّت مسکراہٹ داڑھی میں سے چھن چھن کر باہر آنے لگی "جب تک یہ بندہ زندہ ہے آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ آپ انشاءاللہ عید اپنے بال بچوں میں گذاریں گے میرا آپ سے وعدہ ـــــ اور اگر خدانخواستہ بندوبست نہ ہو سکا تو پھر میرے گھر میں گذاریں گے ـــــ میرے نصیب۔ کل صبح میری جیپ یہاں آجائے گی آپ

جہاں جانا چاہیں اُس پر جائیں۔ دوپہر کو دفتر سے فارغ ہو کر میں حاضر ہو جاؤں گا —— اچھا اجازت؟"

عجیب شخص ہے، میں نے بستر میں لیٹتے ہوئے سوچا نہ جان نہ پہچان اور اتنی رات گئے صرف مجھے ملنے اور میری مدد کرنے اپنی سیاہ داڑھی سمیت یہاں آن دھمکا ہے۔

اگلی صبح بیتاب صاحب کی جیپ کا ہارن چنار اِن کے باہر بڑی بیتابی سے بار بار بج رہا تھا —— اور ہم اس کے لئے تیار تھے۔

اس سے پیشتر ہم استقبالیہ کمرے میں گئے تو وہاں تمام خبریں بری خبریں تھیں —— ایک اور مقام پر لینڈ سلائڈ ہو گئی ہے۔ بُل ڈوزر کام کر رہے ہیں لیکن ایک جگہ پہاڑ کا بیشتر حصہ سڑک پر گرا ہوا ہے اور کچھ پتہ نہیں کہ اُسے صاف کرنے میں کتنا عرصہ لگ جاتے —— آج صبح گلگت سے چلنے والی تمام جیپیں اور بسیں بھی واپس آ گئی ہیں کیونکہ لینڈ سلائڈز کو پار کرنے کی کوئی صورت نہیں ——

"سب سے پہلے پی آئی اے کے دفتر چلئے" میں نے ڈرائیور سے کہا۔ گلگت سے باہر نکلنے کا واحد رستہ اب آسمان تھا۔

پی آئی اے کے مختصر دفتر میں بقول کسے ماں بچہ نہیں سنبھال رہی تھی۔ کاؤنٹر پر کھڑے ملازمین کے گلے بیٹھ چکے تھے اور غیر ملکی سیاح، مقامی باشندے، فوج اور دیگر سرکاری اداروں کے ملازمین کاؤنٹر پر باقاعدہ حملہ آور ہو رہے تھے۔

—— ڈیم اِٹ کل شام اسلام آباد سے میری آخری فلائٹ ہے۔ اگر میں نہ پہنچا تو رعایتی ٹکٹ کینسل ہو جائے گا۔ مجھے واپس جرمنی کون بھیجے گا، آپ؟"

"آپ مہربانی کر دیجئے میں بوڑھا آدمی ہوں۔ دل کا مریض ہوں اور ادھر دوائیاں نہیں مل رہیں —— آپ مہربانی کر دیجئے۔"

"دیکھیں میری ایک انتہائی عزیز سہیلی کی بچی کی کل شادی ہے۔ مجھے ہر حالت میں کل ایبٹ آباد پہنچنا ہے" شلوار قمیض میں ملبوس ایک غیر ملکی مشنری خاتون بالکل رونے کو تھیں۔

"ہمارے پاس پیسے نہیں۔ ہم گلگت میں بھوکے مر جائیں گے، ہمیں یہاں سے نکالو ـــــ پلیز ـــــ" دو سیاح کاؤنٹر پر مکے مار رہے تھے۔

ہر جانب سے درخواستیں، دھمکیاں، آہ و زاریاں اور مایوسیاں سنائی دے رہی تھیں۔ پی آئی اے کے ملازمین کبھی تحمل سے اور اکثر جھلا کر جواب دیئے جا رہے تھے "تین روز سے فلائٹ نہیں آئی۔ ہمیں کچھ پتہ نہیں کہ کل فلائٹ آئے گی یا نہیں ـــــ اور ہم اگلے پندرہ روز کے لئے بک ہیں۔ کوئی نشست نہیں ـــــ جن مسافروں کی نشستیں ایک ہفتہ پیشتر کنفرم تھیں وہ بھی ابھی نہیں جا سکے ـــــ ہم کچھ نہیں کر سکتے ـــــ ہمیں افسوس ہے ـــــ سوری ـــــ"

میں اس مایوس اور غصیلے ہجوم میں سے اپنے آپ کو دھکیلتا کاؤنٹر تک پہنچا مگر وہاں ٹیپ ریکارڈر لگا ہوا تھا "سوری ـــــ کوئی نشست نہیں ـــــ اگلے دو ہفتے کے لئے کچھ نہیں ـــــ کچھ نہیں"

ہم باہر آئے اور جیپ میں بیٹھ گئے۔

"بسوں کے اڈے پر چلو"

نیٹ کو کمپنی کے بس سٹینڈ پر بھی خلقت روزِ حشر کی سی تھی۔ عید پر اپنے آبائی شہروں کو لوٹنے والے فوجی جوان، انجینئر، سیاح، تاجر ـــــ کچھ لوگ چار بجے چلنے والی بس کی ٹکٹیں خرید رہے تھے اور کچھ اور لوگ صبح روانہ ہو کر لینڈ سلائڈ کی وجہ سے واپس آجانے والی بس کی ٹکٹیں ہاتھوں میں لئے اپنی رقم واپس لینے کی تگ و دو میں تھے۔

"اگر بس نہیں جا رہی تو آپ ٹکٹیں کیوں فروخت کر رہے ہیں؟" میں نے ایک اہلکار سے دریافت کیا۔

"ہو سکتا ہے تب تک لینڈ سلائڈ صاف ہو جائے اور بس چلی جائے"

"خبر تو یہ ہے کہ شاہراہ ریشم اگلے تین چار دن تک بند رہے گی"

"ہاں صاحب ایسا ہی لگتا ہے لیکن کیا کریں لوگ تنگ کرتے ہیں، انہیں مصروف رکھنے کا ایک بہانہ ہے"

ایک عجیب و غریب کردار ایک موٹے تازے بکرے کی رسّی تھامے بڑے اطمینان سے ایک کونے میں بیٹھا کان میں سے میل نکال رہا تھا۔ مجھے پہچان کر بولا "اوئے واہ جی آپ ٹیلیویژن والے کہاں پہنچے ہوئے ہو، کوئی ڈرامہ شرامہ کر رہے ہو؟"

"بس یہی سمجھ لو" میں نقاہت کے باوجود مسکرا دیا "اور تم کہاں جا رہے ہو؟"

"ہم دونوں" اس نے بکرے کی طرف اشارہ کر کے کہا "منڈی ایمن آباد جا رہے ہیں"

"کس چیز پر؟"

"بس پر"

"بس تو نہیں چلے گی"

"میرا مولا چلائے گا"

"یہ بکرا بھی ساتھ جائے گا؟"

"آہو جی ـــــ صاحب جی میں یہاں عطر بیچتا ہوں پھیری لگا کے ـــــ دراصل ایمن آباد سے عطر بیچتا بیچتا پنڈی پہنچ گیا۔ وہاں سے بس ادھر کی مل گئی میں نے سوچا سیر بھی ہو جائے گی اور کاروبار بھی ـــــ ادھر ایک گاؤں میں یہ بکرا

مل گیا۔ میں نے سوچا عید قربان ہے، یہ قربانی کے لئے اعلیٰ ہے ـــــ سستا مل گیا۔ ایمن آباد میں تو دو ہزار کا ہو گا۔"

مجھے یقین ہے کہ وہ خوش قسمت بکرا عید قربان کے کئی روز بعد ایمن آباد پہنچا ہو گا۔

یہاں پر وہی پریشان حال مشنری خاتون بھی ماری ماری پھر رہی تھیں۔ پی آئی اے کے دفتر میں ملاقات کی وجہ سے وہ میرے قریب آکر کھڑی ہو گئیں۔

"کچھ ہوا؟"

میں نے انہیں صورتِ حال بتا دی۔

"کیا کوئی ذریعہ نہیں یہاں سے باہر نکلنے کا ـــــ مجھے ـــــ اوہ ـــــ میری سہیلی کی بچی کی شادی ہے کل۔"

اُن کی اشک آور پریشانی سے میں اِس نتیجے پر پہنچا کہ دراصل اُن کا بجٹ ختم ہو چکا ہے اور وہ گلگت میں رہ نہیں سکتیں ـــــ شائد میں اس لحاظ سے خوش قسمت تھا کہ میرا بیٹا میرے ساتھ تھا، جیب کبھی خالی نہیں تھی اور ـــــ بیتاب صاحب بھی تو تھے۔

نیٹ کو کے اڈے سے نکل کر ہم گاشا بروم سروس کے سٹینڈ پر گئے۔ وہاں ایک بس کھڑی تھی اور فُل تھی اور کل کی کھڑی تھی۔ مسافر انتہائی اطمینان سے اُس میں تیار بیٹھے تھے۔ میں نے پوچھا کہ کیا ہو رہا ہے؟ جواب ملا کہ لینڈ سلائڈ کلیئر ہوتے ہی چل دیں گے ـــــ کم از کم یہ مسافر قنوطی نہیں تھے۔

اِس دوران دو تین مزید بسیں گلگت میں داخل ہوئیں ـــــ یہ گلگت سے ہی صبح کو چلی تھیں اور واپس آ رہی تھیں ـــــ لینڈ سلائڈ عبور نہیں ہو سکتی۔ گلگت ایک قید خانہ بن چکا تھا ـــــ چٹانیں قریب آکر بلند ہوتی جاتی

تھیں ـــ اور میری بچی کھچی قوت لمحہ بہ لمحہ زائل ہو رہی تھی ـــ میں اب منہ کھول کر سانس لیتا تھا اور میرا ماتھا پسینے سے تر رہتا تھا۔

دوپہر کو بیتاب صاحب آ گئے "کچھ ہوا؟ ـــ پی آئی اے؟ ـــ بسیں؟ ـــ ٹورازم کی کوچ؟ ـــ جیپ کرائے پر لے لیں ـــ ہاں لیکن لینڈ سلائڈ ـــ آپ فکر نہ کریں میں ایک سرکاری سلسلے میں مقامی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے ملاقات کر رہا ہوں۔ میں اُن سے درخواست کروں گا کہ آپ کو کسی فوجی جہاز میں یہاں سے نکالنے کا بندوبست کر دیں ـــ اوہو تارڑ صاحب آپ تو ہمت ہار رہے ہیں ـــ اور سب سے پہلے آپ کا میڈیکل چیک اپ ـــ"

بیتاب صاحب کے ہمراہ اُن کا نوجوان بیٹا بھی تھا۔ سلجوق کی طرح قد نکلتا ہوا۔ دُبلا پتلا ـــ اُس نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا تو اُس کا ہاتھ مجھ سے بھی گرم تھا۔

"یہ بیوقوف بھی تھوڑا سا بیمار ہے۔ چند روز سے بخار آ رہا ہے، اُترنے کا نام ہی نہیں لیتا ـــ اِسے بھی دکھا لیں گے آیئے"

ہماری جیپ کمبائنڈ ملٹری ہاسپٹل کے سامنے رُک گئی۔

مجھے ایک کپتان ڈاکٹر صاحب کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ انہوں نے مجھے کاؤچ پر لٹایا اور سٹیتھوسکوپ سے میرا پیٹ ٹٹولنے لگے۔ میں نے اپنی نحیف کیفیت بیان کی۔ انہوں نے پیٹ دبایا اور پھر یکدم بولے "تارڑ صاحب وہ آپ کا فلاں کردار ـــ اچھا تو آپ نے کُل کتنے ڈراموں میں ـــ فلاں سیریل میں آپ ـــ" وہ مجھے چیک کرتے رہے اور باتیں کرتے رہے اور میں اس وقت بے حد خوفزدہ تھا اور تکلیف میں تھا لیکن زبردستی کی مسکراہٹ لبوں پر سجائے ان کے سوالوں کے جواب دیتا جا رہا تھا اور میری دلی خواہش تھی کہ کاش یہ صاحب مجھے نہ جانتے، اِنہیں میرے نام کا علم نہ ہوتا اور یہ عام مریضوں کی طرح مجھے ٹریٹ کرتے، صرف میری بیماری پر نظر

رکھتے، ٹیلیویژن کے بارے میں کومنٹری نہ کرتے رہتے ــــ بالآخر انہوں نے مجھے اُٹھنے کا حکم دیا اور کہنے لگے "آپ فوراً اپنا پیشاب ٹیسٹ کروائیے"

میں لیبارٹری میں گیا اور پیشاب ٹیسٹ کروا کر اُس کی رپورٹ ڈاکٹر صاحب کے پاس لے آیا۔

"شکر ہے ــــ" انہوں نے رپورٹ پر ایک نظر ڈال کر ایک گہرا سانس لیا۔ "مجھے یقین تھا کہ آپ کی لور کو نقصان پہنچ چکا ہے لیکن رپورٹ نارمل ہے ــــ آپ کی بیماری کا بنیادی سبب دماغی پریشانی اور تفکر ہے اور ــــ ویسے آپ نے ہنزہ میں کیا کھایا پیا تھا؟"

میں نے تفصیل بتا دی۔

"وہاں کا پانی پیا تھا؟"

"نہیں ــــ"

"بالکل نہیں پیا تھا؟"

تب مجھے وہ گلاس یاد آیا جو کھڑکی میں سے بھجوایا گیا تھا "ہاں ایک گلاس پیا تھا"

"بس اُسی کا فتور ہے ــــ ہم لوگوں کے معدے اُس پانی کو قبول نہیں کرتے ــــ وہ بہت بھاری اور معدنیات سے بھرپور ہوتا ہے، اُسے ہم برداشت نہیں کر سکتے ــــ آپ ایک پُرانے سیاح ہوتے ہوئے بھی اتنی احتیاط نہیں کر سکے"

اب میں ڈاکٹر صاحب کو کیسے بتاتا کہ جناب اُدھر سے حکم ہوا تھا کہ ہمارا پانی پیجئے، ہم نے پی لیا ــــ اُس شکل کو انکار کون کرتا۔

"آپ چند روز کے لئے ہوسپٹل میں ایڈمٹ ہو جائیے ــــ خاصی گڑبڑ ہے"

"چند روز ــــ جناب پرسوں عید ہے، میں گھر جانا چاہتا ہوں"

"اِس حالت میں تو مشکل ہے"

اس حالت میں مَیں گلگت میں نہیں رہوں گا۔"

"بہر حال یہ دوائیاں — یہ انجکشن — اور صرف ہلکی غذا کھائیے اور مکمل آرام ٹوٹل کو لیپس کا بھی خطرہ ہے — نہیں نہیں تارڈ صاحب بہتر یہ ہے کہ آپ —"

خوش قسمتی سے میرے چیک اپ کے دوران بیتاب صاحب کبھی کبھی کمرے میں جھانک لیتے تھے ورنہ وہ مجھے ہسپتال میں زبردستی ایڈمٹ کر لیتے — بیتاب صاحب کے بیٹے کا بھی چیک اپ ہوا — وہ ایک باہمت بچہ تھا، اگرچہ بیماری اُس پر حاوی ہو رہی تھی لیکن وہ میری طرح خوفزدہ نہیں تھا۔ باپ کا پُر شفقت چہرہ اُس کی ڈھارس بندھاتا تھا — چیک اپ کے بعد بیتاب صاحب ایک سرکاری میٹنگ کے سلسلے میں دفتر چلے گئے لیکن اس سے پیشتر انہوں نے ہمیں "چنار اِن" میں ڈراپ کر دیا۔

دوائی کی پہلی خوراک نگلنے کے بعد میں نے اپنے آپ کو نفسیاتی طور پر کچھ بہتر محسوس کیا۔ اگرچہ بیتاب صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ وہ فوجی حکام سے ہمارے بارے میں درخواست کریں گے لیکن یہ ایک موہوم اُمید تھی۔ تھوڑی دیر ریسٹ کرنے کے بعد ہم پھر باہر نکلے اور جماعت خانہ بازار میں جی ایم بیگ صاحب کے پاس پہنچ گئے۔

"بیگ صاحب گلگت میں کونسا ایسا شخص ہے جو ہمیں کل کے جہاز پر — اگر جہاز آیا تو — اُس پر دو نشستیں دلوانے کی طاقت رکھتا ہے؟"

"کمشنر صاحب"

"اور وہ کہاں ہوتے ہیں؟"

"کمشنر ہاؤس میں — یہ سیدھی سڑک۔ پھر بائیں ہاتھ — تھوڑی دُور

ہے۔"

وہ "تھوڑی دُور" میرے مسمار ہوتے حدت زدہ ٹوٹتے بدن کے لئے بہت دور تھا۔

چڑھائی پر میں سلجوق کے کندھے کا سہارا لیتا اور دوسرے ہاتھ سے چھڑی ٹیکتا قدم گھسیٹتا آگے بڑھتا۔ کمزوری اور نقاہت مجھ پر حاوی تھی اور اُن پر گھر لوٹنے کی خواہش حاوی تھی۔ چڑھائی اور دشوار راستہ ــــ بالآخر کمشنر ہاؤس کا بڑا پھاٹک اور باہر پولیس گارڈ ــــ میں شاید ہی کسی بڑے سرکاری افسر کے پاس کسی غرض کے تحت گیا ہوں گا ــــ میں نے اپنے آپ کو بے حد چھوٹا محسوس کیا ــــ پولیس گارڈ نے روکا۔ "اوئے کہاں جا رہے ہو؟"

ایک صاحب جو پھاٹک کے پہلو میں کھڑے تھے، قریب آئے۔ میں نے اُن سے درخواست کی کہ جناب آپ صرف میرا کارڈ اندر لے جائیے، اگر انہوں نے بلوا لیا تو درست ورنہ آپ کو زحمت نہیں دوں گا۔

پانچ منٹ بعد کمشنر جمیل حیدر شاہ ہاتھ پھیلائے میری طرف بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ "آپ یہاں کیسے ــــ اس وقت میں منسٹر کے ہمراہ میٹنگ میں ہوں، اٹھ کر آیا ہوں ــــ فرمائیے میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟"

"آپ مجھے گلگت سے باہر نکال سکتے ہیں۔"

"آپ آٹھ بجے آ جائیے گا ــــ میں اپنے پی اے سے بات کرتا ہوں ــــ کل منسٹر کا ہیلی کاپٹر جا رہا ہے اُس میں آپ کو بٹھا دیں گے ــــ مجھے افسوس ہے کہ میٹنگ ــــ آٹھ بجے پتہ کر لیجئے گا۔"

چھ بجے تھے ــــ چنار ان بہت دُور تھا ــــ اگر چلے جاتے تو واپس آنا محال ہو جاتا۔ ہم کمشنر ہاؤس کے قریب فٹ پاتھ پر اُن گداگروں کی طرح بیٹھ گئے جو بارات

کے کھانا ختم کرنے کے انتظار میں ہوتے ہیں کہ کب وہ کھانا کھالیں اور انہیں بقیہ خوراک مل جائے۔ مجھے بار بار محسوس ہوتا کہ میں بیہوش ہونے کو ہوں اور میں ہو جاتا اگر سلجوق کا سہارا نہ ہوتا۔ سڑک پر سے کبھی کبھار کوئی سرکاری جیپ گذر جاتی ہمارے اُوپر سٹریٹ لیمپ روشن ہوا۔ ہم نے اپنے آپ کو اتنا بے سہارا اور بے گھر محسوس کیا کہ چُپ چاپ بیٹھے رہے، گھڑی کی بظاہر ساکت سوئیوں کو بار بار دیکھتے ـــ بس بیٹھے رہے۔

پورے آٹھ بجے ہم کمشنر ہاؤس میں داخل ہوئے۔

"کمشنر صاحب اب بھی میٹنگ میں ہیں، آپ پی اے صاحب کے ساتھ تشریف رکھیے" ہم پی اے یعنی قریشی صاحب کے کمرے میں جا کر ایک بوسیدہ صوفے پر ڈھیر ہو گئے۔ نو بجے کمشنر صاحب آئے، معذرت اور بھرپور معذرت ـــ" دیکھیں کل صبح یا تو آپ اُس ہیلی کاپٹر میں ہوں گے جس پر منسٹر صاحب اسلام آباد جا رہے ہیں اور یا جہاز میں آپ کے لیے نشستیں مخصوص ہوں گی ـــ آپ نے چائے پی؟ ـــ کل صبح قریشی صاحب آپ کو فون پر اطلاع کر دیں گے"

ہم دونوں خوش و خرم "چنار اِن" لوٹ گئے۔

اُس شب چنار اِن کے ویران ڈائننگ روم میں ہم دونوں کسی جزیرے میں شپ ریکڈ مسافروں کی طرح اُمید کی باتیں کرتے رہے۔

ایک فرانسیسی سیّاح جو ایک خصوصی جیپ پر اس نیّت سے جنگلوٹ گیا تھا کہ وہاں سے وہ لینڈ سلائڈ کو پیدل عبور کر کے دوسری جانب جائے گا اور وہاں سے کسی نہ کسی طرح کوئی سواری حاصل کر کے راولپنڈی پہنچ جائے گا، واپس آ رہا تھا ـــ" وہ لینڈ سلائڈ کراس نہیں کی جا سکتی ـــ وہاں پتھر ہیں اور دلدل ہے اور تقریباً ایک کلو میٹر تک ہے ـــ میں اُس پر صرف چند قدم چل سکا اور پھر

اُسی جیپ پر واپس آ گیا۔"

اگلی صبح میری حالت مزید غیر ہو چکی تھی اور میرا جی چاہتا تھا کہ بس یہیں گلگت میں پڑا رہوں، حرکت نہ کروں، بستر پہ لیٹا بخار میں پھنکتا رہوں ——— کمشنر صاحب کے پی اے نے کوئی اطلاع نہیں دی تھی اور ہم اپنا سامان پیک کر کے بستروں کے کنارے پر بیٹھے جانے کو تیار تھے۔ کہاں جانے کو؟ —— ابھی کچھ پتہ نہ تھا —— لیکن ہم بس چلے جانا چاہتے تھے۔

کمشنر صاحب کے دفتر سے فون آ گیا —— آپ پی آئی اے کے دفتر میں پہنچ کر ٹکٹ حاصل کریں اور ایئرپورٹ آ جائیں —— ہیلی کوپٹر میں صرف ایک نشست ہے، اپنے بیٹے کو اُس پر بھجوا دیجئے اور خود جہاز پر چلے جائیے۔

بیتاب صاحب کی جیپ موجود تھی۔ ہم فوراً پی آئی اے کے دفتر پہنچے۔ "کونسی نشست اور کونسے کمشنر صاحب —— یہاں تو صدرِ پاکستان کے لئے بھی جگہ نہیں —— ہمیں کوئی فون نہیں آیا۔"

کمشنر صاحب کے دفتر فون کیا۔ پی اے صاحب نے کہا ذرا فون دیجئے میں بات کرتا ہوں۔ انہوں نے جو بھی بات کی پی آئی اے کے ڈیوٹی افسر نے انہیں اس سے زیادہ باتیں کیں۔

پی اے صاحب نے ہم سے کہا کہ بس جناب مجبوری ہے —— ہاں شاید آپ کو ہیلی کاپٹر پہ ایک نشست مل جائے —— میں نے سلجوق سے کہا کہ تم چلے جاؤ۔ وہ کہنے لگا، ابو آپ بیمار ہیں آپ چلے جائیں، میں آ جاؤں گا —— میں نے کہا، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا —— تو وہ کہنے لگا، پھر میرا بھی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ —— ایک مرتبہ پھر ہم نے بسوں کے اڈوں کے چکر لگائے اور وہاں بھٹکتے مسافروں سے وہی پرانی خبریں سُن کر چنار ان واپس ہوئے۔

"لینڈ سلائیڈ ابھی صاف نہیں ہوئی ___ بلکہ تتا پانی کے قریب بھی سڑک بیٹھ گئی ہے۔ صاحب آپ آرام سے یہاں رہیں، اگر کچھ رقم درکار ہو تو وہ بھی حاضر ہے آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی ___ عید ہمارے ساتھ گذاریئے" ریاض صاحب نے پیش کش کی۔

ہم کمرے میں آئے ___ میں بستر پر ڈھے گیا ___ "دیکھو بیٹا ___ میں اب زیادہ چل پھر نہیں سکتا

ہم نے اپنی سی کوشش کر دیکھی لیکن کچھ نہیں ہوا ___ اب اگر کمشنر اور مارشل لائ والے ہمیں یہاں سے نہیں نکال سکتے تو ہم مزید کیا کر سکتے ہیں۔ کیا ہوا جو عید یہاں گذرے گی ___ صبح صبح جامع مسجد میں نماز کے لئے جائیں گے، پھر بیتاب صاحب کے گھر جائیں گے اور تم اُن کے بیٹے کے ساتھ گپ لگانا ___ ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہے ___" وہ منہ لٹکا کر بولا "لیکن سُمیرا اور عینی انتظار کر رہے ہوں گے ___ اور امی ___"

ہم نے ویٹر کو بلا کر لاہور تار بھجوا دی ___ "گلگت سے نکلنے کے تمام راستے بند ہیں۔ سوری ہم عید پر نہیں پہنچ سکتے۔ فکر نہ کریں ___ ہیپی عید مبارک"

ہم برآمدے میں کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئے۔ ہمارے سامنے آسمان نہیں چٹانیں تھیں اور ہم اُن کے پار نہیں جا سکتے۔ ہوا بند تھی ___ چنار ان کے ویٹر عید منانے کے لئے گھروں کو جا رہے تھے۔



نہیں شکریہ، ہمیں گھر لے چلو کیپٹن!

رات بخار میں اور بے چینی میں گذری۔

ایک اور صبح آئی۔ میں بستر میں نڈھال پڑا تھا۔ سلجوق ناشتے کے لئے ڈائننگ روم میں جا چکا تھا۔ یکدم وہ دروازہ دھکیل کر اندر آگیا۔ "ابو بیتاب صاحب اور کمشنر صاحب کے فون آئے ہیں کہ فوراً پی آئی اے کے دفتر پہنچ کر ٹکٹ حاصل کریں اور ایئرپورٹ پہنچیں۔"

ہم رک سیک گھسیٹتے ہوئے چنار ان سے باہر آئے تو بیتاب صاحب اپنی جیپ پر ہاتھ ہلاتے ہوئے گیٹ میں سے داخل ہو رہے تھے۔

"جلدی بیٹھئے ۔۔۔۔ میرا بیٹا بھی میرے ساتھ ہے۔ یہ ذرا زیادہ بیمار ہے اسے ڈاکٹر کے پاس لے جا رہا تھا کہ آپ کا بندوبست ہو گیا ۔۔۔۔ بیٹھئے۔"

"آپ پہلے بیٹے کو دکھا لائیے ابھی وقت ہے۔"

"نہیں نہیں اتنا بیمار نہیں ہے ۔۔۔۔ آپ جلد بیٹھئے۔"

ہم پی آئی اے کے دفتر پہنچے تو وہاں وہی ایک جواب تھا۔ "کونسے کمشنر صاحب ہمارے پاس کوئی اطلاع نہیں ہے اور کوئی نشست نہیں ہے۔"

"ایئرپورٹ چلتے ہیں۔"

"چھوڑیئے بیتاب صاحب میں تھک گیا ہوں۔ اگر بندوبست ہوتا تو ____"

"چلتے ہیں ورنہ واپس آکر عید کی تیاری شروع کر دیں گے"۔

ائیر پورٹ پر بھی ایک منی قیامت کے آثار تھے۔ ایک ہنگامہ بپا تھا۔ ایک ہجوم ہراساں اور آسمان کی طرف دیکھتا ہوا۔ ہنزہ کے رہنے والے عزیز صاحب ائیرپورٹ مینیجر تھے اور حواس باختہ گھوم رہے تھے۔ اُن کے پیچھے پیچھے لوگ جیسے بیماروں کا ہجوم عیسٰی کے پیچھے اور وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے "پتہ نہیں آج بھی جہاز آرہا ہے یا نہیں ____ اور اگر آ گیا تو اُس میں کوئی سیٹ نہیں ____ کوئی سیٹ نہیں"۔ اِن بیماروں میں وہ مشنری خاتون بھی دھکے کھا رہی تھیں ____ بیتاب صاحب ہمیں ایک کونے میں کھڑا کر کے خود عزیز صاحب کے تعاقب میں، سائے کی طرح ساتھ ساتھ ____ مجھے احساس ہوا کہ ہم ایک ناممکن صورتِ حال کے تعاقب میں وقت ضائع کر رہے ہیں ____ تیس پینتیس نشستوں کے لئے ہزاروں نہیں تو سینکڑوں لوگ اُمیدوار تھے اور اُن کے پاس ٹکٹ تھے ____ پھر پتہ نہیں کیا ہوا اور کیسے ہوا۔ بیتاب صاحب آئے "آپ ٹکٹ کے پیسے ادا کر دیں۔ آپ کو بورڈنگ کارڈ ایشو ہو جائیں گے۔ عزیز صاحب نے وعدہ کیا ہے ____ اگر جہاز آ گیا تو ____ اب آپ آرام سے اُوپر جا کر ویٹنگ روم میں تشریف رکھیں اور انشاءاللہ آج شام آپ اپنے بچّوں کے ساتھ ہوں گے ____ اور میں کوئی خدمت نہیں کر سکا۔ تارڑ صاحب ____" انہوں نے ہاتھ آگے کیا لیکن اس مرتبہ میں اُن سے بغل گیر ہو گیا۔

"میں بہت احسان مند ہوں"۔

وہ شرمندہ ہو گئے "نہیں نہیں ____ اب جائیے خدا حافظ ____ میں ابھی ٹھہرتا لیکن میرے بیٹے کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔ اُسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہے، خدا حافظ"

ویٹنگ روم میں اطمینان سے انتظار کرنا میرے لئے ممکن نہ تھا۔ میں کبھی اُٹھ کر پانی پیتا۔ کبھی چھڑی ٹیکتا ہوا ٹیرس پر چلا جاتا اور اُن مسافروں کو دیکھتا جن کے ہاتھوں میں سبز رنگ کے ٹکٹ تھے اور ہمارے خالی ہاتھوں میں صرف دامنِ اُمید تھا ___ وقت بہت سُست ہو گیا تھا۔ یکدم باہر شور ہوا کہ جہاز آ گیا ہے ___ جہاز آ گیا۔ میں ٹیرس پر گیا تو آسمان خالی تھا، کچھ بھی نہ تھا ___ صرف خبر آئی تھی کہ جہاز پنڈی سے روانہ ہو گیا ہے اور اگر راستے میں موسم خراب ہونے کے باعث واپس نہ چلا گیا تو آ ہی جائے گا اور ہمیں لے جائے گا ___ میں نے پہلی مرتبہ گلگت ایئر پورٹ کو غور سے دیکھا۔ چٹانوں میں گھری ہوئی ایئر سٹرپ اور اڈے کی جدید اور صاف ستھری عمارت ___ صبح کی دُھوپ میں نکھری ہوئی۔

میں باتھ روم جانے کے لئے ایک برآمدے میں سے گذرا۔ ایک کمرے کے باہر "اندر آنا شدید منع ہے۔ ٹاپ سیکرٹ" قسم کی عبارت لکھی ہوئی تھی۔ میں واپس لوٹا تو اُس کمرے میں سے ایک صاحب زنّاٹے سے باہر آئے اور مجھے گلے لگا لیا۔

"اوہو تارڑ جی ___ کیا بات ہے۔ لاہور کی مخلوق یہاں کیا کر رہی ہے ___ میرا نام فرید ہے۔ یہاں ایئر پورٹ کمیونی کیشن میں ہوں۔ آئیے ناں ہمارے ساتھ چائے پیجئے۔ باقی بیلی بھی لاہورئیے ہیں ___ آئیں ___"

میں نے کہا میرا بیٹا بھی میرے ساتھ ہے اور وہ ___

"وہ آ جائے گا" انہوں نے مجھے اوجھل کرنے کا خطرہ مول نہ لیا اور اپنے ایک ملازم کو ویٹنگ روم میں بھجوا دیا۔

کمرے میں ہوائی رابطے کے تمام تر جدید آلات نصب تھے اور کچھ حضرات کانوں پر ایئر فون لگائے کوئی نامانوس سی زبان بولے چلے جا رہے تھے۔

"تارڑ صاحب آپ یہیں رہیں۔ عید ہمارے ساتھ کریں ___" فرید صاحب

بولے —— درمیانی عمر۔ سفید بال اور خوش دلی سے لبریز شخصیت۔

"آپ کی مہربانی فرید صاحب لیکن آپ ہمیں آج تو چلے ہی جانے دیں۔"

"ٹکٹ تو آپ کے پاس ہیں ناں کنفرمڈ؟"

"ہمارے پاس کسی قسم کے بھی کوئی ٹکٹ نہیں۔"

"ہیں؟" وہ فکرمند ہو گئے۔

میں نے انہیں بورڈنگ کارڈ سکیم کے بارے میں بتایا۔

"اچھا —— خیر میں دیکھتا ہوں۔" انہوں نے ایک نوجوان سے ایئر فون لیا اور کانوں پر جما کر مشین پر ٹک ٹک کرنے لگے اور مائیک پر گفتگو کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے بتایا کہ جہاز اِس وقت چلاس کے اُوپر ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خراب موسم کی صورت میں اب پنڈی واپس نہیں جائے گا بلکہ گلگت آئے گا —— میں ڈائرکٹ رابطہ قائم کرتا ہوں —— رابطہ قائم ہونے پر پہلے تو انہوں نے ٹیکنیکل قسم کی گفتگو کی اور پھر ذاتیات پر اُتر آئے —— "جی چلاس —— کیپٹن شیرازی میں فرید بول رہا ہوں —— ہاں —— اسلام آباد کیسا ہے —— اور بھائی میرے ایک گذارش ہے۔ یہاں میرے پاس اس وقت تارڑ صاحب بیٹھے ہیں —— ہاں ہاں وہی —— اپنے دوست ہیں کیونکہ لاہور جیسے ہیں تو ان کو ضرور لے جانا ہے۔

واپس —— اپنے ساتھ —— ہاں چاہے کاک پٹ میں بٹھا کر لے جاؤ —— شکریہ"

ایئر فون اُتار کر فرید صاحب ہمارے قریب آ بیٹھے۔ "آپ جائیں گے جی لاہور"

جتنی دیر میں چائے ختم ہوئی اُتنی دیر میں وہ آسمانی موسیقی سنائی دینے لگی جسے ہم آج سے پہلے جہاز کا شور کہا کرتے تھے اور یہ کانوں میں کیا رس گھول رہی تھی۔

"جہاز لینڈ کر رہا ہے۔" فرید صاحب جلدی سے بولے۔ "نیچے چل کر سامان کا وزن کروائیے اور سیکورٹی سے فارغ ہو جائیے ——— میں ایپرن پر آپ کا انتظار کرتا ہوں۔"

میں نے ایک نوخیز ہرن کی طرح قلانچ بھری، اپنا تھیلا اُٹھایا اور سلجوق کے شانوں پر رُک سیک جما کر ہم تقریباً دوڑتے ہوئے اُس کاؤنٹر پر چلے گئے جہاں سامان کا وزن ہو رہا تھا ——— اور بورڈنگ کارڈ تقسیم ہو رہے تھے۔

"ٹکٹ،" بورڈنگ افسر نے ہاتھ آگے کر دیا۔

"ٹکٹ تو ہمارے پاس نہیں ہیں۔"

"کیا؟" وہ حیرت کے حملے سے بالکل اوندھا جا گرا۔ "ٹکٹ نہیں ہیں ———"

"وہ ائیر پورٹ مینجر صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ بورڈنگ کارڈ ———"

"کوئی بورڈنگ کارڈ نہیں ہیں ——— اگلا مسافر ——— پیچھے ہٹ جائیے ہٹ جائیے۔"

"دیکھیں ———" میرے پسینے چھوٹ گئے۔ "ہم کمشنر صاحب کے مہمان ہیں۔ وہ ابھی ابھی ہمارے ساتھ تھے۔"

اُس نے اپنے آگے رکھی ہوئی پسنجر لسٹ دیکھی ——— "ہاں ——— آپ تارڑ صاحب ہیں ——— ٹھیک ہے آپ آ جائیے۔"

"تھینک یُو،" میں آگے نکلا تو اُس نے سلجوق کو روک لیا۔ "تم کون ہو؟"

"میرا بیٹا ہے۔"

"کمشنر صاحب کے کوٹے میں سے خصوصی نشست صرف ایک ہے۔ یہ دیکھئے۔" اُس نے لسٹ دکھائی۔ "آپ میں سے ایک شخص جا سکتا ہے۔ کون جائے گا؟ ——— جلدی بتائیے مسافر آپ کے پیچھے کھڑے انتظار کر رہے ہیں

کون جائے گا؟"

"کوئی بھی نہیں جائے گا" میں نے اپنا تھیلا زمین پر پٹختے ہوئے غصے سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ہٹ جائیے۔ اگلا مسافر"

تب فرید صاحب نمودار ہوئے "کیا ہوا؟"

میں نے بتایا کہ یہ ہوا۔

انہوں نے بورڈنگ افسر کو الگ لے جا کر کچھ دھمکی آمیز گفتگو کی ۔۔۔ یعنی یہ کہ یہ نہ صرف کمشنر صاحب کے مہمان ہیں بلکہ ہمارے مہمان بھی ہیں ۔۔۔ اور یہ کہ پائلٹ ان کے بغیر جہاز یہاں سے فلائی نہیں کرے گا کیونکہ یہ اُس کے بھی مہمان ہیں اور اگر وہ فلائی کرے گا تو اُس کے ساتھ فلائٹ کے دوران رابطہ نہیں ہو سکے گا کیونکہ میرے عزیز از جان لاہوری دوست اگر جہاز پر نہ ہوں گے تو مجھ غریب کے ہاتھ کانپیں گے تو پھر رابطہ کیسے ہو گا ۔۔۔ کمیونی کیشن کی ساری مشینیں ہی خراب ہو جائیں گی بھائی میرے۔"

ذرا سی دیر میں دو خوبصورت بورڈنگ کارڈ ہماری ہتھیلیوں میں تھے اور ہم سیکیورٹی سے فارغ ہو کر اندرونی لاؤنج میں چند لمحے گذار کر اُس چھوٹے سے آؤٹ ڈیٹڈ فوکر جہاز کو دیکھے چلے جا رہے تھے جو بصورت کشتی ہمیں اس جزیرے میں سے نکالنے آیا تھا ۔۔۔ جہاز کے باہر ایک قطار تھی اور مسافر ٹکٹ اور بورڈنگ کارڈ چیک کروا کر اندر جا رہے تھے۔ ہم بھی قطار میں کھڑے ہو گئے اور دروازہ قریب آتا گیا ۔۔۔ جب ہمارے آگے صرف تین چار مسافر رہ گئے تو ایئر پورٹ کی عمارت کی جانب سے ایک صاحب ہانپتے ہانپتے اپنے بال بچوں کو گھسیٹتے آئے اور آتے ہی جہاز کے پنکھوں کے نیچے کھڑے ایئر پورٹ مینجر پر برس پڑے "کیا فراق ہے ۔۔۔

جہاز کیسے فل ہو سکتا ہے ـــــ میرے پاس آج کی فلائٹ کے لئے کنفرمڈ ٹکٹیں ہیں ـــــ میں کرنل فلاں ہوں؛"

ایئرپورٹ مینجر تحمّل سے کھڑے رہے "جناب جہاز فل ہے اور اِن لوگوں کے پاس بھی کنفرمڈ ٹکٹیں ہیں؛"

"وہ ـــــ وہ جو ہیں" کرنل صاحب عین ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہے تھے "اِن کو میں نے کاؤنٹر پر دیکھا تھا اور اِن دونوں کے پاس ٹکٹیں نہیں تھیں۔ یہ کیسے بیٹھ رہے ہیں؟"

"سلجوق" میں نے اُس کا بازو جھنجھوڑ کر پکڑا "آؤ" اور آگے کھڑے مسافروں کو باقاعدہ دھکیل کر سٹیورڈ کے پاس پہنچ گیا اور بورڈنگ کارڈ زبردستی اُس کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ اُس نے بدتمیزی کا بُرا تو منایا لیکن کچھ بولا نہیں اور ہمیں سیٹ نمبر دے کر اندر کر دیا۔

جہاز کے اندر ـــــ کونسی نشست ـــــ وہ ـــــ ہاں یہی ـــــ بیٹھو سلجوق اور یہ حفاظتی پیٹی ـــــ اِسے فوراً باندھ لو ـــــ فوراً۔

"لیکن ابو جہاز کو اُڑنے تو دیں؛"

"نہیں ابھی باندھ لو تاکہ ہمیں کوئی اُٹھا نہ سکے؛"

وہ پانچ سات منٹ انتہائی کرب میں گذرے۔ کہیں وہ کرنل صاحب کسی طور جہاز کے اندر نہ آن دھمکیں اور ـــــ شائد صرف ہمیں نروس کرنے کی خاطر چار پانچ مسافروں کو اس وجہ سے اُتار دیا گیا کہ آگے موسم خراب ہے اور وزن زیادہ ہو گیا ہے۔

"خواتین وحضرات، السلام وعلیکم ـــــ اپنی حفاظتی پٹیاں باندھ لیجئے ہم گلگت سے ـــــ" سٹیورڈ کی سُریلی آواز ساؤنڈ سسٹم میں سے گونجی۔

جہاز ہمیں لے کر چلا۔ چلتا گیا۔ اُٹھا اور پھر ایک بلند چٹان کو تقریباً چُومتا ہوا آسمان کی طرف اُٹھتا گیا۔

پہلے دس منٹ تو ہم دم سادھے رہے۔ ہمیں اب بھی خدشہ تھا کہ کوئی ہمیں اُٹھا دے گا — پھر آہستہ آہستہ ٹوٹتے ہوئے اعصاب جڑے، تنی ہوئی رگیں نارمل ہوئیں۔ میں نے ایک طویل سانس لیا اور اس کے ساتھ ہی میری آدھی بیماری رخصت ہو گئی۔

"کیا آپ کافی پئیں گے؟" سٹیورڈ نے جھک کر پوچھا۔

"ضرور —"

"ہم نانگا پربت پر سے کب گذریں گے؟" سلجوق نے سوال کیا۔

"سب کچھ گذر جانے دو — نانگا پربت۔ راکاپوشی اور کے ٹو — صرف گھر کو قریب آنے دو" میں نے ہنستے ہوئے سٹیورڈ سے کہا اور وہ سر جھٹک کر چلا گیا۔

قراقرم کا دبدبہ اور جلال ہمارے نیچے تھا — دائیں جانب اور بائیں جانب تھا۔ جہاز اس پُرہیبت سلسلۂ کوہ کے درمیان میں سے ایک ایسی مچھلی کی طرح تیرتا چلا جاتا تھا جو اپنا راستہ جانتی ہے۔ کبھی ہمارے دونوں طرف چٹانوں کی دیواریں تھیں اور ہم ان کے تنگ دروں میں سے گذرتے جاتے تھے اور کبھی برفپوش چوٹیاں اتنی قریب کہ جہاز کے پنکھوں کی ہوا سے شاید اُن کی برف پل بھر کے لئے لرز بھی جاتی ہو۔

"آپ تارڑ صاحب ہیں؟" سٹیورڈ پھر جھکا ہوا تھا "کیپٹن شیرازی کی خواہش ہے کہ آپ کاک پٹ میں تشریف لا کر اُن کے ساتھ کافی پئیں"

"چلیں" سلجوق مجھ سے پہلے ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔

کیپٹن شیرازی نے بارہ ہزار کی سربلندی پر ایک گرم خوش آمدید کہا اور کنٹرول، کو پائلٹ کے حوالے کرکے ہم سے گفتگو کرنے لگے۔

کاک پٹ میں سے ایک عظیم اور سیاہ تودہ دکھائی دیا اور ہم اس کی جانب کھنچے چلے جاتے تھے۔

"اسے بلیک ماؤنٹین کہتے ہیں کیونکہ گھنے جنگلوں کے باعث یہ دور سے بالکل سیاہ دکھائی دیتی ہے۔"

دائیں ہاتھ پر قراقرم کی بھربھری سیاہ چٹانوں کے درمیان ایک بل کھاتی سفید لکیر تھی۔

"اور وہ نیچے شیر دریا انڈس ہے ــــ اگر آپ پسند کریں تو ہم نیچی اُڑان کرکے آپ کو قریب سے دکھا سکتے ہیں۔"

"شکریہ کیپٹن ــــ" میں نے ہاتھ اُس کندھے پر رکھا جو کہ میرے ہم سفر اور عزیز ساتھی اور میرے بیٹے کا تھا۔ "ہم انڈس کو بہت قریب سے دیکھ چکے ہیں ــــ نہیں شکریہ، ہمیں گھر لے چلو۔"

